سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد چہارم

مشتمل بر منصبِ نبوّت

اوّلاً مقدمہ میں منصبِ نبوّت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصائص پر بحث ہے، پھر قبل از اسلام دُنیا کے متمدّن ممالک اور خصُوصاً ملکِ عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت کی تفصیل ہے، اور اُس کے بعد نبوّتِ محمدیؐ نے دُنیا اور عرب کے لئے جس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا اُس کا اجمالی ذکر ہے، پھر اسلامی عقائد کا تفصیلی بیان ہے۔

تالیف

علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفّی ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول و عقائد پر ہے، جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ لیکن الحمد للہ والمنۃ کہ سوائے دوزخ کی ابدیت و غیر ابدیت کے ایک مسئلہ کے جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی۔ جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علماء اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین و آفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملاءِ اعلیٰ کی خوشنودی و رضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شاملِ حال ہے۔

اس کتاب کی طبعِ ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جا رہی ہے۔ اس میں طبعِ اوّل کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی و شستگی کے لئے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیتِ نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اوّل چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس لئے ۶۸۶ صفحوں کی ایک جلد رہنے دی گئی۔ لیکن چھوٹی تقطیع پر اُس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لئے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۵۰۴ سے کتاب دو حصّوں میں علیٰحدہ بھی کر دی گئی ہے تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اُس کو دو جلدوں میں کرلے تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع

سید سُلیمان ندوی

۲۷/ رجب ۱۳۵۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ ؕ

اے باز کنِ درمعانی — برما بکلیدِ آسمانی
ہر چہ از تو گماں برم بچونی — آن من بوم و تو زان برونی

شاہِ رُسل و شفیعِ مُرسل — خورشیدِ سپہر و نورِ اوّل
سُلطانِ ممالکِ رسالت — طُغرائے صحیفۂ جلالت

(خسرو)

پیشِ نظر کتاب سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے۔ اس کا موضوع "منصبِ نبوّت" ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوّت کی حقیقت اور اُس کے لوازم و خصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرتؐ کی ولادت اور ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی و اخلاقی و روحانی حالت کا مرقّع دکھایا گیا ہے بالخصوص آنحضرتؐ سے پہلے ملکِ عرب کی جو مذہبی و اخلاقی حالت تھی اور اُس کی اصلاح میں جو دقّتیں درپیش تھیں، طرح و بسط کے ساتھ اُن کی تفصیل کی گئی ہے۔

اُس کے بعد آپؐ کی تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرتؐ کو پیش گاہِ باری سے جو شریعتِ کاملہ اور قانونِ ابدی عطا ہوا وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات۔ خیال تھا کہ عقائد وعبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق ومعاملات دوسری جلد میں ہوں۔ مگر جوں جوں مسافرِ قلم اس دشوار گذار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا راستہ اسی قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی۔ ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا۔ دوسری جلد میں عبادات اور اُن کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی۔ اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق ومعاملات ہوگا جس میں ہم انشاء اللہ بہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن ومعاشرت بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوقِ نساء، غلامی، جہاد، اصولِ حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دُنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے۔ اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے۔ پھر موازنہ کرکے ہم دکھائیں گے کہ شریعتِ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی شریعتِ اسلام کا پایۂ اوّلیں ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورۂ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی۔ یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں۔ مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ وترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لئے ان صفحات کو اُن کے اسمِ گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطاکار قلم پر ہے وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔

کوشش کی ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر اسلام علیہ السّلام کے پیغام وتعلیم کو پوری تشریح

استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیثِ صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیشِ نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہو جائے۔

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخِ شریعت کے معنی کسی حکم کو اُس کے غلط یا غیر مفید ہونے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسبِ حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات دیئے جانے کے ہیں۔ اس لئے قرآن پاک کے ناسخ کتب اور اسلام کے ناسخ ادیان ہونے کے معنی ان کے مٹا دینے والے کے نہیں بلکہ اُن کی تکمیل کرنے والے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے۔ اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزلِ مقصود ہے جس کے بعد تکمیلِ دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اُس کا شریک نہیں ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔

ان تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور اُن کی بحث کتنی نازک ہے۔ اس لئے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گذر جانا کس قدر مشکل ہے۔ تاہم میں نے جدوجہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کر لوں۔ چلنے والا تو تھک کر چور ہے اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اُس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی

کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدون اور مرتب کتابیں سامنے ہیں۔ لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو دی تھی۔ چنانچہ ان اوراق میں انہی چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى میں مذکور ہیں یعنی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان۔ چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم صراطِ مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ اس لئے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوندا میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنانا اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا:

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ (الاعراف : ۱۷۸)	جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔
وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ (الزمر : ۳۷)	اور اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ج (البقرہ : ۲۸۶)	ہمارے پروردگار ہمارے بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرمانا۔

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
توقیعِ قبول روزیش باد

طالبِ رحمت
سُلیمان ندوی
۲۵ ربیع الاوّل ۱۳۵۱ھ
دار المصنفین اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

منصبِ نبوّت

کتاب کا موضوع آپ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرتؐ کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آگئیں۔ آنحضرتؐ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ اُنھوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اُس کے مٹانے کی پُرزور کوشش کی۔ اُس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور اُن کو اُن کے گھروں سے نکال دیا۔ وہ اپنی جان بچا کر دُوسرے شہر کو چلے گئے۔ وہاں اُن کی دعوت نے فروغ پایا اور بہت بڑی تعداد نے اُس کی سچائی کو قبول کیا۔ یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی اور چاہا کہ اس جماعت کو بزورِ شمشیر مٹا دیں۔ اُس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور اُن کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا۔ اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ

چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ اعجازِ نبوت، حُسنِ تدبیر اور لُطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہُوئے اور پھر ایک پُرامن نظام قائم ہوگیا۔ بے شبہہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجبِ منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذاتِ اقدسؐ) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔ یہ جو کچھ ہُوا اور پیش آیا وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمۂ ربّانی کا پُورا مظہر ہے۔ تاہم وہ درحقیقت آنحضرتؐ کا اصلی، براہ راست اور مقصود بالذّات کارنامہ نہیں۔ وہ اتّفاقی حوادث ہیں جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دُشمنوں کی مخالفت سے پیش آگئے۔ آپؐ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتّفاقی واقعات رُونما نہ ہُوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے۔ اور وہی آپؐ کی سیرتِ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں۔ یعنی عرب میں سرتاپا رُوحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور آخیر شریعت کو پیش کرنا، دُنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور سرور و محبّت سے معمور کرنا، ظلمت کدۂ عالم کو سراجِ منیر بن کر بُقعۂ نُور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاقِ فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دُنیا کو رفق و محبّت، لُطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت اور تہذیب و تمدّن کے رموز سکھانا، رُوحانیّت کی برباد شدہ دُنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سرِ نو آبادی۔ الغرض خاتم النّبیینؐ کا اصلی کام ایک شریعتِ ابدی کی تاسیس، مذاہبِ عالم کی اصلاح، فنِّ اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانونِ الٰہی کا اظہار و عرض اور تہذیبِ نفوس کی معراجِ اخیر تھی۔ اور یہ سب اُسی پُرآشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیرِ باراں کے روکنے میں صَرف ہو گئے۔ پیشِ نظر جلد آنحضرتؐ کی سیرتِ مبارکہ کے اُن ہی واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم | بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوّت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے۔ وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی و محنت اور متواتر جدّوجہد سے اُن میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ اور ان کو قعرِ مذلّت سے نکال کر ترقّی کی سطحِ مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مُصلح اور ریفارمر کہتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں جن کو حکیم کہتے ہیں۔ اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ اِس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوّت کی حقیقت اور خصوصیات | اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے نبوّت کی حقیقت اچھّی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ نبوّت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس[1] اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجّۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ یہ دونوں بزرگ تصوّف، فلسفہ اور نقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں اس لئے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق و مشاہدہ کا حصّہ بھی شامل ہوگا۔

امام صاحب فرماتے ہیں:

"نبوّت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیّت حیوانیّت سے بالاتر ہے... وہ عطیۂ الٰہی اور موہبتِ ربّانی ہے۔ سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] معارج القدس کا یہ حصّہ حضرۃ الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ ؕ

(الانعام : ۱۲۴)

اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ

(الشوریٰ : ۵۲)

اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک رُوح بھیجی۔ تُو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؛ لیکن اس کو ہم نے ایک نُور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ بُجھائیں۔

اس موقع کے لئے صریح آیت یہ ہے:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

(الجمعۃ : ۴)

یہ نبوّت خُدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے دے۔

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں، نفس میں آثارِ وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتی ہیں۔ تاہم نبوّت کا منصبِ خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے۔ بلکہ جس طرح نوعِ انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا اُن کے افراد کی سعی و محنت کا مرہونِ منّت نہیں اسی طرح نوعِ انبیاء کا نبی بن جانا اُن کے اَفراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں۔ ہر انسان کا بچّہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیّاضِ عالم کی بخشش سے انسانیّت کا مرتبہ حاصل کرتا ہے مگر انسانیّت کے ممکن کمالات

لہ امام صاحب نے پُوری آیت نہیں لکھی۔ مَیں نے اپنی طرف سے آیت پُوری لکھ دی ہے۔

کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لئے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جدّوجہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح نبوت نوعِ انبیاء کے لئے اکتسابی چیز نہیں۔ لیکن منشائے نبوّت کے مطابق ریاضت اور عملِ قبولِ وحی کی استعداد اور تیاری کے لئے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغازِ وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انھوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کی۔ ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلّہ اس طرح گزرا کہ وہ مادّی دُنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے۔ توراۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہِ طُور پر روزہ کی حالت میں رہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلّق ہے کہ وہ ایک سُنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے۔ اور وحی سے پہلے آنحضرتؐ کا غارِ حرا میں مہینوں عُزلت گزیں رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرتؐ نبوّت سے پہلے حرا میں جا کر عبادت میں مشغول ہوئے تو رویائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچّائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی۔ وحی کے بعد بھی آپؐ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپؐ کے دونوں پاؤں سُوج جاتے تھے۔ اسی لئے قرآن نے آپؐ کو خطاب کر کے کہا:

طٰهٰ ○ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ○

(اے پیغمبر!) ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لئے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اُٹھائے۔

(طٰهٰ : ۱-۲)

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوّت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کے حامل میں حُسنِ صورت، اعتدالِ مزاج، نشوونما کی پاکی، حُسنِ تربیت، طہارت، نسب، کرم، اخلاق، نیک طینتی،

متانت، سنجیدگی، دوستانِ الٰہی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنانِ حق کے ساتھ شدتِ قوت پائی جائے۔ علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار، تمام برائیوں سے پاک، فضائل و محاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرّا ہوتا ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرتا ہے۔ قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت اور فریاد خواہوں کی فریاد رسی اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اُس کی فطرت ہوتی ہے۔ اُس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ تمھارا ساتھی (پیغمبرؐ) نہ گمراہ ہُوا اور نہ بھٹکا۔

(النجم : ٢)

اُس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ گمراہی و بے راہ روی سے پاک ہوتا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہُوئی۔

(النّجم : ١٧)

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں اس کی قوّت کے سامنے بالآخر طوعًا و کرہًا سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ بایں ہمہ وہ مغرور، جابر، جفا پیشہ، بدخُو اور دُرشت مزاج نہیں ہوتا۔ وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اُس کا پُورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوّت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں۔ ایک اجمالی اور دُوسرا تفصیلی۔ اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفسِ ناطقہ کی بناء پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اُس کا مالک بنا ہُوا ہے اور اُس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے، اُسی طرح انبیاءؑ کو اپنے نفوسِ قدسیہ کی بناء پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے۔ وہ اپنے ان قدسی نفوس

وپیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہِ راست سُجھاتے اَور خود راہِ راست پر قائم رہتے ہیں۔ اُن کی پیغمبرانہ عقل وفہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور اُن کو وہ ربّانی خصوصیّت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے، اُن پر قابو پاتے اور اُن کو کام میں لگاتے ہیں۔ اور جس طرح انسانوں کے عجیب وغریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب وغریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔

اور اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریّت اور انسانیّت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر عقلیّت اور معنویّت میں وہ اُن سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیّت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی۔ اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (الکھف : ۱۱۰) — میں تمھاری ہی طرح بشر ہوں۔ مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

دیکھو کہ بشریّت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق وامتیاز کو دونوں میں حدِّ فاصل قرار دے دیا ہے۔

تفصیلی ثبوت کے تین طریقے

نبوّت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں:۔

پہلا طریقہ انسان میں تین قسم کی اختیاری حرکات پائی جاتی ہیں۔ فکری، قولی اور عملی۔ ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی۔ قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی۔ عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور بُرے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں۔

پہلے دو احتمال بداہتہً غلط ہیں۔ اب رہ گیا تیسرا احتمال یعنی بعضے انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعیّن کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے۔ فلاں قول سچ ہے فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں بُرا ہے۔ جس شخص کو خالقِ فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحبِ شریعت ہوتا ہے۔

دُوسرا طریقہ نوعِ انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے۔ اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ تو انسان کا کوئی فرد زندہ رہے، نہ جان و مال اور عزّت و آبرو کی حفاظت ہو سکے۔ اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفّظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے۔ انسان کو اس کے لئے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ اچھّے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں اس کو تعاون کہتے ہیں۔ اور دُوسرے یہ کہ بُرے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں اُس کو تمانع کہتے ہیں۔ اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پہننے اور رہنے کے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے۔ تعاون کے ذریعہ نکاح و قرابت، اولاد و اعزّہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلّقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوعِ انسانی اور افرادِ انسانی کی زندگی اور اُن کی دولت و جائداد اور عزّت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس تعاون اور تمانع کے اصول ضرور ہے کہ مرتّب، محدُود اور معلوم ہوں۔ اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو۔ بلکہ اُن میں سب کا برابر فائدہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحیٔ ربّانی اور تعلیمِ الٰہی سے بن سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہرحال کوئی خاص شخص یا کسی خاص خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا، ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلّہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لئے یکساں

واجب العمل ہو، محال ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ یہ اصول اُس کی طرف سے وحی ہوں جس کے ہاتھ میں نظامِ عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوعِ انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے۔ یہ اصول خلّاقِ عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں، وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ | یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اُس کو نہیں جانا اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی۔ پہلے یہ جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں۔ خلق (پیدا کرنا نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود ہست ہے اُس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا)۔ کائنات اِن ہی دو چیزوں سے عبارت ہے۔ تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔ اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے اُسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں، ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسبِ ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں:۔

(۱) چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لئے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لئے ایک مرجّح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے۔ یہی امرِ مرجّح ممکن کی علّت ہوتا ہے۔

(۲) ہر قسم کے حرکات کے لئے ایک محرّک کی ضرورت ہوتی ہے جو دم بدم حرکت کی تجدید کرتا رہے۔ حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لئے ضرور ہے کہ اُس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے۔ اسی طرح طبعی حرکت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اُس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو۔ آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم اُن کو حرکت دینے کے لئے کسی عاقل و مدبّر کی ضرورت ہے اِسی لئے قرآن نے اُن کے لئے کہا:

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ط — خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام

(حٰمٓ السجدۃ : ۱۲) وحی کیا۔

(۳) اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ و اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آسکتیں اسی طرح ان حرکات کو ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو اُن اعمال و حرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کردے۔

(۴) خدا کے حکم دو قسم کے ہیں۔ تدبیری اور تکلیفی۔ پہلا حکم تمام نظامِ عالم میں جاری ہے جس کی بناء پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ	اور سورج اور چاند اور ستارے اُس کے حکم
مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ	کے تابعدار ہیں۔ اُسی کا کام ہے بنانا اور حکم
وَالْاَمْرُ ط	فرمانا۔

(الاعراف : ۵۴)

تکلیفی حکم صرف انسان کے لئے ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ	اے انسانو! اپنے اس ربّ کی عبادت کرو
الَّذِيْ خَلَقَكُمْ	جس نے تم کو پیدا کیا۔

(البقرۃ : ۲۱)

مقدّماتِ مذکورۂ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کی تمام حرکات ممکن ہیں اس لئے مُرجّح کی ضرورت ہے۔ اختیاری ہیں اس لئے عقل کی ضرورت ہے۔ خیر و شر کی محتمل ہیں اس لئے رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظامِ عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے۔ اسی قیاس پر انسانوں

میں خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کے ذریعہ سے ہوگا اور اُن ہی کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے۔ شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں بہیمی اور ملکوتی۔ کھانا، پینا، شہوت، حرص وطمع، استیلاء وجبر وغیرہ افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں۔ اور غور وفکر، علم ومعرفت، حُسنِ اخلاق صبر وشکر، عبادت وطاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں۔ انسان کی روحانی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو اگرچہ عقلِ سلیم اُن اصول اور طریقوں کو معلوم کرسکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہمیت کے تابعِ ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ وعصیان کے نقصانات ظاہر ہوں۔ عقلِ سلیم کے اِس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے مگر یہ تو امکانِ عقلی ہے۔ عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص وطمع اور بیجا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو بر تو پردے پڑجاتے ہیں کہ اُس کے اصلی اور فطری وِجدان اور قوتِ احساس کا مادّہ فاسد ہوجاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اُس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح اندرونی وجدان و احساس کے فاسد ہوجانے سے بھی وہ حق و باطل، خیر وشر اور نیک وبد کی تمیز کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے نوعِ انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور رُوحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہلِ مُلک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے

ان میں صلح و آشتی اور امن و امان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ دُنیا کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیشِ نظر رکھ کر، اُس کے مطابق اُس کے حقوق و فرائض کی تعیین کرے۔ ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں اُسی طرح کم ہیں جس طرح دُوسرے اصناف کے اہلِ کمال۔ انسانوں کے معمولی پیشوں نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں۔ مگر اُن کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو اِن کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور اُن کو اِن کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انھوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اُس کے اصول و قواعد وضع کئے۔ اور بعد کے آنے والوں نے اُن کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارجِ علیا تک پہنچے۔ پھر اخلاق اور رُوحانیات اور ملک و ملّت کے مصالح و فوائد عامّہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اُس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

نبی کی عصمت پھر اُس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدّعی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے۔ اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو۔ اُس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے۔ کیا کسی کو اس علم میں کہ اُس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقلِ معاش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی دلیلیں ہی پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے ہم

کبھی اپنے اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے، اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ بعینہٖ اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوقِ سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت | ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کے بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور دل اُس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں اُن سے اُس کا مقربِ بارگاہِ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے اِرد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اُس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی "بحثِ نبوت" کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے:۔

مصلحین | فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوتِ ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دُنیا میں قائم کر دیں۔ اور ان پر بارگاہِ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربّانی آثار نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں۔ نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلّیات تک اُن کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں۔ صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور و طریق اُن کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ اُن کا تعلق عبادت و طاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے۔

قائم رہتا ہے، وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعتِ عامّہ اور تدبّرِ کلّی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہِ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے الّا یہ کہ منفعتِ عامّہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالمِ غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر اُن کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے۔ کارکنانِ عالم اُن کی تائید و نُصرت میں رہتے ہیں۔ معمولی ریاضت سے اُن کے لئے قرب و سکینت کے وہ دروازے کُھل جاتے ہیں جو دُوسروں کے لئے نہیں کُھلتے۔

مصلحین کی اقسام مفہّمین کی درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور اُن کی مختلف استعدادیں ہیں۔ اور اس بناء پر اُن میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں۔ جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیبِ نفس کے علوم پاتا ہے وہ کامل ہے اور جو اخلاقِ فاضلہ اور تدبیرِ منزل کے اصول حاصل کرتا ہے وہ حکیم ہے۔ جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے اور اُن کے مطابق اُس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دُور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملاءِ اعلیٰ کا نزول ہو اور وہ اُس سے تعلیم پائے اور اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم تصرّفات اس سے صادر ہوں وہ مؤیّد بروح القدس کہلاتا ہے۔ اور وہ جس کی زبان اور دِل میں نُور ہو کہ لوگ اُس کی صُحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اُس کے رُفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں اُس کا نام "ہادی" اور "مُزکّی" (پاک کرنے والا ہے)۔ اور جس کے علم کا بڑا حصّہ ملّت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیّت ہو اور ملّت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا۔ اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو اُن کی اس مصیبتِ عظمیٰ سے خبردار کرے

جو اس دُنیا میں اُن کے لئے اُن کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدّر ہے اور ان کی بداعمالی کے سبب سے اُن سے حق تعالیٰ کی رحمت کو جو دُوری ہے یا قبر اور حشر میں اُن پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اُس کا نام منذِر (ڈرانے والا، ہشیار کرنے والا) ہے۔

اور جب حکمتِ الٰہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لئے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اُس کی آمد مخلوق کے تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اُس کی اطاعت کریں اور بارگاہِ الٰہی سے تاکید ہوتی ہے کہ جو اُس کی اطاعت کرے وہ اُس سے خوشنودی اور جو اُس سے مخالفت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے، یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے۔ اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اُس نبی کے ذریعہ سے اُس کی قوم اور اُس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اسی نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اولیٰ اور اُس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے نامزدگی بعثتِ ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ

وہی خدا جس نے اَن پڑھوں میں اُن ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اس کی آیتیں سُناتا اور اُن کو پاک بناتا اور اُن کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔

(الجمعۃ: ۲)

اور دُوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی۔ نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔

(آل عمران : ۱۱۰)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت اُن کی اُمت کے لئے ہوئی ویسی ہی اُن کی اُمت کی بعثت دُوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآنِ پاک کی یہ آیت بھی ہے:

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ	تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

(الحج : ۷۸)

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین۔ (تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں) آنحضرتؐ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے وہ ان مختلف مذکورۂ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ لیکن آنحضرتؐ ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپؐ کی واحد ذات میں جمع کر دیئے گئے اور آپؐ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمالِ استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب یہ بھی واضح ہو کہ رسولؐ کی بعثت کے لئے حکمتِ الٰہی کا اقتضاء اس لئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے وہ اُن دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے۔ اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے۔

مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور امت پر اُس رسول کی اطاعت اسی لئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دُنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اُس میں اللہ تعالےٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اُس قوم کی اصلاح اُسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لئے بارگاہِ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اُس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ | اس موقع پر چند باتیں اور قابلِ لحاظ ہیں۔ اگر یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لئے قائم کی جائے تاکہ اُس کے ذریعہ سے ان دُوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں، مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اُس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اُس دین کو درست کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے دُوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح سے ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہُوئی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقاء اور اُس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دُور کر دے اور اُس کو کتابِ الٰہی کی تعلیم دے کر اُس کو اُس کا مستحق بنا دے جیسے حضرت مُوسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بنی اسرائیل میں بعثت ہُوئی۔ یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و سلطنت برقرار رہے تو مجدد دینِ نبوت پیدا ہوتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی | ہر نبی کی بعثت کے دَور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اُس کو اور اُس کے دوستوں کو کامیابی اور اُس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت

مکمل ہوجائے)۔ قرآن پاک میں ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ۝ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ۝

(الصّٰفّٰت: ۱۷۱-۱۷۳)

اور ہماری بات اے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہوچکی ہے کہ اُنہی کی مدد کی جائے گی۔ اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ انبیائے کرام علیہم السّلام کے احوالِ مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہوگی اس کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہوسکتا اور اُن پر استدلال واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جاسکتا ہے جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکلوجی آف پیپل) یا نفسیاتِ سپہ سالاری (سائیکلوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں۔ اس طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ "نفسیاتِ نبوت" کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرزِ گفتار، اسلوبِ تحریر اور طریقۂ استدلال غرض ہر چیز میں فرق ہوگیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دُنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اُس کو پورا کر رہا ہے۔ اور اس کے خالق نے اُس کے روزِ پیدائش سے اُس کو

جو حکم دے دیا ہے اُس کی تعمیل سے وہ سرِ مُو انحراف نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہُوئی ہے۔ آفتاب دُنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لمحہ اس میں مصروف ہے۔ زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سُپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے۔ ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اُس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اِس کام میں لگے ہُوئے ہیں۔ حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بخوشی اُن کو کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دُنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اسے انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں۔ بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، اُٹھتا بیٹھتا زندگی گزارتا ہے۔ اور پھر مر جاتا ہے۔ کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے؟ اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحبِ عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآنِ پاک اِسی لئے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (المؤمنون ۱۱۵)	کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (القیٰمة : ۳۶)	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے۔ لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح اُبلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، سبزے اسی طرح اُگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے۔ لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی

ہستی معرضِ خطر میں پڑ جائے۔ سبزیاں نہ اُگیں تو انسان بھوکا مر جائے۔ پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے۔ اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے۔ اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے۔ اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے۔ سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے، نہ سبزیاں اُگیں، نہ انسانی غذا میسّر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو۔ الغرض دنیا کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لئے انسان کی محتاج نہیں۔ لیکن انسان اپنے وجود کے لئے کارخانۂ ہستی کے ایک ایک پرزے کا حاجتمند ہے تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں ہے کہ اس کارخانہ کے ہر پُرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اُس کی بقا ہے۔ لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے۔ جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآنِ پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت تو یہ کہتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ

اُسی نے تمھارے لئے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

(البقرۃ: ۲۹)

پھر یہ بھی بتایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ

(اے انسان) کیا تُو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے اُس کو تمھارے کام میں اُس نے لگا رکھا ہے۔

(الحج: ۶۵)

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اُس نے اعلان کیا:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ

اور (اے انسانو!) اُس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو تمھارے کام میں لگایا ہے اور

مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ ستارے بھی اُس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

(النحل : ۱۲)

ہستیاں دو ہی ہیں۔ خالق کی اور اُس کی مخلوقات کی۔ مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ اُن میں ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آرہی ہے۔ جمادات نباتات کے، نباتات حیوانات کے اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آرہے ہیں۔ آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہیئے۔ مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلیٰ ہستی نہیں تو لامحالہ اُس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے۔

الغرض دُنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلا واسطہ انسانوں کی بقا، زندگی اور آسائش ہے، لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے، جیسا کہ خود فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ اور مَیں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔

(الذّٰریٰت : ۵۷)

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں جیسے آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

۲۔ دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں لیکن قیاس و استقراء و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا اُن کی قدرت سے باہر ہے۔ اُن کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے جیسے حیوانات۔

۳۔ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقرا و تمثیل کے ذریعہ

سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلّیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں، وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی اُن میں تخلّف نہیں ہوتا۔ اسی لئے اُن کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے۔ دُوسری قسم کی مخلُوقات سے جو آثار و حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن اُن کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں، اُن کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہو سکتا ہے۔ اُن کے اِن افعال، حرکات اور آثار کو جبلّت، فطرت اور طبیعت کہتے ہیں۔ اُن کے صُدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں جیسے حیوانات کے افعال اور اُن کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر اُن سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلّت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطراراً سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دُوسرے افعال و حرکات تمام تر اُس کے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں۔ صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی، انجام اور مآلِ کار کو خیال کر کے اُس کے اِرادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اُس کی "ذمہ داری" کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔

جنّ و انس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات و نباتات تو اس لئے کہ اُن کے افعال و حرکات تمام تر مجبُورانہ، بے ارادہ اور فکرِ انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں

یا یُوں کہو کہ اُن احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اوّل ہی دن دیئے ہیں۔ حیوانات بھی اسی لئے اس ذمہ داری سے بَری ہیں کہ اُن کے افعال و حرکات بھی تمام تر جبلّی و طبعی ہیں اور وہ جبلّت و طبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں۔ یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں۔ اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلّت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لئے اُن سے عصیان سرزد نہیں ہوتا۔ صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ اختیار اور علم رکھتا ہے۔ نیکی، بدی اور خیر و شر اِن دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھ کر مآلِ کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے تحت کوئی کام کرتا ہے۔ اس لئے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حقّ و باطل کے فرق کے لئے پیغامِ الٰہی کا محتاج قرار پایا۔

جمادات و نباتات اور دیگر مخلوقات سے احکامِ الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلّت یا فطرت یا خاصیت کو قرآنِ پاک یُوں ادا کرتا ہے:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝	اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں میں سے اور فرشتے وہ سرکشی نہیں کرتے۔ اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔

(النحل: ۴۹ — ۵۰)

اِسی فطری اطاعتِ الٰہی کا دُوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو جیسا کہ قرآن میں ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ	اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی

مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ	کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت
وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ	ڈالتے ہیں اپنے لئے گھر بنالے۔ پھر ہر پھل میں
كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ	سے کھا پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ
ذُلُلًا ط	احکام پر) چل مطیع ہو کر۔

(النحل : ۶۸ - ۶۹)

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعتِ الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ اُن کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو اُن کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي	کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین میں جو کوئی
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ط	ہے اور اڑتے جانور پر کھولے اس کی یاد کرتے
كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ط	ہیں۔ ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝	اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ
(النور : ۴۱)	کرتے ہیں۔

لیکن انسان کو دوسری موجودات و مخلوقات کی طرح مجبور محض نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محلِ بحث اور حیوانات میں متحرک ہے، انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے۔ اسی طرح وہ ارادی قدرت و اختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے انسان میں ایک حد تک وسیع ہے۔ علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے۔ اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی "ارادی تکلیف" کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعتِ الٰہی کے لئے

نہیں بلکہ بالارادہ اطاعت کے لئے اُس کی تخلیق ہُوئی۔ فرمایا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ	پر پیش کی تو انھوں نے انکار کیا اور اس سے
يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	ڈرے اور انسان نے اُس کو اٹھالیا۔
الْاِنْسَانُ ؕ	

(الاحزاب : ۷۲)

یہ امانت اُس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعتِ الٰہی کا نزول ہُوا ہے۔ انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے باارادہ اور بااختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکامِ الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔ یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کرکے حکمِ الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح باارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کرکے حکمِ الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دُوسرے لفظوں میں یُوں ادا کرسکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُس کے احکام و اوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو۔ انبیاءؑ و رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ اِن ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اُس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعًا مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر بااختیار انسان کے افراد اپنے اُسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی

کرنے پر آمادہ ہیں، خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے۔ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي	کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر
السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ	جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین
وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَ	میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور
الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ	پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان
النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ	اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر
(الحج : ۱۸)	چکا۔

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے۔ لیکن خاص با ارادہ اور با عقل اور انجام بیں۔ انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں۔ مطیع اور سرکش۔

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں سے جس صنفِ مخلوقات میں احساس، ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے اسی قدر فطرت اُس کی دایہ گری کی خدمات زیادہ انجام دیتی ہے۔ اور جس حد تک احساس اور اختیار کا دائرہ اصنافِ ہستی میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر معلّمِ فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنفِ کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے۔ جمادات اپنی نشوونما کے لئے بیرونی غذا کے محتاج نہیں۔ نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف آنکھیں کھولتی ہے، اُن کی غذا خود اُن کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اُڑ کر اور چل کر اُن تک پہنچ جاتی ہے۔ حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں اُن کی غذا بے جوتے، بے بوئے، بے چُنے نکھارے بن پکے پکائے، ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے۔ لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمراں اور کارفرما ہوتے ہیں اُس کے منہ تک غذا کا ایک

دانہ بھی اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اُس کی جدوجہد، محنت و جاں فشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اُس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔

جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے اُسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلّت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے۔ لیکن جیسے جیسے اِن تینوں اوصاف کی ترقّی و تکمیل ہوتی جاتی ہے، طبیعت، فطرت اور جبلّت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلّت کے مضبوط اور ناممکن التغیّر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔ جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو اُن کو کرنا چاہیئے۔ نباتات عموماً وہی بنیں گے جو اُن کو بننا چاہیئے۔ حیوانات وہی کام سرانجام دیں گے جو اُن کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدودِ اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے۔ اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے۔ انبیاءؑ اور رسولؑ وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔

اس اختیار و ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں "دِل" ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اُسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے۔ انبیاءؑ اسی دِل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے، ان چیزوں کے مہیّا اور تیار کرنے کے لئے ہر انسان میں استعداد و قوّت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوّت فیّاضِ قدرت کی طرف سے پیدائش

بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب وگل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اُسی کی استعداد اُس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنّی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات واختراعات کہتے ہو، ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا اور ترقّی دیتا ہے۔ اور تمھاری ضرورت کے مطابق تمھارے لئے سامان فراہم کرتا ہے۔

اِن مادّی ضروریات کے بنانے والوں کے حسبِ استعداد اور حسبِ حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں۔ بعض ان میں سے محض مقلّد ہوتے ہیں جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے۔ بعض چابک دست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں۔ بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدّت تک اُن ہی کی تقلید کرتے رہتے ہیں۔ کاشتکاری کے اصول، ازالۂ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، اِن میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لئے خالقِ فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنے اپنے کام انجام دیتا رہتا ہے۔ اِن ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادّی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اب اِس کے بعد اُس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصولِ تمدّن، طریقۂ معاشرت، آئینِ عدل وانصاف، اخلاقِ حسنہ اور دین وتقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو، دَور شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنّت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلّہ اور درندوں کا غول بن جائے۔

جو تمھارے لئے غلّہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے۔ جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے۔ جو زیور گھڑتا ہے وہ سُنار ہے۔ جو تمھارے لئے کپڑے بُنتا ہے وہ بُنکر (جولاہا) ہے۔ جو تمھارے مکان بناتا ہے

وہ معمار ہے۔ جو تمھاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے۔ جو تمھاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے۔ جو تمھارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے۔ جو تمھارے مُلک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے۔ جو تمھاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے۔ جو اپنی صناعیوں سے تمھاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صنّاع ہے اور جو تمھارے لئے مادّی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اِسی طرح جو برگزیدہ افراد تمھارے رُوحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلّم و نگراں ہیں اُن کی بھی ایک جماعت ہے۔ لیکن جس طرح تمھاری مادّی ضروریات کے بنانے والوں کے حسبِ استعداد اور حسبِ حیثیّت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو صرف اگلے رُوحانی معلّمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں۔ یہ عام علماء ہیں بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی اُن کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں۔ یہ مجدّدین ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو الہامِ ربّانی سے فیض پاکر رُوحانیّت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ انبیاءؑ ہیں۔ اُن کے مقدّس ہاتھ تمھارے لئے غلّہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بُننے، اوزار بنانے اور صنّاعی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اُن سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لئے ہیں۔ اُن کی مُبارک انگلیاں تمھارے اُن تاروں پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں یعنی تمھارے دِل کی رگوں پر۔ غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمھارے تمام اعمال و افعال اور ہر قسم کی حرکات و سکنات اور ہر طرح کی جدّ و جُہد کا مدار ہے۔ یعنی "دِل"۔ کیا انبیاءؑ اور اُن کے متّبعین کے سوا نوعِ انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشو و نما، حفاظت، ترقّی، تکمیل اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے۔ اور کیا خالقِ فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ تمھاری مادّی ترقّی و اصلاح کی طرح تمھاری رُوحانی ترقّی و اصلاح کی بھی فکر کرتا اور ایسا سمجھنا کہ اُس نے اس کی ترقّی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوعِ انسانی

وہ معمار ہے۔ جو تمھاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے۔ جو تمھاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے۔ جو تمھارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے۔ جو تمھارے مُلک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے۔ جو تمھاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے۔ جو اپنی صناعیوں سے تمھاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صنّاع ہے اور جو تمھارے لئے مادّی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اِسی طرح جو برگزیدہ افراد تمھارے رُوحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلّم و نگراں ہیں اُن کی بھی ایک جماعت ہے۔ لیکن جس طرح تمھاری مادّی ضروریات کے بنانے والوں کے حسبِ استعداد اور حسبِ حیثیّت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو صرف اگلے رُوحانی معلّمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں۔ یہ عام علماء ہیں بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی اُن کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں۔ یہ مجدّدین ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو الہامِ ربّانی سے فیض پاکر رُوحانیّت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ انبیاءؑ ہیں۔ اُن کے مقدّس ہاتھ تمھارے لئے غلّہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بُننے، اوزار بنانے اور صنّاعی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اُن سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لئے ہیں۔ اُن کی مُبارک انگلیاں تمھارے اُن تاروں پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں یعنی تمھارے دِل کی رگوں پر۔ غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمھارے تمام اعمال و افعال اور ہر قسم کی حرکات و سکنات اور ہر طرح کی جدّ و جُہد کا مدار ہے۔ یعنی "دِل"۔ کیا انبیاءؑ اور اُن کے متّبعین کے سوا نوعِ انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشو و نما، حفاظت، ترقّی، تکمیل اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے۔ اور کیا خالقِ فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ تمھاری مادّی ترقّی و اصلاح کی طرح تمھاری رُوحانی ترقّی و اصلاح کی بھی فکر کرتا اور ایسا سمجھنا کہ اُس نے اس کی ترقّی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوعِ انسانی

کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے کیا اُس کی شانِ ربوبیت کے ساتھ سوءِ ظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے۔ وہ ان سب کو جو تمھارے لئے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بُنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے اُن میں رُوحانی برادری پیدا کرتے ہیں اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت و غربت، سوسائٹی اور مجلس، حکومت اور اقلیم اور جغرافی و قومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے، باہم جوڑ دیتے ہیں۔ اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوامِ عالم کو اولادِ آدم، اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے اخلاقی و رُوحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن و امان پیدا کرتے ہیں۔ اُن کے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر اُخوّت و محبّت کا نُور بھرتے ہیں۔ اُن کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر اُن کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور اُن کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح و غلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ انسانی طبقہ ہے جس کو ہم نبی، رسول اور پیغمبر کہتے ہیں۔ اُن کو گو براہِ راست جسم و جسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دِل اور قلب و رُوح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے۔ تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لئے جسم و جسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک اُن کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک اُن کو دل اور قلب و رُوح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب اس مقام پر ایک شبہہ یہ ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کے درمیان امن و امان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلّم بھی کرتا ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر اُن کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اُس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے۔ علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر

مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلافِ نظر سے اُن کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے۔ کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے۔ اگر اس کی زندگی اور اسبابِ زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے۔ اگر اُس کے دماغی قویٰ اور اُن کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے۔ اگر اُس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اُس کے شخصی افعال و اعمال کی حدود اور اُن کے اسباب و علل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایتھکس (فلسفۂ اخلاق) ہے۔ اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع و معاشرت) ہے۔ اگر جسم کی صحت و مرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلقِ جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور اُن سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں۔ تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیت ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور بایں ہمہ اُن میں سے ہر ایک علم و فن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور و قوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے۔ فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب و علل کی تفتیش اور اُن میں نظم و تسلسل اور علت و معلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے۔ فلسفۂ اخلاق کے معلم تمھارے اخلاق و عادات کے اسباب و علل تم کو بتاتے اور ناقابلِ فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں۔ اس سے آگے اُن کا کوئی کام نہیں۔ حکیم اور واعظ تمھارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے نہایت شیریں، خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں۔ مگر اُن میں سے کوئی نہیں جو تمھارے دلوں کا رہنما ہو، جو تمھارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے۔ وہ نہ صرف تمھارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب و علل بتائے بلکہ تمھارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے اور

خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اُس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم و تلقین و فیضِ صحبت سے تمھارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کر دے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کر دے۔ البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے۔ وہ انسانوں کو اُن کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان کے قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کر دیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے۔ وہ معلّمینِ اخلاق کی طرح اسباب و علل کی تلاش و جستجو و تشریح کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ اخلاقِ سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ اُن کی بیخ کنی کرتا ہے۔ اور اخلاقِ حسنہ خواہ وہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ اُن کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے۔ اور انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ

(الاعراف: ۱۵۷)

وہ اُن کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو اُن کے لئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور اُن کے اُس بندھن اور زنجیروں کو جو اُن پر ہوتی ہیں اُن سے اتارتا ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ

لیے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط

(النسآء : ۱۶۵)

بدکاروں کو ہشیار کرتے ہیں تاکہ رسولوں کے اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج

(الحدید : ۲۵)

ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں (اور دُنیا میں امن و امان کی زندگی بسر کریں)۔

نوعِ انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں اُن کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور بُرائی سے آگے نہیں بڑھتا۔ مگر انبیاءؑ اور رسولؐ نوعِ انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اُس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور بُرائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ اُن کا اثر اُس کی دوسری دائمی و پائدار زندگی پر کیا پڑے گا۔ وہ جسم کی خدمت جسم کے لئے نہیں بلکہ رُوح کے لئے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کی منشا کے مطابق بجا لاتے ہیں۔ وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لئے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔

وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سُناتے بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دُوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں۔ وہ خیال آرا شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں، دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے:

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ ط

اور شاعروں کے پیرو کارگم کردہ راہ ہوتے ہیں

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ۙ	تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے
وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ۙ	ہیں۔ اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

(الشعراء: ۲۲۴-۲۲۶)

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ اُن کے خالق نے جس نے اُن کے ذرّہ ذرّہ کا سامانِ راحت فراہم کیا ہے اور جو اُن کے قلب و روح کا سامانِ راحت بھی بہم پہنچاتا ہے، اُن کو اس لئے بھیجا ہے کہ انسانوں کے قلب و روح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں۔ اور اُن کے ربّ کا پیغام اُن کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اُس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو اس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان اور امن و سعادت کی روشنی میں داخل ہوں:

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ	وہی خدا ہے جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی
بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ	آیتیں اتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو) وہ تاریکی
اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ	سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا
رَّحِیْمٌ ۝	اس لئے کیا) کہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان

(الحدید: ۹)

ہے۔

انبیاءؑ بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں۔ مگر مُلک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔ وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لئے مقنّن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعامِ شاہی اور تنخواہ ماہانہ پاکر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لئے نہیں بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں۔ وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ، استقراء اور قیاس سے نہیں بلکہ عالمِ

اسرار کے مبدءِ علم سے فیض پاکر۔ وہ بھی حکیم وواعظ کی طرح پُرتاثیر کلام کرتے ہیں مگر اُن کے مانند اپنے دِل سے جوڑ کر نہیں بلکہ خدا سے سن کر اور وہ صرف کہتے نہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور دُوسروں سے کراتے ہیں۔ وہ خدا سے ہیں، خدا سے پاتے ہیں، اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں۔ غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ..... فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰي مَا يَرٰى ۝ ..... مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

(النجم: ۱-۷، ۱۰-۱۲، ۱۷-۱۸)

قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمھارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا نہ بھٹکا۔ اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے۔ وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے۔ اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا۔ طاقت والا تو وہ سیدھا ہوا درآں حالیکہ وہ آسمان کے سب کے اُوپر کناروں میں تھا۔ ..... تو اُس نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی۔ نہ اُس کے دل نے جو اُس نے دیکھا اُس کو جھوٹ کہا۔ کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اُس سے جھگڑتے ہو.... نہ بینائی نے کجی کی اور نہ سرکشی کی۔ اُس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ یہ (اے انسانو!) تمھارے رب کی طرف سے

(الاعراف : ۲۰۳)

بصیرتیں ہیں اور ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں،
ہدایت اور رحمت ہیں۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝

یہ تو عالم کے پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا تاکہ تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو۔ فصیح عربی زبان میں۔

(الشعراء : ۱۹۲ — ۱۹۵)

نکتہ یہ بالکل ممکن بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض و نیّت سے کرتے ہیں۔ کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیّت سے کرتے ہیں۔ خود غرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کر کے صرف مخلصانہ اغراض کو لو۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے۔ کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے۔ کوئی رسم و رواج و معاشرت پر زور دیتا ہے۔ کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے۔ کوئی جسمانی قوّت پر بھروسہ رکھتا ہے۔ کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے۔ لیکن انبیاءؑ کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں۔ وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصل چیز ہے اور اسی کے بدلنے سے سب کچھ بدل سکتا ہے۔ ان کی غرض خدا کی اطاعت، خدا کی محبّت اور خدا کی معرفت ہوتی ہے۔ اور تمام دوسری ترقّیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ اُن کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوّت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت و جلال کا ہر منظر

خادمانہ اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ سیاسی مصلحین کی طرح سلطنت، مالی مصلحین کی طرح دولت، تعلیمی مصلحین کی طرح تعلیمِ علم وفن، جسمانی مصلحین کی طرح قوت وطاقت اُن کا مطمحِ نظر نہیں ہوتی۔ بلکہ جو کچھ اُن کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت، خدا کی خوشنودی ہوتی ہے اور باقی تمام چیزیں اُن کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ انبیاءؑ اور اُن کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے۔ مبدء اور منبع کا فرق، غرض وغایت کا فرق، طریقِ دعوت کا فرق اور علم وعمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدء، منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیمِ ربّانی، شرحِ صدر اور وحی والہام ہوتا ہے۔ اور حکیم کے علم کا ماخذ ومنبع تعلیمِ انسانی، گزشتہ تجربہ، استقراء اور قیاس ہوتا ہے۔ یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالقِ عقل سے۔ اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدّ وجُہد کا منشا اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لئے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے۔ طریقِ دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے مگر نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے۔ حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لئے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اُس کا کرکے دکھانا اُس کے لئے ضروری ہے۔ وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت وخلوت اور ظاہر وباطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور بُرائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دُنیا میں سُقراط، افلاطون، ارسطو، دیوجانیس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ علیہم السّلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم دُوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تاکہ فتنہ و فساد رُک جائے۔ فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ اُن کی بات لوگ تسلیم کریں لیکن پیغمبر اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود بُرائی کو چھوڑ کر نیکی کو اختیار کر لیں۔ وہ اگر کبھی قانون وحدود سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو اُن کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے اوّلیں نہیں۔ اُن کی اوّلین غرض یہ ہوتی ہے کہ اُن کے پیروؤں کو خدا کی قدرت اور اُس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو اُن کے ذریعہ آتی ہیں بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کُشا اپنے زورِ بازو اور تلوار کی قوت سے دُنیا کے طبقے اُلٹ دیتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی۔ قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضۂ اقتدار جمایا۔ اُن کی تلوار کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو رُوپوش کر دیا اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا۔ لیکن کیا انھوں نے دلوں کے طبقے بھی اُلٹے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم منوا سکے؟ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لا سکے؟ وہ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن و امان پیدا کر سکے؟ وہ رُوحوں کی مملکتوں کا بھی نظم و نسق قائم کر سکے؟

حکماء اور فلاسفر جو اپنی عقلِ رسا کے ذریعہ سے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں، کیا وہ قلب و رُوح کے عجائبات کو بھی دریافت کر سکے؟ وہ مادّے اور مادّہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی صلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفتیش سے فراہم کر سکے؟ اُن کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے اُن کے ذاتی حُسنِ عمل کا بھی

کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی، دُوسرے حکماء نے اخلاق کے اسباب و علل کے حدود ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی۔ مگر کیا اس سے کسی انسان کے دِل سے بُرائی کا تخم دُور ہُوا؟ اچھائی کے بیج نے نشوونما پائی؟ اُن کے اخلاق و تعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اَسرار کا دائرہ اُن کی درسگاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو اُن کی اَخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی۔ حکمائے یونان میں سُقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور اُن میں ایک پیشہ ور کے فروغ اور کامیابی کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ یہی یُونان کے دُوسرے حُکماء کا حال تھا۔ اور توحید پرستی کا درجہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے جس کی ان کو ہَوا بھی نہیں لگی تھی۔

اِن سطروں سے اندازہ ہُوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر مؤثر بیان خطیب، ہر دقیقہ رس مقنّن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے۔ اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں جو اس کے ضُروری اجزاء اور عناصر ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اُس کا تعلق پُراسرار عالمِ غیب سے ہو۔ وہ غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو۔ عالمِ ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، رُوح القدس اُس کا ہم سفیر و ہمنوا ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو تمام بندوں میں سے اِس کے لئے چُنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

۳۔ اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں جن سے اُس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

۴۔ فضائلِ اخلاق کے پھولوں سے اُس کا دامن بھرا ہو اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے۔

۵۔ وہ لوگوں کو خدا اور عالمِ غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور "روزِ الست" کا بھولا ہوا عہد اُن کو یاد دلائے۔

۶۔ نہ صرف تعلیم بلکہ اُس میں یہ قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست رو بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں اُن کو پھیر کر پھر اُس کے آستانہ پر لے آئے۔

۷۔ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے۔

۸۔ اُس کی اِس دعوت، جدّ و جہد اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دُنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیامِ سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلقِ خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوّت و رسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دُنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مذاہبِ عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآنِ پاک نے جو دنیا کی نبوّت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوّت و رسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے، سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق اِن الفاظ میں بیان کئے ہیں:۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ	اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس
عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ	کی قوم کے مقابلہ میں دی۔ ہم جس کو چاہتے
نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝	ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں۔ بے شبہ تیرا پروردگار

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ
قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ○ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ
كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ○ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا
فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ○ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ
وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○ ذٰلِكَ هُدَى
اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ
مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ
وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ
فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا
بِكٰفِرِيْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى

تدبیر والا خبردار ہے۔ اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ
اور یعقوبؑ بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی۔ اور نوحؑ
کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اُس کی اولاد
میں داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور
موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اور اسی طرح ہم نیکوکاروں
کو بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور
الیاسؑ کو کہ ہر ایک نیکوکاروں میں سے ہے اور
اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو۔ ہر ایک کو
بزرگی بخشی دُنیا والوں پر اور اُن کے باپ دادوں
اور بھائیوں میں سے۔ اور ہم نے اُن کو چُن کر
پسند کیا۔ اور اُن کو سیدھی راہ پر چلایا۔ یہ اللہ
کی ہدایت ہے۔ اس پر وہ جس کو چاہے چلاتا ہے۔
اگر وہ شرک کرتے تو اُن کا سارا کیا برباد ہو جاتا۔
یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و
باطل میں فیصلہ کرنا حکم، اور نبوت دی۔ تو اگر
کوئی اِن باتوں کا انکار کرے تو ہم نے ان باتوں
پر ایسے دُوسرے کو مقرر کیا ہے جو اِن کا انکار
نہیں کرتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت
دی۔ اے محمدؐ! تو بھی انہی کی رہنمائی کی پیروی کر

اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ○

اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا۔ یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاددہانی ہے۔

(الانعام : ۸۳ - ۹۰)

اِن آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر اُن کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں۔ اگر ہم اُن کو یکجا کر دیں تو نبوّت و رسالت کے عام اوصاف، خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں۔

۱۔ فرمایا "ہم نے ابراہیمؑ کو دلیل دی اور ہم نے اُن کو ہدایت بخشی" جس سے معلوم ہُوا کہ اُن کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالمِ ملکوت سے ہوتا ہے۔

۲۔ ارشاد ہُوا کہ "ہم نے اُن کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکوکار تھے"۔ اس سے ثابت ہُوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

۳۔ یہ بھی کہا کہ "ہم نے اُن کو چُن کر پسند کیا اور اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں یہ ہدایت عطا کریں"۔ جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

۴۔ فرمایا کہ "ہم نے اُن کو کتاب، حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکامِ غیب کی تعلیم (نبوّت) دی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

۵۔ حکم ہُوا کہ "اُن کی رہنمائی کی پیروی کر"۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ اُن کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

۶۔ فرمایا کہ "اے پیغمبرؐ! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا یہ تو اہلِ دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے"۔ اس سے ثابت ہُوا کہ خالق کی خوشنودی اور اُس کے

ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ اُن کا کوئی دُوسرا مقصد اور مطمحِ نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیائے کرام علیہم السّلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے تعلّق و نسبت سے اِن حقیقتوں کو قرآنِ پاک نے کئی دفعہ تصریح بیان کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں:

۱۔ اشیائے غیب، امورِ خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

۲۔ وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

۳۔ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

۴۔ اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسبِ استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآنِ پاک میں متعدّد موقعوں پر آپؐ کی نسبت فرمایا گیا:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (الجمعۃ: ۲)

وہ رسول اُن پڑھوں کو خدا کی باتیں سُناتا اور اُن کو پاک وصاف بناتا اور اُن کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورۂ بالا امور کا یکجا ذکر کیا ہے۔ جاہلوں کو آیاتِ الٰہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اُس کو آیاتِ الٰہی پڑھائی اور کتاب و حکمت سکھائی گئی ہوں۔ اور دوسروں کو پاک وصاف بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود پاک وصاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دُوسرے جاہل کو عالم اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دُوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا۔ ایک دُوسری آیت میں ہے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا

ہم تجھے پڑھائیں گے تو تُو نہیں بھولے گا مگر جو اللہ چاہے۔ وہ جانتا ہے پکار اور چھپا اور

يَخْفٰى ۝ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝	ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے۔
فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝	اور تو سمجھا اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا
سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا	کا لحاظ ہوگا وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ
الْاَشْقَى ۝	اس سے پرہیز کرے گا۔

(الاعلیٰ : ۶ — ۱۱)

"ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو" پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے۔ اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لئے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال کے درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امورِ خیر اس سے بسہولت از خود صادر ہونے لگیں۔ پھر اس کو دنیا کے "سمجھانے" پر مامور کرنا، اس رمز کو آشکارا کرنا ہے، کہ دوسروں کی تعلیم و تذکیر کا منصب اس کو ملا ہے۔ اس کے بعد یہ فرمانا کہ "متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بدبخت محروم رہیں گے" اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق فیض پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔[1]

نبوّت کے لوازم اور خصوصیات نبوّت کی شرحِ حقیقت اور اس کے لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوّت کی چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدِباب ہو۔ لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو "خصوصیّت" کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں۔ یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ ان ہی کو ہم لوازم اور خصوصیات

---

[1] یہ تشریح اور طریقۂ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتبِ کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

کہتے ہیں۔ پھل پھول، چوپائے، پرندے، انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہی خصوصیات کی بناء پر ہر نوع دوسری نوع سے ممتاز اور ہر صنف دوسری صنف سے علیحدہ ہے۔ گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو اور خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں۔ لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اُس کے خواص ہیں۔ اور جس طرح شہد میں مٹھاس، حنظل میں کڑواپن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہو گئی ہیں اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورۂ بالا خاصیتیں فطرۃً ودیعت ہیں۔ لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کی اصناف کی طرح نوعِ انسانی کی بھی مختلف اصناف ہیں جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی، یورپین۔ دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل، اخلاق و عادات وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام انسانی اصناف جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتی ہیں، انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں۔ خلّاقِ فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں۔ شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی سیکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعدادیں اور قابلیتیں ہیں۔ ان میں سے ہر صنف کی اور ہر صنف

میں سے ہر ایک فرد کی قابلیت و استعداد کی خصوصیتیں دُوسروں سے الگ ہیں۔ ایک تخیّل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی داں میں عظیم الشّان فرق ہوتا ہے۔ ادب و انشاء کے خیالی بلند پرواز عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں۔ اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے اَدب و شاعری سے بیگانہ۔ پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں اَور ایک صنّاع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنفِ شعراء میں خاص دماغی قابلیّت کا اتّحاد ہوتا ہے۔ نظم کی قوّت، تخیّل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں۔ اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک مخصوص دماغی کیفیّت ہوتی ہے۔ خاموشی، غور و فکر، دقّتِ نظر، خارجی عالم سے بے پروائی، تصوّر میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی۔ الغرض مزروبوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بناء پر جو اَصنافِ انسانی پیدا ہوتی ہیں اور اُن میں جو اختلاف و امتیاز ہوتا ہے اسی طرح دماغی و ذہنی و روحانی اختلافِ استعداد کی بناء پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتی ہیں اُن میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے۔ ہنی بال و نپولین، تیمور و چنگیز دَم کے دَم میں آبادی کو ویرانہ اور ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے۔ افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریّت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سیکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کئے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر کلہاڑی نہ مار سکا۔ اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دَل بادَل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا، دریاؤں کو پھاڑتا، اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگین قلعہ اور محبسہ کو چکنا چُور کر ڈالا۔ مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ

بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ نوعِ انسانی میں اشتراک ہونے کے باوجود اصنافِ انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ اور اُن میں سے ہر قسم و صنف کی الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں۔ انہی مختلف اصنافِ انسانی میں انبیاء علیہم السّلام کی بھی ایک صنف ہے۔ اور نوعِ انسانی کی اس مقدّس صنف کے بھی چند خاص اَوصاف، خصوصیات اور لوازم ہیں جو اُن کو دُوسرے اصنافِ انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ نبوّت و رسالت کے اہم لوازم اَور خصوصیات کیا ہیں۔

وہبی استعداد ان میں سے سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں۔ اَور انہی کی طرف اُن کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں، اُن کی استعداد اور میلانِ طبع کا جَوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدّت میں جا کر وہ پُوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اسی سے ہو گا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے۔ پھر آم کے درخت کے آثار، خواص، پھل، اُس کا مزہ، اُس کا رنگ و بُو۔ غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اُسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے۔ کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے۔ لیکن اپنی ترقّی کے ہر دَور میں وہ اپنے مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے، جو ایک دِن اُس سے آخر میں ظاہر ہونے والی ہیں۔ اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اُس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہو سکتا

ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے۔ اور نبوّت کے یہ آثار، خواص اور کیفیات اس میں بالقوّہ اور استعداد کی صورت میں اُسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب وگِل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید آنحضرتؐ کے ارشاد کا کہ "میں اُسی وقت نبی تھا جب آدمؑ ہنوز آب وگِل میں تھے"[1] اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیائے کرام علیہم السّلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سے عرصۂ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار اُن سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب ونسب اور سیرت وصُورت میں ممتاز ہوتے ہیں۔ شرک وکفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اُس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں۔ اَخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اُن کی دیانت، امانت، سچّائی، راست گفتاری مسلّم ہوتی ہے۔ اور یہ تمہیدیں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد اُن کے دعوائے نبوّت کی تصدیق، اور لوگوں کے میلانِ خاطر کا سامان پہلے سے موجود رہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحٰق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمّد رسول اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم کے حالات وواقعات قبلِ نبوّت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچّائی تم کو نظر آئے گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی نبوّت پانے سے پہلے ہی سے آسمان وزمین کے خالق کی تلاش، سُورج، چاند اور ستاروں پر متفکّرانہ نظر اور بُت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کا بے آب وگیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہِ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدّس باپ کے ساتھ مقدّس سفر کے لئے تیاری، اور اس کم سنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری آمادگی اور صبر وشکر اور تسلیم ورضا کا اظہار

---

[1] جامع ترمذی مناقبِ نبویؐ ومستدرک حاکم مناقب محمّدیؐ، جلد دوم صفحہ ۶۰۰۔ حیدرآباد۔

کس مستقبل کی خبر دیتا ہے ؛ حضرت اسحٰق علیہ السّلام کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غُلَامٍ عَلِیْمٍ[1] کا خطاب پانا، پھر مقدّس باپ کی جانشینی اور یروشلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لئے انتخاب کس مقصود کا دیباچہ ہے ؛

حضرت یُوسف علیہ السّلام کی بچپن میں رویائے صادقہ اور صبر و شکر اور پاکدامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے ؛ حضرت موسٰی علیہ السّلام کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوّت سے پہلے ہی فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش کس مبتداء کی خبر ہے ؛ حضرت سلیمان علیہ السّلام کا آغازِ عمر میں علم و فہم فصلِ مقدمات کی قوّت کس نتیجہ کے آثار ہیں ؛ حضرت یحیٰی علیہ السّلام کی دعائیہ پیدائش، بچپن ہی میں اُن کی نیکی، سعادت مندی، نرم خوئی، پاکی کس مقصد کی تمہید ہے ؛ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، توراۃ کی حقیقت رسی کس روزِ روشن کی صبح ہے ؛ اور خود محمّد رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے دُعائے خلیل، نویدِ مسیحا، رویائے آمنہ اور احوالِ ولادت و تربیت، مراسمِ شرک سے اجتناب، اخلاقِ حسنہ، دیانت، امانت، آثارِ خیر و برکت، نبوّت سے پہلے ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خورشید جہاں تاب کا مطلع انوار ہے ؛

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کا یہ حال ہے :-

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا
بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ
اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ
فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ

تو ہم نے ابراہیمؑ کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی۔ تو جب وہ اُس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اُس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں سو

---

[1] الحجر ۵۳۔

افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْشَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○

(الصّٰفّٰت : ۱۰۱-۱۰۲)

تُو سوچ لے کہ تیری کیا رائے ہے۔ اُس نے جواب دیا اَے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا۔ تُو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔

حضرت مُوسٰی علیہ السّلام کو یہ خطاب ہے :-

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰىٓ ○ لا اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ○ لا

(طٰهٰ : ۳۷-۳۸)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق، تیری ماں کے دِل میں یہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔

حضرت یحییٰ علیہ السّلام کی نسبت یہ ارشاد ہے :-

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ط وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ○ لا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ط وَكَانَ تَقِيًّا ○ لا وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ○ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ

(مریم : ۱۲-۱۵)

اے یحییٰ! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اُس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی۔ اور تھا پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار۔ اور نہ تھا زبردستی کرنے والا، نافرمان۔ سلامتی ہو اُس پر جس دن پیدا ہُوا۔

نیز حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے متعلق ہے :

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ○ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ط اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ○ لا وَّ

ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنور گہوارہ میں بچہ ہے۔ عیسٰیؑ نے کہا مَیں خدا کا بندہ ہوں اُس نے مجھے کتابِ الٰہی دی اور مجھے نبی ٹھہرایا

جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ ص — اور مبارک بنایا میں جہاں ہوں۔

(مریم : ۲۹-۳۱)

اور مکّہ کا "الامین" نبوّت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقعِ شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ — تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے۔

(یونس : ۱۶)

انبیاء علیہم السّلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم نبوّت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اُس کا غیبی علم ہے۔ یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل و قیاس سے نہیں بلکہ براہِ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے آغاز سے نبوّت کی استعداد بالقوّہ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علمِ انسانی کے ماخذ علمِ انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں:

۱۔ **وجدان**۔ انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کی اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیّرات کا علم اُس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

۲۔ **فطرت**۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ہر نوعِ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں جو دُوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور اُن ہی سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔ ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علماء کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہلِ فلسفہ کی اصطلاح میں جبلّت کہتے ہیں۔ حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرۃً ہوتا ہے۔ پرندوں کے بچّوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے۔ آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے۔ شیر کے بچّہ کو درندگی کا سبق کس معلّم نے پڑھایا۔ انسان کے بچّہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دُودھ پینا کون سکھا دیتا ہے۔

۳۔ **ھدایتِ اوّلیہ**۔ انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا بادنیٰ تامّل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ اُن میں پھر کسی قسم کا شک و شُبہ راہ نہیں پاتا۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سیاہ و سپید دونوں نہیں ہو سکتی۔ ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے وغیرہ بہت سے ایسے ضروری مقدّمات اور کلّیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہوتا ہے، اس کو بداہۃً معلوم ہو جاتے ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں۔ اِس کے بعد علمِ انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اُس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے۔ انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں۔ ایک احساس اور دُوسرا عقل۔ پہلے سے وہ گرد و پیش کی مادّی چیزوں کا اور دوسرے سے اُن مادّی چیزوں کا جو سامنے موجُود نہیں یا سرے سے خارج میں موجود نہیں بلکہ عالمِ غیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں، علم حاصل کرتا ہے۔

۴۔ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوّتیں ہیں۔ باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ۔ باصرہ دیکھتی، سامعہ سُنتی، شامہ سُونگھتی، ذائقہ چکھتی اور لامسہ چھُوتی ہے۔ اِن ہی کا نام حواسِ خمسہ ہے۔

انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادّی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے اِن آلات سے آکر ٹکراتی ہیں۔ اسی کا نام احساس ہے۔ ہم چکھ کر مزا پاتے، سُن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صُورت جانتے، چُھو کر سختی و نرمی دریافت کرتے اَور سونگھ کر بُو معلوم کرتے ہیں۔ اِن حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھاتے ہیں اَور دریافت میں غلطی بھی کرتے ہیں اَور دلائل سے اُن کا یہ دھوکا اور اُن کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔ بیماری میں قوّتِ ذائقہ بدل گئی ہے اور اُس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے۔ تیز حرکت میں قوّتِ باصرہ نے ہم کو دھوکہ دیا ہے۔ ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری ہُوئی چیز چلتی ہوئی معلُوم ہوتی ہے۔ چلتے ہُوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلُوم ہوتا ہے۔ متحرّک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے۔ آسمان کے چمکتے ہُوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں؟

۵۔ علم بالواسطہ کی دُوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اِس کی بنیاد درحقیقت اُن ہی معلُومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان، الہامِ فطری (یا جبلّت)، بداہت اوّلیہ اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اور ان ہی معلوم شدہ امور پر غیر معلُوم امور کو تمثیل یا استقراء کے ذریعہ سے قیاس کر کے اُن معلُوم شدہ امور کی خصوصیات اور آثار کا حکم اِن غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ غیر معلُوم امر جس پر معلُوم امور کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں اگر مادّی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا۔ سوائے اِس کے کہ جزئیات کا استقراء پُورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیلِ تام نہ ہو یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکہ دیا ہو یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو۔ طبعیات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کئے گئے ہیں۔

لیکن اگر وہ امرِ مجہول غیر مادّی ہے تو مادّی امور پر اس غیر مادّی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظنّ و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا مگر یہ کہ وہ تمام تر نظریات یا بدیہیات و محسوسات پر علانیہ منتہی ہو۔ مابعد الطبیعۃ اور فلسفہ الٰہیات کے مسائل اسی طریقۂ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لئے اُن میں اختلافات کی بڑی گنجایش نکلتی ہے کہ اُن کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی، وجدانی یا بدیہی یا حسّی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے۔ مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے۔ عقلی اور وجدانی اور حسّی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلافات اور فرق ہو سکتا ہے۔ غور و فکر، بحث و نظر، تحقیق، جستجو اور ترتیبِ مقدمات جو قیاسِ عقلی کے کارکن اور فاعل ہیں وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں۔ اسی لئے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائعِ علم کے حصول کے زمانے اور اُن کے مراتب

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے جیسے بھوک اور پیاس کا احساس۔ اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے۔ ہم کو جو بھوک پیاس لگتی ہے کیا اُس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے کہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو، ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو، کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہے۔ اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے۔ یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچّہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات و فطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا، سُننا، چکھنا، سونگھنا،

چھونا۔ یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادّی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آسکتا۔ یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پاجاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقّی پاتے ہیں۔ اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے اُن پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔

محسوسات کے بعد بدیہیاتِ اوّلیہ کا درجہ آتا ہے۔ انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان و قطعیّت ہوتی ہے۔ دو دو چار ہوتے ہیں۔ دس پانچ کا دُونا ہے۔ ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہوسکتی۔ ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ و سپید نہیں ہوسکتی۔ ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا اور تسلیم کرتا ہے۔ مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز و رُشد کے بعد ہوتا ہے۔ کیونکہ اُسی وقت اُس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دُنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دُوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو۔ فطری احمق اور بیوقوف اُنھیں کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اُس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کو علمِ معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوّت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں اور دُوسری طرف (سمتِ کمال میں) عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اُونچی ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اُس کا دُوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا۔ ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بُوعلی سینا تک سب انہی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں۔ بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اِس علم کا طریقہ نہایت پُرخطر اور منزلِ مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔

عام طور سے انسانی علم کے یہ پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادّہ سے ہے۔ غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے۔ دوسرا یعنی فطریات کا علم خالقِ فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے۔ تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے اُن ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں۔ آپ کا چوتھا ذریعۂ علم یعنی بدیہیاتِ اوّلیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں۔ پانچواں ذریعۂ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے، وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے۔ تھوڑے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادّہ کے قریب تک پہنچتا ہے۔ وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادّی آلاتِ علم کے نتائج ہیں۔ بدیہیات، ہمارے حواس سے جو مادّی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادّی ہے مشترک تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی بدیہیات مادّی اور غیر مادّی ذرائع علم کے بین بین ہیں۔ اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادّی ہیں۔ تاہم اس غیر مادّی قوت کا مرکز ہمارا مادّی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادّی قوت کا ارادہ سے تعلق بہرحال ہوتا ہے۔

غیر مادّی علم اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے۔ اور جس کا تعلق مادّہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے۔ وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے، اس کو مادّہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادّی دل و دماغ کے آئینہ پر اوپر سے آکر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادّی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں۔ اور جس طرح انسانی علم کے مذکورۂ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے

اسی طرح یہ غیر مادّی ذرائع انسان کے رُوحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادّی، کامل مادّی، کم مادّی اور برائے نام مادّی تک ترقّی کرتا چلا گیا ہے اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادّی و رُوحانی سے لے کر پھر رُوحانی، کامل رُوحانی اور خالص رُوحانی کے ذریعہ تک ترقّی کرتے چلے گئے ہیں۔

فراست کے لفظی معنی "تاڑ جانے" کے ہیں۔ تاڑ جانے کی قوّت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اُس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہوتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سُننے، چکھنے، سونگھنے یا چھُونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دُوسری متعدّد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ اُس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا تھا مگر دیکھتا نہ تھا۔ ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اُس کی فراست اُس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صُورت دیکھی اور تاڑ گئے۔ اسی طرح ہر علم و فن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اَخیار اور نیکوکاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

اتقوا فراسة المومن فانه — مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی

ینظر بنور اللہ ۔ روشنی سے دیکھتا ہے ۔

(ترمذی)

۲۔ فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے ۔ فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ہی ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے ۔ مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش اور ترتیبِ مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہنِ رسا اس تیزی اور سُرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اُس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے ۔ یہ چیز بھی اکثر کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرۃً عطا ہوتی ہے اور دُنیا کے مشہور عقلاء اور دانایانِ رُوزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں ۔

۳۔ کشف کے لفظی معنی "کھولنے اور پردہ اٹھانے" کے ہیں مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادّیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادّی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آجاتی ہے ۔ وہ کبھی اصلی صُورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے ۔ عام لوگوں کے سمجھنے کے لئے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خواب عالمِ خواب کی بات ہے اور کشف عالمِ بیداری کی ۔ جس طرح عام لوگوں کو خواب میں، جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں، ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں اُسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطّل سے ایسا سماں پیش آتا ہے ۔ ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں ۔

۴۔ الہام کے لفظی معنی "دِل میں ڈالنے" کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو محنت، تلاش،

تحقیق، غور اور ترتیبِ مقدمات کے بغیر دل میں آجاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اُس کی صحت بعد کو حسّی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے۔ مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسّی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پہ نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آجاتا ہے۔ کیوں آتا ہے؟ اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین، علماء، شعراء اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ اُن کو دُنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

۵۔ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفاء اور آہستگی کے ساتھ دُوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں۔ اور اصطلاحًا اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں۔ یہ علم و اطلاع کے رُوحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لئے ذریعۂ یقینی ہیں اسی طرح رُوحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لئے یقینی ہیں۔ اور جس طرح علم کے مادّی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادّی ہے یعنی وجدان، پھر حسِ ظاہر اور پھر بدیہیات، اُسی طرح علم کے رُوحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر رُوحانی ہے۔ یعنی وحی پھر الہام اور پھر کشف۔

ہم نے علم کے رُوحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی الہام اور پھر کشف۔ یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں۔ اُس کی اصطلاح میں رُوحانی ذریعۂ علم کا نام مکالمۂ الٰہی (خدا سے بات کرنا) ہے اور اُس کی حسبِ ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:۔

۱۔ وحی (اشارہ) سے بات کرنا یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا۔ یہ اگر حالتِ بیداری

میں ہے تو کشف ہے اور اگر خواب میں ہے تو رؤیا ہے۔

۲۔ خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ اس کو الہام کہہ لو۔

۳۔ فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اُس کے مُنہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو سُن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں۔ کیونکہ قرآنِ پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہُوا ہے۔ لیکن اس شُہرتِ عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دُوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں۔ وحی کی ان اَقسام کا ذکر سُورۂ شوریٰ میں ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ	بات کرے۔ لیکن وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے
اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ	پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے
مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○	خدا جو چاہے اُس کو وہ وحی کر دیتا ہے۔ بیشک
(الشوریٰ: ۵۱)	اللہ بلند اور حکمت والا ہے۔

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ سے) بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے۔ یعنی یہ مقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتے کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا اور تینوں مذکورۂ بالا طریقوں میں جس طریقے سے بھی آنحضرتؐ کو غیبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے اُس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہُوا ہے:

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ	نبی خواہشِ نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ

اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ وحی ہوتی ہے جو اُس کو کی جاتی ہے۔

(النجم : ۳-۴)

الغرض اسی امتیاز کے لئے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لئے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیئے گئے ہیں تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقہ، گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے۔ بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رؤیا ہے۔ پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی[1] ہے۔

نکتہ اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اُس سے بات کرے لیکن ان تین طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے۔ مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص سے عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اِن تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمالے۔

بہرحال غیبی ذریعۂ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں، اُس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں۔ لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائعِ اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پُراسرار اور ناقابلِ فہم واقعات پیش آتے ہیں اُن پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین ذریعۂ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آسکتا ہے۔ جس سے غیر جسمانی اور غیر حسّی مادّی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دُور ہو

---

[1] ان اصطلاحات کی بحث کے لئے اصولِ فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفّٰی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج المتوفّٰی ۸۷۹ھ جلد سوم مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۶ھ دیکھنی چاہئے۔

سکتا ہے۔ خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپرچولزم کے ذریعے ارواح سے خطاب و کلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر۔ انبیاء علیہم السلام کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے۔ جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے، یا اس کو غم یا خوشی ہے اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکہ نہیں ہوتا۔ اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا۔ اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا کسی کی آواز سن رہے ہو، شبہہ نہیں ہوا کرتا اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہہ نہیں ہوا کرتا۔ غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علمِ غیب اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ قرآن پاک میں بار بار آنحضرتؐ کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے:

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ — تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لئے ہے۔

(یونس: ۲۰)

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ — کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔

رسولؐ کہتے ہیں:

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ — اور میں غیب نہیں جانتا۔

(الانعام: ۵۰)

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔

سورۂ جنّ میں ہے:

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ — تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اُس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔

(الجن: ۲۶-۲۷)

دُوسری جگہ سورۂ آلِ عمران میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ص — اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چُن لیتا ہے۔

(آل عمران: ۱۷۹)

ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیّتہً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اُن سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے۔ یعنی خدا کے سوا بالذّات کسی کو غیب کا علم نہیں۔ البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اُس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرما دیا گیا:

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ

اور وہ خدا کے ایک ذرۂ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اُتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔

(البقرۃ : ۲۵۵)

یعنی اپنے علومِ غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ اُن کو بذریعہ وحی اُن سے واقف کرتا رہتا ہے۔ بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اِن کا علم کسی کو نہیں، مثلاً قیامت، بارش، ہوتا شکمِ مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی، کل کیا ہوگا۔ اِن باتوں کو خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اِسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرتؐ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدمِ شرکت کے بعض عذر خواہ لوگوں کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انھوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی۔ خدا نے فرمایا:

عَفَا اللَّهُ عَنكَ ۖ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ ○

خدا نے تجھ سے درگزر کیا، کیوں تُو نے اُن کو اجازت دی تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔

(التوبۃ : ۴۳)

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ ○

انھوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات اُلٹ دیئے یہاں تک کہ حق بات آگئی اور خدا کی بات کُھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔

(التوبۃ : ۴۸)

آگے چل کر ہے:

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۖ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۖ

یہ نفاق پر اڑے ہیں۔ تُو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔

(التوبۃ: ۱۰۱)

اِن آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کُلّی علم نہیں ملتا بلکہ اُن کو غیب کی اطلاع دیئے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امورِ غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے اُن کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں؟ قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اُس کے اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں۔ اجمالاً اِس کا اطلاق ان اُمور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا۔ گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان، حواس اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں۔ ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں، جو علم حاصل نہیں ہوتا اس کو علمِ غیب کہتے ہیں۔ یعنی اُس شے یا اُن اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہیں اور اس کا مقابل لفظ "شہادت" ہے جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں۔ یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کہا ہے[1]۔ یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے

---

[1] الانعام: ۷۳، الرعد: ۹، الحشر: ۲۲، التغابن: ۱۸۔

ان سب کا عالم اور واقفِ کل وہی ہے۔ الغرض اجمالاً علم غیب اُس غیبی طریقۂ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآنِ پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہُوا ہے:۔

۱۔ زمانۂ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے کہ حواس سے صرف شاید (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے۔ اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے اگر ہو سکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ۔ لیکن جس کے لئے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اُس کے لئے اُن کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

حضرت نُوح علیہ السّلام کے مختصر قصّہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ

یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم اِن کو وحی کرتے ہیں تیری طرف۔ تو تُو اُن کو پہلے سے جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

(ھود : ۴۹)

حضرت مریم علیہا السّلام کے قصّہ میں ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے۔ اُس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں۔ اور نہ تُو اُن کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تُو ان کے پاس اُس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

(اٰل عمرٰن : ۴۴)

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اُس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا۔ اُس کی آنحضرتؐ سے نفی کی گئی کہ آپؐ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے۔ اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سُننا، اُس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دُوسروں سے معلوم کیا۔ اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، ہم اس کو تیری
اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ	طرف وحی کرتے ہیں اور تُو اس وقت اُن کے
اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ○	پاس نہ تھا، جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور
(یوسف: ۱۰۲)	چال چل رہے تھے۔

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا ہے۔ بہرحال ان آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں اُن کو بھی غیب کہا گیا ہے۔ ان کا علم دلائل وقیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہُوا ہو تو اُس کو بھی علم غیب کہیں گے۔ قرآنِ پاک میں ایک موقع پر ان کفّار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا:

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ	تُو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لئے ہے۔
اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ○	انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے
(یونس: ۲۰)	والوں میں ہوں۔

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں "غیب" کہا گیا ہے۔ اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اُس کے علم کی نفی کی گئی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج	خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔

(لقمٰن : ۳۴)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ط	وہ قیامت کو پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ اس کا علم
قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ج	میرے پروردگار کے پاس ہے۔

(الاعراف : ۱۸۷)

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے:

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ	کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی
غَدًا ط وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ	یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔
تَمُوْتُ ط	

(لقمٰن : ۳۴)

۳۔ اُن چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانۂ حال میں موجود ہیں تاہم انسان کے حواسِ خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے اُن کا علم نہیں ہو سکتا۔ ہم کو دیکھنے اور سُننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اُس کے لئے کسی نہ کسی مسافت، عدمِ حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بیکار ہے۔ ہم دلّی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیشِ نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سُن سکتے ہیں۔ اس لئے زمانۂ حال کے علم کے لئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں اُن کے بغیر جو علم حاصل ہوگا وہ غیب ہوگا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اُس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں، کیا ہے؟ کس کو معلوم؟

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ط — اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔

(لقمٰن : ۳۴)

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانۂ حال میں سب کے سامنے موجود ہے۔ تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اُس وقت تک باہر ہے جب تک ہمارے دیکھنے اور سُننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط بتا دیئے ہیں وہ پورے نہ ہوں:

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط — اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمینوں کا غیب۔

(ھود : ۱۲۳)

إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط — بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

(الحجرات، ۱۸)

۴۔ عالمِ غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادّی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرۂ عمل سے قطعاً باہر ہیں۔ ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے۔ خدا کی رؤیت کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ جنّت اور دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آسکتی۔ یہ تمام امور بھی غیب ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ — تو جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں۔

(الانبیآء : ۴۹)

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ — وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔

(البقرۃ : ۳)

اَلَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ط — وہ جنّت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں۔

(مریم : ۶۱)

"غیب میں" کے معنی ہیں بے جانے، بن دیکھے، حواس سے علم حاصل کئے بغیر اور باوجود اِس کے کہ وہ چیزیں اِس عالم میں دیکھی نہیں جاسکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ اِن چاروں قسم کے اُمورِ غیب ہوتے ہیں۔ بعض گزشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آمیز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطہ سے اُن کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گزر چکا۔ آیندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، اُمّتِ محمدیہ کے انقلابات، قیامت کے مناظر اور اُس کے بعد کے پیش آنے والے واقعات کا علم آپؐ کو دیا گیا، جیسا کہ اِن دُنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت و محشر کے اُن مناظر سے ظاہر ہے جو قرآنِ پاک اور احادیثِ صحیحہ میں تصریح مذکور ہیں۔ اسی طرح حال کے ان احوال و مناظر کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تعقّل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے، قبروں کا انکشاف، پسِ پردہ رویت، دوسروں کے موجودہ احوال سے واقفیت وغیرہ۔ اس علمِ غیب میں سے بھی پیغمبر کو عطا ہوتا ہے۔ اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس و تصوّر ہمارے مادّی ذرائعِ علم سے قطعاً خارج ہے تاہم وہ بھی اُس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں، خود خدا کا دیدار، فرشتوں کی رویت، جنّت و دوزخ کا

مشاہدہ وغیرہ۔ ان تمام امورِ غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لئے جس قدر مناسب اور سزاوار

اُن سے اُونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں۔ اور آخر میں اُن سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جاکر یہ قویٰ پُورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدُود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوتِ احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ، تصوّر، تعقّل وغیرہ کے وہ قوانین ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قویٰ ہیں جو حیوانات میں نہیں۔ اِسی طرح انبیاء علیہم السّلام میں علم و تعقّل کی ایک ایسی قوّت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی۔ اور اسی کا نام ملکۂ نبوّت ہے۔

حواس صرف مادّیات کو دریافت کرتے ہیں۔ دماغی قویٰ مادّیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ نبوّت اس سے بھی اُونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات اور عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے۔ اس ذریعۂ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسُوسات سامنے آتے ہیں۔ اور ان ہی کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اس ذریعہ میں علمِ انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرتِ نوعی، بداہتِ اوّلیہ، احساس اور غور و فکر سے معلُومات حاصل نہیں کی جاتیں بلکہ خود علّام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر اُن کو عطا کرتا ہے۔ شرع کی زبان میں اس کو وحی و الہام کہتے ہیں۔ علمِ کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوّت اور عام محاورہ میں اُس کو غیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہلِ نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صُورت نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہِ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے۔ یہی وحی ہے۔

امعانِ نظر سے معلوم ہوگا کہ اہلِ عقل و نقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہِ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربّانی کا۔ دوسرے

لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوت آغازِ پیدائش ہی میں فطرۃً ودیعت کر دی جاتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کر دی جاتی ہے یا یہ کہ وہ فطرۃً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم و فہم رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے۔ وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔ ع

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم!

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بد فطرت اور آغازِ پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا اُن کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جن کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتا ہے جس سے غیر انبیاء محروم ہیں۔ اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں۔ اسی کا نام "ملکۂ نبوت" ہے۔ اور اہم امورِ دین کے متعلق اُن کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے اُس کا نام "وحی" ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہی دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے مُنہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے۔ اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بیشک خدا کی براہِ راست وحی ہے، مگر اُس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اُس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے۔ لیکن حقیقت ان دونوں کے ماوراء ہے۔ جیسے وحیِ قرآنی وحی براہِ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اُس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں بلکہ اُس کی پیغمبرانہ وہبی قوتِ علم و فہم کا نتیجہ ہیں جو وحی کی ایک

دوسری قسم اس لئے کہی جاسکتی ہے کہ اُس کا منشاء ملکۂ نبوّت کے ذریعے وحیٔ ربّانی کی ترجمانی ہے۔ اس لئے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوّت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنّت اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحیٔ حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتابِ الٰہی، صحیفۂ ربّانی، توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے۔ دُوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوّت یا نورِ نبوّت یا فہمِ نبوّت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا علم اصلی اور دُوسرا ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دُوسرا فروعی ہے یعنی علم اوّل پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدّل اور ازلی احکامِ کلّیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدّل کلّی اصول کے ماتحت اُس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اُس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدّل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اور اسی دُوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور حادیث کی صورت میں ہے۔ اور جس کو اہلِ اصول اصطلاحاً سنّت کہتے ہیں۔ کتاب اصولی احکام ہیں اور سنّت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے۔ کتاب براہِ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنّت ملکۂ نبوت اور فہمِ نبوی کا۔ کتاب بلفظہٖ وحی ہے اور سنّت بالمعنی۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنّت دونوں کو وحی مانا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اُس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنّت اُس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ اس کی تشریح کا مقصود حقیقۃً تلاوت و عدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کئے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں۔ اُن کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کی پیشین گوئی میں داخل ہے۔ اور اس لئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہے۔ اور سنّت میں الفاظ کی نہیں صرف

معانی کی حفاظت ہے۔ اس لئے کتاب کی وحی مدوّن، مکتوب اور محفوظ کی گئی۔ اور نماز میں اُس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اُس کی تلاوت مسنون ہے اور سنّت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں۔ اس لئے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیّت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اُس کے الفاظ قرأت کئے جا سکتے ہیں۔ اور نہ اُن کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ اُن کو کتابِ الٰہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر معنیً اصولی حیثیّت سے اُن کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے اور جزئیات کی حیثیّت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اُس کے پیروؤں اور پھر اُن کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے، یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے۔ اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کُتبِ حدیث کے اوراق میں بھی اُن کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنّت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اُس کے جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں۔ اور اُس کی کلیّت میں سنّت کے تمام احکام مندرج ہیں۔ بنا بریں چونکہ سنّت وحی کے کلّی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیّت سے وحی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں اس لئے وہ غیر متلو ہے۔

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیّت کلّی قانون کی ہے۔ قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لئے نہ صرف اُس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اُس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدّم، تاخّر، یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے۔ ورنہ ذرا سے تغیّر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جا سکتا ہے اور سنّت کی یہ کلّی قانونی حیثیّت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلّی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو درحقیقت اس کُلّی قانون کے اندر مندرج تھے۔ مگر چونکہ عام لوگوں کی فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ اُن کو نہیں سمجھتے تھے اس لئے صحابہؓ

کے دریافت پر یا خود حضورؐ نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اُس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک اور نکتہ بھی ہے کہ کتابِ الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اور انھوں نے آنحضرتؐ سے اُس کی تشریح چاہی یا انھیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآنِ پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا۔ اور اس لئے انھوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا تو اُس کے جواب میں اگر آنحضرتؐ قرآنِ پاک کے بعینہٖ ان ہی الفاظ کو بے کم و بیش دُہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہی الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے تو سوال کی نوبت آئی اس لئے ضرور تھا کہ آنحضرتؐ الفاظ کو بدل کر اور طریقۂ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانونِ الٰہی اور کتابِ ربانی ہی کے مفہوم و منشاء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھنے والوں کی سہولت، گمراہوں کی تکمیلِ ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے۔ اس لئے اصل مفہوم و منشاء کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں۔ لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہمِ نبوی، اجتہادِ نبوی اور ملکۂ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں۔ اسی لئے اُن کو اصطلاح میں "وحی غیر متلو" کہتے ہیں۔

ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے[1]۔ یہ وحیِ الٰہی کا حقیقی منشاء ہے۔ آنحضرتؐ نے اس منشائے الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا۔ "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے"۔ کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی

[1] الاحقاف: ۱۵-۱۶

باپ کی خوشنودی میں ہے۔ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ "یارسول اللہؐ! میرے حُسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟" فرمایا "تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں"۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے، صحابہؓ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے "وہ ذلیل ہُوا، وہ ذلیل ہُوا، وہ ذلیل ہُوا"۔ حاضرین نے عرض کی "یارسول اللہؐ! کون؟" ارشاد ہُوا "وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر اُن کی خدمت گزاری کرکے جنّت نہ حاصل کرلی"۔ ایک اور مجلس میں صحابہؓ نے پوچھا کہ "یارسول اللہؐ! نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟" فرمایا "وقت پر نماز ادا کرنا"۔ دریافت کیا اس کے بعد۔ فرمایا "ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا"۔

اِن تمام احادیث پر معمولی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کردے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں:۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا	ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔
(البقرۃ: ۸۳، النسآء: ۳۶)	
فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ	وہ بوڑھے ہوجائیں تو اُن کو اُف نہ کہو۔
(بنی اسرائیل: ۲۳)	
وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ	یہ (ماں باپ کے خدمت گذار) وہ ہیں جن کی
(الاحقاف: ۱۶)	بدیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں۔

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیان و تشریحات کا ہے۔[1]

---

[1] مجھے پہلا شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بحمداللہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہُوا کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے۔ چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ مطبوعہ علمیہ مصر ۱۳۱۲ھ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام جلد اوّل سلفیہ مصر ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے۔ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

احادیث قرآن کا بیان ہیں قرآنِ پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق و وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآنِ پاک کے عمومی اور کلّی احکام کے تحت میں مندرج ہیں۔ آنحضرتؐ نے اپنے الفاظ میں صرف اُن کی تشریح فرمائی ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں۔ ایک وہ جن میں آنحضرتؐ نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآنِ پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی۔ اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؛ دُوسری شکل یہ ہے کہ آپؐ نے آیت نہیں پڑھی مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے ہیں جو کسی آیت کا جُزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے۔ اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تمیز اہلِ علم کے لئے آسان ہے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپؐ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرما دیا۔ اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقتِ نظر کا کام ہے۔ اُن کا پتہ زبانِ نبوت اور فہمِ رسالت کے طرزِ اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پا سکتے ہیں۔

الہام و اجتہاد و حکمت امام شافعی نے کتاب الرسالہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دوسری وہ جو قرآنِ پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں۔ تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآنِ پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً۔ یہی تیسری قسم قابلِ بحث ہے۔ امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریے نقل کئے ہیں[1]:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلّی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی (حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسول کو یہ توفیقِ ربّانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرے)۔

---

[1] کتاب الرسالہ امام شافعی۔

۲۔ رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ اس کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں۔ گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)۔

۳۔ تمام احادیثِ نبوی، القاء فی الرُّوع ہیں (یعنی رسول کے دل میں خدا نے ڈال دیئے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپؐ کے دِل میں ڈالی گئی۔

۴۔ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں کتابِ الٰہی سے جداگانہ، مستقل پیغامِ ربّانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین رائیں میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے، اس کو ابتداء ہی سے ایک توفیقِ ازلی بھی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے۔ تیسرے نظریہ میں اسی توفیقِ علم کو الہام، القاء فی الرُّوع اور دِل میں ڈال دیئے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دُوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں اُن کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے۔ اور رسولؐ اُسی اصل سے اپنے احکام مستنبط کرتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا، بلکہ وہ "پیغمبرانہ قوّتِ فہم" کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس "پیغمبرانہ قوّتِ فہم" کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القاء سے کرو یا اس کو حکمتِ نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیقِ الٰہی کہو۔ بات ایک ہی ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسولؐ کے تمام صحیح ربّانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربّانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور اُن کی جُزئیات کتابِ الٰہی کے کلّیات کے تحت میں مندرج ہیں۔ اور رسول کا یہ اخذ، استنباط اور فہم اُس کی اِس پیغمبرانہ قوّتِ علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکماء ملکۂ نبوّت اور اہلِ شرع حکمت، الہام اور شرحِ صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطاء اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

اجتہادِ نبوت اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح "اجتہادِ نبوی" کی تشریح ضروری ہے۔ علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرتؐ کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرتؐ اجتہاد فرماتے۔ یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہاء کا طریقہ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہئے کہ رسول اپنی اس حکمتِ ربانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے اُن کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی، گزشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اُس کا فیصلہ فرماتے تھے)۔ بہرحال خواہ فقہاء کے طریق پر اجتہادِ نبوی کو نصوصِ قرآنی سے مستنبط سمجھئے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علمِ سینہ اور وحی شدہ اصولِ کلی کے جزئیات تسلیم کیجئے ہر حال میں وہ نتیجہ امت کیلئے واجبُ العمل اور خطا سے پاک ہے۔ کیونکہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیاءؑ گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرّا ہوتے ہیں۔ اس لئے امورِ رسالت اور امورِ دین میں اُن کی رائے غلط نہیں ہوسکتی کہ اُن کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہوجانا مسلّم ہے حالانکہ اُن کی بعثت کی غرض ہدایت ہے ضلالت نہیں۔ ان وجوہ سے اُن کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اُس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے۔ (اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحیٔ الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم علمِ الٰہی کے منشاء کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرّا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں[1]۔

---

[1] سطورِ بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے حوالہ کے لئے دیکھو شرح تحریر ابنِ ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمّٰی بہ التقریر والتحبیر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معنیً گذشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے۔ اس لئے اس اجتہاد نبوی کے معنی الہام، حکمت، ملکۂ نبوّت، فہم نبوی وغیرہ گذشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اُس کی حیثیت بھی وحی ثانوی کی قرار پاجاتی ہے۔

اِس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اُس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

ساتواں مبحث احادیثِ نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علومِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقسام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ ایک وہ جن کا تعلق تبلیغِ رسالت سے ہے اور یہ آیت:

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ

پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

(الحشر : ۷)

اِسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال، جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اِسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دار و مدار صرف وحی پر ہے۔

اور اُن اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا، قوانینِ شریعت اور عبادات و معاملات کے جزئیات

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ جلد سوم اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح جلد دوم بحث الرکن الثانی فی السنۃ۔

کا تنبط بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ لیکن اِن میں سے بعض چیزوں کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپؐ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپؐ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضعِ قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپؐ کو تعلیم کر دیا تھا۔ وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا آپؐ اسی کلّی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپؐ کو سکھایا گیا تھا، ان کی تشریح فرما دیا کرتے تھے۔ حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپؐ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ اُن کی حدود بتائیں مثلاً اخلاقِ صالحہ اور اخلاقِ غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغِ رسالت سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اُن میں اکثر کا دارومدار اجتہاد پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلّی قانون تعلیم کر دیا تھا۔ اور آپؐ نے حکمت کی باتیں اسی کلّی قانون سے جو آپؐ کو تعلیم کر دیا گیا تھا، مستنبط کیں۔ اور اُن کے متعلق ایک کلیہ بنایا۔ فضائل اعمال اور اُن پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں اِن میں بعض کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے۔ ان قوانین کا بیان اوپر گزر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور اُن کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغِ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "میں صرف ایک آدمی ہوں۔ جب میں تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں"۔ اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپؐ کا یہ فرمانا کہ "میں نے ایک خیال قائم کیا تھا، میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو۔ البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا"

اسی قسم سے تعلّق رکھتا ہے۔ طبّ کے متعلّق حدیثیں اور آپؐ کا ارشاد کہ "تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو" اسی قسم میں داخل ہے۔ اور اس کا دارومدار تجربہ پر ہے۔

آپؐ نے جو کچھ عادۃً کیا عبادۃً نہیں، اتفاقاً کیا قصداً نہیں، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ آپؐ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً امّ زرع اور خرافہ کے قصّے، وہ بھی اسی قسم سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابتؓ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی، اس طرح بیان کیا ہے کہ "میں آپؐ کا پڑوسی تھا اور جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپؐ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا۔ لیکن جب ہم دُنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے۔ تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطورِ حدیث بیان کروں؟

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپؐ نے اپنے زمانہ کی جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امّت کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ "اب ہم کو جج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفّارِ قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے۔ لیکن اب خدا نے اس کو ہلاک کر دیا" بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی اور عارضی مصلحت سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا اس لئے اُن کو یہ خوف ہُوا کہ خاص اس کا کوئی اور سبب ہو اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی۔ اسی طرح دُوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں۔ مثلاً آپؐ کا

یہ ارشاد کہ "جو شخص جس کو قتل کرے اُس کا ہتھیار اسی کا حق ہے"، نیز آپؐ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپؐ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے جو یہ فرمایا تھا کہ "واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا" اس کے معنی بھی یہی ہیں۔" (انتہیٰ کلامہ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغِ رسالت اور مہماتِ امورِ دین سے ہے۔ یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم سے ماخوذ ہیں۔ دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں۔ ان کی متعدد صورتیں ہیں:۔

۱۔ کسی جزئی عارضی مصلحت کی بناء پر کوئی حکم، جیسے حج میں آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

۲۔ وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں، مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

۳۔ وہ امور جن کو آپؐ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں، مثلاً وضع و لباس، فرش پر نشست، کمل اوڑھنا۔ دسترخوان اور چمچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اُونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

۴۔ وہ امور جو عرب میں بطورِ قصہ کے مشہور تھے اور آپؐ نے بھی اُن کو اسی طرح تفنّنِ طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا۔ مثلاً اُمّ زرع اور اُس کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

۵۔ عربوں کے بعض تجربی مسلّمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

۶۔ زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر

چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے۔ آپؐ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ "اگر ایسا نہ کیا کرو تو کیا ہو۔" مدینہ والوں نے آپؐ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی۔ لوگوں نے آکر عرض کی۔ فرمایا میں نے ایسا خیال کیا تھا۔ "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو)۔ یہ امور تغیر اور ردّ و بدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسولؐ کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبارِ معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے، یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں، جو دائمی اور ناقابلِ تغیر ہیں۔

ان ناقابلِ تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں۔ ایک براہِ راست وحیٔ الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی۔ اور دوسری اجتہادِ نبویؐ۔ یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے۔ شاہ صاحب، اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں:۔

۱۔ یہ کہ اجتہادِ نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے۔ مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے، اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اجمالی طور سے شریعت کے کلّی اصول و قواعد کا علم منصبِ نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرما دیا ہے۔ اسی علم کے مطابق آپؐ وحی کی توضیح، احکامِ منصوصہ کی تفصیل، کسی کلّی کے جزئیاتِ مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے۔

۲۔ پیغمبروں کا یہ اجتہاد دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا و غلطی سے یکسر پاک و منزّہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کی رائے خطا و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی

ہے۔ اسی لئے "اُن کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلۂ وحی کے ہے"

"پیغمبرانہ اجتہاد" کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیشِ نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دُوسرے لوگ ملکۂ نبوّت، الہام، القاء، حکمتِ ربّانی، فہمِ نبویؐ سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور "اجتہادِ نبوی" میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوّت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے۔ اس لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں، مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے۔ آنحضرتؐ کے سوا اور جتنے صاحبِ کتاب انبیاءؑ آئے ان کی وحیٔ کتاب اور نتائجِ حکمتِ نبوی میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہا۔ چنانچہ توراۃ و انجیل و زبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ اُن کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آسکتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپؐ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی۔ بلکہ اسی لئے آغازِ اسلام میں آپؐ نے نتائجِ حکمتِ نبوی کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا تاکہ کتاب کے ساتھ اُن کی آمیزش نہ ہو۔ بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے، کہ آپؐ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہؓ اور علماء کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی عام نہیں لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے اُن کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں۔ اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہؓ، تابعین اور تبعِ تابعین اور علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت و بے گناہی | نبیؐ کی تیسری اہم خصوصیت اُس کی معصومی اور بے گناہی ہے۔ یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیّل نہیں اس لئے اُن کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السّلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو اُن کی شانِ نبوّت کے سراسر منافی ہیں۔

عیسائیوں میں صرف ایک مسیح علیہ السّلام کی ذات معصوم مانی جاتی ہے۔ لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے۔ اُس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے۔ اُن سے بتقاضائے بشریّت بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی اِن غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ نبوّت کے متعلق عقلی حیثیّت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت و صحّت پر اعتبار کیا جا سکتا۔ اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدّس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور اُن واقعات کی تردید کی ہے جو شانِ عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے اُن کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پُرجوش اور پُر تاثیر کلام نظم کرتے ہیں، یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں۔ اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے۔ قرآن نے اُن کے جواب میں کہا کہ درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے:۔

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ	شیطانوں کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور
اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○	نہ اُن پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔
اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ	اس کا زور انہی پر چلتا ہے جو اُس سے دوستی کرتے
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ○	ہیں اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

(النحل: ۹۹ — ۱۰۰)

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا	اور صبر کر۔ اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے

تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا
يَمْكُرُونَ ○ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ
اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ○

ہے، اور نہ تُو اُن پر غمگین ہو، اور نہ اُن کے فریب
سے تنگ دل ہو، بیشک خدا اُن کے ساتھ ہے
جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔

(النحل : ۱۲۷ — ۱۲۸)

اِس آیت سے ظاہر ہُوا کہ انبیائے کرام علیہم السّلام شیطانوں کے فریب سے آزاد، متّقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔

سُورۂ شعراء میں اِسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے:

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ
الشَّيَاطِينُ ○ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ
أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ○ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَ
أَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ○

کیا مَیں تمھیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں؟
اُن پر اترتے ہیں جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گنہگار ہوتے
ہیں۔ (لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ غیب
کی باتیں سُن رہے ہیں) کان ڈالتے ہیں اور وہ
اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

(الشعراء : ۲۲۱ — ۲۲۳)

سُورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ○ يَسْمَعُ
آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ
مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ
فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ○

پھٹکار ہو اُس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار ہے۔
خدا کی آیتوں کو جو اُس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں
وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑا رہتا ہے گویا
اُس نے سُنا نہیں۔ تو اُس کو دردناک عذاب کی
بشارت دے دو۔

(الجاثیۃ : ۷ — ۸)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السّلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور اُن کی سچّائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے۔ اور نیز یہ کہ نبوّت کی حقیقت کذب و گنہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہُوا:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوّت دے یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔

(اٰل عمرٰن : ۷۹)

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا۔ اور یہ گناہ اُن سے سرزد نہیں ہوتا۔

اور ایک آیت میں فرمایا:

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ

کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ کچھ چوری سے چھپالے اور جو کوئی چھپالے گا قیامت کے دن لے کر اُس کو حاضر ہوگا۔ پھر اُس وقت ہر شخص کو اُس کے کام کا پُورا بدلہ ملے گا اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔ کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے وہ اُس جیسا ہو سکتا ہے جو خدا کا غضب کمائے۔ اور اُس کا ٹھکانا جہنّم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔ انسانوں کے

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ لَقَدْ
مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا
مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

(اٰل عمرٰن : ۱۶۱ - ۱۶۴)

خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا اُن کے کام سے
خبردار ہے۔ بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان
کیا کہ اُن میں اُنہی میں سے ایک ایسے رسول کو بھیجا
جو اُن کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو
پاک وصاف بناتا اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے
اور وہ بے شبہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں
تھے۔

اِن آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ اُن کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں۔ مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرتؐ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اُس سے ایسا جُرم سرزد ہو سکے۔ کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ اور جو دُوسروں کو احکامِ الٰہی سنائے خود اُس سے اُن احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دُوسروں کو پاک وصاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انبیاء علیہم السّلام کے لئے بار بار قرآن نے "چُن کر پسند کرنے" کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر اُن کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا
وَّمِنَ النَّاسِ ؕ

(الحج : ۷۵)

خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر چُن کر پسند کرتا
ہے اور آدمیوں میں سے۔

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

اللہ نے آدمؑ، نوحؑ، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام اہلِ دُنیا سے چُن کر پسند کیا۔

(آل عمران : ۳۳)

خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہُوا:

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ

ہم نے اُس کو دُنیا میں چُن کر پسند کیا۔

(البقرۃ : ۱۳۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرمایا:

اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ

مَیں نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں میں سے چُن کر پسند کیا۔

(الاعراف : ۱۴۴)

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفاء کے ساتھ خَیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۝ (ص : ۴۵ - ۴۷)

ہمارے خاص بندوں ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوتِ عمل) والے اور آنکھوں (قوتِ علم) والے تھے۔ ہم نے اُن کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چُنے ہُوئے نیکوکاروں میں تھے۔

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ○ وَجَعَلْنٰهُمْ	اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور
اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ	ہم نے اُن کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں
اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ	کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے اُن کو نیک کاموں
الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا	کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے
لَنَا عٰبِدِيْنَ ○	کی وحی کی۔ اور وہ ہمارے پرستار تھے۔

(الانبیآء: ۷۲-۷۳)

کیا اس سے زیادہ اُن کی عصمت اور بیگناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے۔

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا:

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○	یہ سب صالحوں میں تھے۔

(الانعام: ۸۵)

پھر آگے چل کر فرمایا: كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ[1] (ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی)۔ پھر اُن کا ذکر کر کے فرمایا: وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[2] (اور ہم نے اُن کو برگزیدہ کیا اور اُن کو سیدھی راہ چلایا)۔ صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی و سعید اور گنہگار و نیکوکار دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس اور اشتباہ ممکن نہیں۔ تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس

---

[1] الانعام: ۸۶ [2] الانعام: ۸۷۔

فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں۔ اس اصول کو قرآنِ پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ	کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں، یہ گمان کرتے
اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ	ہیں کہ ہم اُن کو اُن کی طرح بنائیں گے جو ایمان
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ	لائے اور اچھے کام کئے کہ اُن دونوں کی زندگی
وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝	اور موت یکساں ہو۔ یہ اُن کا فیصلہ کتنا بُرا ہے۔

(الجاثیۃ : ۲۱)

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیاءؑ کے وصف میں فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ	جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے
یَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا	ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔
اللّٰهَ ؕ	

(الاحزاب : ۳۹)

آنحضرتؐ کے اہلِ بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے۔ ازواجِ مطہرات کی شان میں ہے:

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ	اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک
النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ	کی طرح نہیں ہو اگر تم متقی ہو۔

(الاحزاب :۳۲)

پھر اہلِ بیتِ نبویؐ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادۂ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف اور ستھرا بنائے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ	اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دُور کر دے
الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ	اے نبی کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا
تَطْھِیْرًا ○ (الاحزاب: ۳۳)	بنا دے۔

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السّلام کے ازواج و اَولاد کی شرافت کے لئے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیاء علیہم السّلام کا کیا ذکر ہے۔ ایک دُوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بَری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ	گندیاں گندوں کے واسطے، اور گندے گندیوں
لِلْخَبِیْثٰتِ ۚ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ	کے لئے، اور سُتھریاں سُتھروں کے واسطے اور
وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِکَ	سُتھرے سُتھریوں کے واسطے۔ یہ اُن کی تہمت
مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ ؕ	سے پاک ہیں۔

(النور: ۲۶)

یہاں طیّب، پاک اور سُتھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے پَن، پاکی اور طہارت سے ازواجِ مطہّرات کے اخلاقی سُتھرے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیاء علیہم السّلام درحقیقت مقتدیٰ اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دُنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ	تمھارے لئے خدا کے رسولؐ میں اچھی پیروی
اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۚ	ہے۔

(الاحزاب: ۲۱)

نیز اُن کی اطاعت واجب ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔

(النّسآء : ۶۴)

اور خاص آنحضرتؐ کی نسبت تصریح ہے کہ آپؐ کی پیروی خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم کو چاہے گا۔

(اٰل عمرٰن : ۳۱)

کیا کسی گنہگار اور عصیاں کار کی زندگی، پیروی اتّباع اور نمونہ بننے کی صلاحیّت رکھتی ہے؟ تاریکی سے روشنی کبھی نکلی؛ اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی؛ اور گنہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکو کاری پھیلی ہے؛ بُرائی اور گنہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوّتِ شر ہے۔ لیکن خدا کے خاص بندے اُس کے دامِ فریب سے آزاد ہیں:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝

یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں۔ تیرا پروردگار (اپنے بندوں کی طرف سے) سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔

(بنی اسرائیل : ۶۵)

کیا انبیائے کرام علیہم السّلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے؟

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری وسوسۂ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے خواہ یہ شیطان خود اپنے دِل کے اندر (خنّاس) چھپا ہو یا انسان اور جنّ کی صورت میں ہو۔ ہر ایک کے فتنہ سے اُن کی ذات

پاک اور بلند ہے۔

آنحضرتؐ کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا۔ اور فرمایا کہ میری جو رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے وہ ہر وقت تیری دست گیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے۔ اور کتابِ الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ	اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو
لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ	ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔
وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا	اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ
يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ	کو اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔
عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ	اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے۔
مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ	اور اُس نے وہ سکھایا جو تُو نہیں جانتا تھا اور
اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ○	تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

(النسآء : ۱۱۳)

اور یقیناً موقع و محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفسِ انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں، خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام اس فریبِ تمنا سے بھی پاک ہیں۔ بشریت کے اقتضا سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوتِ حق کو لے کر وہ آئے ہیں اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبولِ ایمان کے متعلق اُن کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں۔ لیکن وہ مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں اس لئے اللہ تعالیٰ اُن خیالات اور تمناؤں کو اُن کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برجا رکھتا ہے۔ فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے، اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے، اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔

(الحج : ۵۲)

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام علیہم السلام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے متعلق فرمایا گیا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ○

اے مسلمانو! تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔

(النجم : ۲)

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرتؐ کے ہر عہدِ سابق اور زمانۂ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپؐ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ قرآنِ پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پہ عدمِ معصومیت کے بھی داغ ہیں۔ مگر علمائے محققین نے اُن میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابنِ حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں، قاضی عیاض مالکی نے شفاء (قسم ثالث، باب اوّل)

ہیں، خفاجی نے شرح شفا (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملّا دوست محمدؐ کابلی نے تحفۃ الاخلاء فی عصمۃ الانبیاءؑ میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح ردّ کیا ہے۔ جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ہر شبہہ کا ذکر کرنا اور اُس کا ردّ کرنا ایک طولِ عمل ہے۔ مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں اُن کے دو اسباب ہیں اور اُن اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دُور کر دینا ہے۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیاء علیہم السّلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کسی قدر بلند ہو اور اُن کا دامن گناہ و عصیان کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو، تاہم اُس ذوالجلال والاکرام کے سامنے اُن کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق ہی کی ہے۔ ایک عبد و غلام خواہ کسی قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفا شعار اور مطیع و فرمانبردار ہو تاہم اپنے آقا کے سامنے اُس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگزاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے، وہ خدا کی عظمت و جلال اور اُس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ○	اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔

(الشعرآء : ۸۲)

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت اُس کا نقص نہیں بلکہ اُس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے۔ اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اُس کے غلام اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رُتبہ تک بھی پہنچے ہیں وہ اُن سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رُتبہ کا مطالبہ کرے

کہ اُس کے دربار میں اُن کے عروج و ترقّی کی کُرسی اور بھی اُونچی ہوتی جائے۔ بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گزشتہ رتبۂ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے تاکہ وہ اُس کے مزید تقرّب کا ذریعہ بن سکے۔ آنحضرتؐ کو خطاب ہوتا ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝	جب اللہ کی مدد آچکی، اور (مکّہ) فتح ہو چکا اور
وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ	لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ
دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ	چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اُس سے
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ	معافی چاہ کہ وہ بندے کے حال پر رجوع ہونے
كَانَ تَوَّابًا ۝	والا ہے۔

(النصر : ۱-۳)

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکّہ فتح ہونا، بُت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جُرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے۔ اِسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝	ہم نے تجھ کو کُھلی فتح دی تاکہ اللہ تیری اگلی
لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ	پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ
ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ	پر پُورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے۔ اور
عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝	تجھ کو مضبُوط مدد دے۔
وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝	

(الفتح : ۱-۳)

دوبارہ غور کرو کہ مکّہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضورؐ کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلّق ہے کہ

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حُسنِ خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیتِ کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہلِ عرب قائل تھے اور اُن کو خدا کا درجہ دیتے تھے۔ اُن کے متعلق قرآن نے کہا:

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝

(النسآء : ۱۷۲)

مسیح کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرّب فرشتوں کو۔ اور جو اُس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی توہین نہیں بلکہ اُن کی عبدیّت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیاء علیہم السّلام کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف اُن کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اُن کی عبدیّتِ کاملہ کا اظہار ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اُس کی گنہگاری کا اعلان نہیں بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبولِ تام کی بشارت ہے۔ سُورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گذریں اُن کو پڑھو تو ظاہر ہو گا کہ چونکہ بُت پرستی کی آلایش سے مکّہ کی تطہیر اور کُل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز، مکّہ کی فیصلہ کُن فتح پر موقوف تھی اس لئے جب پیغمبر علیہ السّلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جانفروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ

آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلۂ احسانات کی تکمیل ہوئی۔ پھر خدا آپؐ سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے۔ حالانکہ اُن میں سے ہر چیز آپؐ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی۔ کیا فتح مکّہ سے پہلے آپؐ صراطِ مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے؟ یا آپؐ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی؟ یہ سب مرتبے حاصل تھے مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرمائے اور رسولؐ کی اگلی پچھلی تمام فروگذاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ عفو پھیرنے کا اعلان کر کے اُن کو نئی خلعتِ فاخرہ عطا اور نئے مراتبِ جلیلہ عنایت کرے۔

عبدیّتِ کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ میں نمایاں ہے۔ ایک سردار اُن کو "اَے نیک اُستاد" کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

"تُو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔" (لوقا ۱۸-۱۹)

حضرت مسیح علیہ السّلام کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے کس قدر غلط ہوگا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا اپنی مشہور دُعا میں یہ کہنا کہ

"اور جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو بخشتے ہیں تو اپنے دَین ہم کو بخش دے۔" (متی ۶-۱۲)

اُن کی گنہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیّتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ۔ ان میں سے ذنب کے سوا دُوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بُوجھ کر کیا جائے۔ لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بُوجھ کر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر۔ بھول چوک سے ہو یا قصداً۔ اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام اُمّت کے لئے گناہ نہیں لیکن انبیاءؑ کے حق میں اتنی غفلت بھی مؤاخذہ کے قابل ہے۔

اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیات المقربین (نیکوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں)۔ ع

جن کے رُتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

انبیاء علیہم السّلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جرم، اثم یا حِنث کا نہیں۔

ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل ہے[1]۔ اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفارِ ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگذاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم اور لُطف و عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابلِ مواخذہ نہیں مگر انبیاء علیہم السّلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں۔ کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے، اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو

---

[1] اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فروق پر کتابیں لکھی ہیں انھوں نے اس کی تصریح کی ہے۔ ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس و ادیب الاب ہنری کوس لامنس کی کتاب فرائد اللغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں:۔

"الاثم الذنب الذی یستحق العقوبۃ علیہ ولا یوصف بہ الا المجرم وبین الاثم والذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمداً کان او سہواً بخلاف الاثم فانہ مایستحق فاعلہ العقاب فیختص بما یکون عمداً۔ والحنث ابلغ من الذنب لان الذنب یطلق علی الصغیرۃ والحنث علی الکبیرۃ۔ والجرم لا یطلق الا علی الذنب الغلیظ"

جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہہ کی جاتی ہے اور اُن کو ہشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سُنا دی جاتی ہے۔ اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے اُن کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ (البقرۃ : ۳۷)

تو آدمؑ نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ (طٰہٰ : ۱۲۲)

پھر خدا نے اس (آدمؑ) کو برگزیدہ کیا پھر اس کی طرف رجوع ہُوا۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ (التوبۃ : ۱۱۷)

یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہُوا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ (الانبیآء : ۸۸)

پھر ہم نے اس (یونسؑ) کی دعا قبول کی اور اُس کو غم سے رہائی دی۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح : ۲)

تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی فروگذاشت معاف کرے۔

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبہ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیاءؑ کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

۲۔ انبیاءؑ کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دُوسرا سبب یہ ہے کہ انبیاءؑ کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ علم اور جہل،

ضلالت اور ہدایت اضافی الفاظ میں سے ہیں۔ علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیاءؑ کی قبل از نبوّت اور بعد از نبوّت زندگیوں میں قوّت اور فعلیّت کا فرق ہے جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اُس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اُس میں تنا، شاخیں پتّے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اُس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے۔ اُس کے پتّے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشامِ جاں کو معطّر کرتے ہیں۔ اس کے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں۔ اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں۔ اسی طرح نبوّت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بناء پر اس کی قبل از نبوّت زندگی ظہورِ نبوّت کے بغیر تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے اسی طرح انبیاءؑ کی زندگی ان کی نظر میں نبوّت کے بغیر ضلالت اور نبوّت کے بعد ہدایت ہوتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ ظہورِ نبوّت سے پہلے کا زمانہ اُن کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ اُن کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے۔ لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاء کے حق میں مستعمل ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرتؐ پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰى ۝ وَ	کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا پھر پناہ دی اور
وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ	اُس نے تجھ کو بھولا پایا تو رہنمائی کی اور تجھ کو
عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝	محتاج پایا تو بے نیاز کیا۔

(الضّحیٰ: ۶-۸)

سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوّت اور ضلالت سے قبلِ نبوّت کی زندگی مراد ہے جو نبوّت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتہً ضلالت ہی ہے۔

"ضلالت" کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں بلکہ نادانستہ بھولنے، بہکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں۔ عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (البقرۃ: ۲۸۲)

بھول جاوے ایک عورت تو یاد دلاوے اُس کو دوسری۔

ایک اور آیت میں علمِ الٰہی کی تعریف میں ہے:

لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ (طٰہٰ: ۵۲)

نہ چُوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔

اِن آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ "ضلال" کے معنی عربی زبان اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں بلکہ بھول چُوک کے بھی ہیں۔ اِسی طرح اُس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی کو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایتِ الٰہی کا نور اُس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آئی ہے، جہل کی برائی تو معلوم ہو گئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبلِ نبوّت کی کیفیت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مر گیا تھا۔ نبوّت پاکر جب وہ لوٹے تو فرعون نے اُن کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ (الشعراء: ۲۰)

مَیں نے اس حالت میں کیا تھا کہ مَیں چوکنے والوں میں سے تھا۔

اس چُوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اُس وقت مَیں نبوّت کی عزّت سے سرفراز

نہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی۔ نہ بت کو پوجا تھا نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا نہ کوئی اور شرک کیا تھا کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مر جانا مارنے والے کا کوئی بالقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے کو اس وقت ضالّ کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے۔ اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے، جسے یہاں "ضلالت" کہا گیا ہے، دوسری جگہ اس کو غفلت (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں آپؐ کو خطاب ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ	ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں کیونکہ ہم نے تیری
الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ	طرف یہ قرآن اتارا۔ اگرچہ اس قرآن کی وحی سے
هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۚ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ	پہلے تو بے خبروں میں تھا۔
قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝	

(یوسف: ۳)

اس "بے خبری" کے عالم کی تصویر دوسری آیت میں ہے جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرما دیا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ	اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے
اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ	ایک روح تیری طرف وحی کی۔ تو نہیں جانتا تھا
وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا	کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان۔ لیکن ہم نے اس
نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ	کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے
وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝	بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں۔ اور بیشک
	تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

(الشوریٰ: ۵۲)

"کتاب و ایمان" کے نور و ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت و حالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا۔ اس سے مقصود حقیقی گنہگاری، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے بلکہ طلبِ حق، تلاشِ معرفت اور انتظارِ حقیقت ہے کہ وہی اُن کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے۔ آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، رُوحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دُوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے۔ یہ ہدایت کا دَور ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر انبیاءؑ کے نبوّت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا	اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور یعقوبؑ بخشے اور
هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ	اُن میں ہر ایک کو ہدایت دی اور اُن سے پہلے
(الانعام، ۸۴)	نوحؑ کو ہدایت دی۔

اس ہدایت دینے سے اگر نبوّت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدمِ نبوّت کا عہد "ضلالت" ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد وہ حالت ہوگی جس میں اُن کو ہنوز نبوّت نہیں ملی تھی اور اس مرتبۂ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاءؑ کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری، عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدمِ نبوّت کا دَور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوّت و رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتہً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریّت | نبی کی معصومیّت اور اُس کی دُوسری مقدّس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق، خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے۔ وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپؐ کے فیضِ تعلیم سے وہ روشن ہوئی۔

اِسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہلِ مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے۔ وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے۔ وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم پیغمبر سمجھے جاتے تھے۔ دُوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیّت سے پاک، خود خدا یا خدا کا جز یا ناسوت و لاہوت کا ایک مجمُوعہ سمجھتے تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنمایوں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسّم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اِسلام نے اپنی تعلیم اِن دونوں کے وسط میں پیش کی۔ وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوقِ محض صرف انسان اور پُورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ اُن کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرتوں سے فیض پاکر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اُس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے۔ اور بے اعتدالی کے اُن دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، اِعلانیہ تردید کرتا ہے۔ اہلِ عرب بھی ہندوؤں، یُونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیئے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے۔ قرآن نے اُن کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ کو اُن کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ اور انسانوں میں فرشتہ آتا بھی تو انسانیّت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اُس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بشریّت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ دُوسری طرف وہ اپنی رُوحانیّت، بے گناہی، پاک دامنی اور اختصاصِ نبوّت میں

انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن کی نظر اُن کے انسانی رُخ پر پڑتی ہے، وہ اُن کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں۔ اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر اُن کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ اُن میں اُلوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ وہ اپنے بشری اَوصاف کے لحاظ سے بلاشبہہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بناء پر فوق البشر ہوتے ہیں۔ یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفّار کو ہوتا تھا۔ پیغمبر اُن کے سامنے جب اپنی نبوّت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے تو وہ اُن کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو۔ تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو۔ چنانچہ کفّار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ — کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔

(بنی اسرآئیل، ۹۴)

وہ بشریّت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کے جواب میں فرمایا:

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ — مَیں تو نہیں ہُوں مگر انسان رسول۔

(بنی اسرآئیل، ۹۳)

اُن کو شبہہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کر سکتا ہے:

اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا — کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے۔

(التغابن: ۶)

یہ وہی شبہہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی انسانیّت سے منکر ہُوئے کہ موروثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دے سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھے کہ انسان موروثی گنہگار نہیں

بلکہ وہ گنہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی۔ بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں۔ یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی اور انبیاء کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر اُن کو نبوّت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے :

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ط — تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔

(ابراھیم : ۱۰)

دُوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ج — نہیں ہے یہ لیکن تمھاری ہی طرح بشر۔

(انبیآء ۳۰)

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ — نہیں ہے یہ لیکن تمھاری ہی طرح بشر۔

(المومنون : ۲۴)

انبیاء کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے :

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ج — تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

(الشعراء : ۱۵۴)

مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا — تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

(یٰس : ۱۵)

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے :

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا — ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔

(ھود : ۲۷)

انبیاءؑ نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمھاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز

ہیں۔ اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے۔ فرمایا:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ	اُن کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمھاری ہی طرح
إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ	بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر
عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ	چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔

(ابراھیم : ۱۱)

اِن کفّار کی نظر صرف اُن کے ایک رُخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی۔ انبیاءؑ نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دُوسرے رُخ کو بھی پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوّت سے سرفراز اور اُس کی خصوصیّتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحیِ الٰہی نے آپؐ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ "کہہ دو کہ میں تو تمھاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں"۔ اِس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا جو انبیاءؑ کی شانِ اُلوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اُس نبی کی اُمّت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دُنیا میں خدا کی توحیدِ کامل کا مبلّغ بن کر آیا تھا۔

دُوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے۔ اِلّا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں۔ گویا اُس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصبِ نبوّت کا امتیاز پاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اُس کے پہلے اور اُس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا۔ اس کے علاوہ آپؐ کے

تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے نہ اسلام کا جزء ہے۔ یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطیانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت اِن کے بیچ میں ہے۔

قرآنِ پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرتؐ کی بشریت کا اعلان ہے۔ مگر ہر جگہ توحیدِ کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح ہیں اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیئے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوا لیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کرا دیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اُن کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں اُن مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں:

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا	کیا وہ جنھوں نے کفر کیا یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے
عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ	بندوں (رسولوں اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا
اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ○	حمایتی بنا لیں گے۔ ہم نے ان کافروں کے لئے
(الکھف : ۱۰۲)	جہنم تیار کی ہے۔

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے۔ یہ رکوع کا شروع ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے۔ پھر ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى	کہہ دے کہ میں تو تمھاری طرح ایک بشر ہوں۔
اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ	مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود
(الکھف : ۱۱۰)	ہے۔

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حٰمٓ السجدہ (فصلت) میں ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۙ

کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ اُس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو۔ خرابی ہے شرک کرنے والوں کیلئے۔

(حٰمٓ السجدۃ: ۷)

اس آیت کا بھی منشا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا کے دُوسرے بندے۔ دُعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اُسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہیئے۔ یہ اختیاراتِ خاص خدا کے بندوں کے نہیں۔ اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفّارہ اور اُن کے اِس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے اختیار میں ہوگا اور مُسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے۔ چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرتؐ سے کفّار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، جہاں نہریں نہیں وہاں نہریں جاری کر دو، ہمارے سُنسان جنگلوں کو باغ و بہار بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اُترو:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ

اور انھوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے جب تک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسے تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو

كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ
تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝
اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ
اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ
لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا
نَّقْرَؤُهٗ ؕ

ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لئے سونے کا ایک
گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں
تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین
نہ آئے گا جبتک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پر
اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔

(بنی اسرائیل: ۹۰-۹۳)

یہ امور مشکل و محال نہ تھے۔ لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازیگرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہِ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں۔ اس لئے آپؐ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپؐ فرمائیں:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا
بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ
اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى
اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا
رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ
مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا
رَّسُوْلًا ۝

کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر
ہوں رسول۔ اور لوگوں کو جب اُن کے پاس
ہدایت آئی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا مگر
اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر
بھیجا ہے۔ کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے
تو ہم آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر اُن پر
اتارتے۔

(بنی اسرائیل: ۹۲-۹۵)

آنحضرتؐ سے بحکمِ خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور اُن کی حیرت انگیزی کو انھوں نے تسلیم بھی کیا۔ پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا:

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○

یہ تو تمھاری ہی طرح بشر ہے۔ کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔

(الانبیآء : ۳)

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا مگر پھر بھی اُن کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی۔ اُن سے کہا گیا کہ نبوّت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ اُن کو معلوم ہیں جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں یعنی یہود اُن سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے آئے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو ہم وحی کرتے تھے۔ جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔

(الانبیآء : ۷)

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ (یوسف : ۱۰۹)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے۔ ہم اُن پر وحی کرتے تھے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کر دو جو اُن کی طرف اتارا گیا اور تاکہ وہ سوچیں۔

(النحل : ۴۳-۴۴)

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور مخلوقیت سے ہے۔ ورنہ اخلاقی، رُوحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے۔ نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علانیہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں۔ حالانکہ ان میں علم و جہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں "وحی" کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں

خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا۔ وحی و رسالت کو چھوڑ دو۔ دوسرے انسانی کمالات کو مثالاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں اُن سب کے اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے۔ اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رُستم انسان نہ تھا۔ علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں۔ لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں۔ اور بایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں وہ ایسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں جیسے دُوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان۔ یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرامؑ کی بھی ہے کہ وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں اُن سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی اُن سے ممتاز ہیں۔ آنحضرتؐ کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہؓ بھی آپؐ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا متصل روزہ رکھتے ہیں تو آپؐ اُن کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں، انکم مثلی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی[1] (تم میں کون میرے مثل ہے۔ میں رات گزارتا ہوں تو میرا ربّ مجھے کھلاتا پلاتا ہے)۔ کیا تم انسانوں کو بھی یہ رُوحانی غذا اور رُوحانی سیرابی میسر آتی ہے۔ اور وحی کے علاوہ بعض دُوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے۔

---

[1] صحیح [illegible]

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ آپؐ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔ وکذٰلك الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم[1] (اور اسی طرح سب انبیاءؑ ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر اُن کے دِل نہیں سوتے) کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرتؐ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ "میں تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے"۔ کیا عام انسانوں کی قوتِ بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے؟ قرآن پاک میں ہے، اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى[2] (کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اُس میں اس سے جھگڑتے ہو)، وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ[3] (اور اُس نے اُس (فرشتہ) کو آسمان کے کناروں میں دیکھا)۔ کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں؟ آنحضرتؐ کے انتساب سے امہات المؤمنینؓ کو جو شرف حاصل ہوا اُس کا اقتضا یہ ہُوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المؤمنینؓ کو خطاب کرکے فرمایا، يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ[4] (اے پیغمبرؐ کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو)۔ تو اگر پیغمبرؐ کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کے مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ کاحد من الرجال نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اُس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے۔ اسی لئے کسی انسان کو صاحبِ وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

---

[1] صحیح بخاری، باب الاسراء۔ [2] النجم: ۱۲۔ [3] التکویر: ۲۳۔ [4] الاحزاب: ۳۲۔

اجتہادِ نبویؐ میں خطا شبہہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں بعض جگہ آنحضرتؐ کو آپؐ کی چند فروگذاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحیِ الٰہی کے علاوہ آپؐ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپؐ پر وحیٔ قرآن نازل نہیں ہوتی تھی، اُن میں آپؐ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہمِ نبویؐ سے فیصلہ فرماتے تھے۔ لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپؐ کو آپؐ کے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپؐ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے۔ مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہادِ نبویؐ کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی۔ مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں اور اس سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبویؐ میں غلطی ہو جانا ممکن ہے۔ مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں۔ اِدھر لغزش ہوئی اور اُدھر علّام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دُوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپؐ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا یا اُن پر عمل کیا اور وحیِ الٰہی نے اُن پر خاموشی برتی تو منشائے الٰہی نے گویا اُن کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مُہر کر دی اور اُن کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرتؐ کی نبوّت کی عمر تئیس سال ہے۔ اِن پُورے تئیس سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپؐ نے اپنے اجتہاد اور شرحِ صدر سے فیصلے صادر کئے۔ مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحیٔ الٰہی نے تنبیہ کی۔ اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکمِ دینی، شریعتِ ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات سے ہو بلکہ وہ کُل کے کُل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے۔ اِس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور

شریعت میں آپؐ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا، و غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر اُن کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا اُن کا علم اُن کو قطعی طور سے نہیں ہوتا یا استقراء تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علّتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبویؐ میں منتفی ہیں۔ کیونکہ اجتہادِ نبویؐ نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا ہے نہ وہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقراء و تمثیل کے منطقی اور اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے۔ بلکہ وہ نورِ رسالت، فہمِ نبوّت، حکمتِ ربّانی اور شرحِ صدر پر مبنی اور قائم ہوتا ہے جن میں یہ بیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے لفظ "اجتہاد" جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیشِ نظر رہے۔ آنحضرتؐ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپؐ نے جو پہلو اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپؐ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اِس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں اُن پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپؐ نے اختیار فرمایا اُس کا منشا ہمیشہ امّت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ اُن احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے:۔

پانچ اجتہادی امور پر وحی الٰہی جن اجتہادی امور پر وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی ہے، اُن میں :-

پہلا واقعہ پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرتؐ اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپؐ کی مجلس میں آکر بیٹھے۔ آپؐ اُن کو سمجھا بجھا رہے تھے۔ بُت پرستی کی بُرائیاں اور توحید کی خوبیاں اُن پر ظاہر فرما رہے تھے اور دِل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرلیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہ بن اُمِّ مکتومؓ بھی آکر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا۔ قریش کے یہ رؤسا بیحد مغرور اور خود پسند تھے۔ وہ آپؐ کے جلسوں میں آنا صِرف اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ آپؐ کی مجلس میں بدحال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہیں۔ اِس لئے اِس موقع پر جب آنحضرتؐ کو اِن رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آرہے تھے عبداللہ ابنِ مکتومؓ کا آنا جانا اور پوچھنا ناگوار ہُوا کہ اُن کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا اور راستہ سے بِدک گئے۔

عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتومؓ کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اس لئے تھی کہ آپؐ جانتے تھے کہ عبداللہ بن اُمِّ مکتومؓ تو مسلمان ہی ہیں۔ اس وقت اُن کی بات کا جواب دینے میں چنداں ہرج نہیں۔ لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پُورے باشندگانِ مکہ پر اثر انداز ہوگی۔ اگر یہ مسلمان ہوگئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی۔ یہ سمجھ کر آنحضرتؐ عبداللہ بن اُمِّ مکتومؓ کی طرف سے بے التفات ہوکر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سرتاپا متوجہ رہے۔ اس پر وحیٔ الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی :-

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ	تیوری چڑھائی اور مُنہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور
الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ	تجھے کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا۔ یا سوچتا تو تیرا سمجھانا
يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ	کام آتا۔ وہ جو پرواہ نہیں کرتا سو تُو اس کی فکر

الذِّكْرٰى ۝ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝
فَأَنْتَ لَهُ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ
أَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ
يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَأَنْتَ
عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝
فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ ۝

(عبس : ۱-۱۲)

میں ہے۔ اور اُس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی الزام
نہیں۔ اور جو تیرے پاس دوڑا آیا اور (خدا سے)
ڈرتا ہے تُو اُس سے تغافل کرتا ہے۔ یُوں نہیں
یہ تو نصیحت ہے۔ جو چاہے اُس کو یاد کرے۔

اِن آیتوں میں آنحضرتؐ کے اس اجتہاد پر کہ ایک پُرانے لیکن غریب مُسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی۔ اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس کے نزدیک امیر و غریب، آقا اور غلام، اُونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں۔ اُس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں۔ یہ نکتہ تو اُس وقت کے فیصلے میں آپؐ کے پیشِ نظر رہا کہ ایک مُسلمان اندھے کی دلجوئی سے ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے، مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرزِ عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا۔ اس لئے وحیِ الٰہی نے یہ تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صلائے عام ہے۔ جو چاہے قبول کرے۔ اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ روسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپؐ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔ اس لئے اُن کی طرف مزید توجہ بے سود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آپؐ اُن کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے۔ اس لئے آپؐ اپنے موجود علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ | دُوسرا واقعہ سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مالِ غنیمت حاصل کرنے اور بدر کے

قیدیوں سے زرِ فدیہ قبول کرنے کا ہے۔ اس وقت تک ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔ مسلمانوں کو مدینہ منوّرہ آکر سب سے پہلے سریۂ نخلہ میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مالِ غنیمت ملا اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت منداور شرفا تھے۔ ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں۔ بعضے اُن کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے۔ کچھ لوگ فدیہ لے کر اُن کو چھوڑ دینا چاہتے تھے جس سے اُن کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے۔ نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدّت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے وہ بیکسی، مظلومیّت، مغلوبیّت اور غربت کے دَور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اُس کو ملکی اور مالی قوّت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اُس کی زندگی میں اخلاقی حیثیّت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ، قوّت اور دولت پاکر بھی اُس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے، یہ بڑا ہی مشکل کام ہے۔ جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت ردِّ عمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے، یہ کوئی آسان کام نہیں۔ سیاسی و مذہبی تاریخوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ ایسا نہ ہو سکا۔ خود عیسائی قوم کو دیکھئے جس نے یہودیوں اور بت پرست رُومیوں کے ہاتھوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتہً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے تو عیسائی قوم کا پچھلا جوہر ایک ایک کر رُخصت ہو گیا اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے انتقام کے نشہ میں چُور ہو کر یہودیوں اور رُومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاقِ انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوۂ بدر کی غیر متوقّع فتح نے مظلوم و بیکس مسلمانوں کے لئے تاریخی دَور کا وہی نازک موقع پیدا

کر دیا۔ غریب و تنگدست مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسبِ معاش سے محروم اور معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، اُن کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے اُن کے بدن زخمی اور اُن کے سینے داغدار تھے، وہ دفعتہً مغلوب ہو گئے۔ اُن کے بڑے بڑے سردار اُن کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے اور اُن کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستّر سردار صرف اُن کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی، یک جہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفریق اور حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ اس اتفاقی دولت اور غیر متوقّع فتح و غلبہ نے صحابہ کرامؓ کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوّتِ رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا۔ چنانچہ اس وقت مالِ غنیمت، زرِ فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلافِ رائے رونما ہو گیا۔ آنحضرتؐ کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا۔ آپؐ نے امرِ اوّل کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوّت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اِن قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپؐ نے ردّ فرما دی اور حضرت ابوبکر صدّیقؓ کی تجویز کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی۔ اور اُن سے فرمایا کہ "اے ابوبکرؓ! تمھاری مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی ہے اور اے عمرؓ! تمھاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے"[1]۔ آپؐ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے اُن قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زرِ فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جو اُن میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچّوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے پر آزادی کا فرمان عطا کر دیا اور

---

[1] مستدرک حاکم، جلد سوم۔ کتاب المغازی۔

صحابہ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں۔ چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے۔

لیکن وحیٔ الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبوں کا دفعتہً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا۔ چنانچہ یہی صورت پیش آئی۔ مالِ غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے۔ لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی حقدار ہم ہیں۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا اس لئے ہم کو ملنا چاہیئے[1] یہی اختلاف زرِ فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(اے پیغمبر) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں۔ تو کہہ دے کہ مالِ غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے۔ تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔

(الانفال : ۱)

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے تو کہا:

فينا اصحاب بدر نزلت حين اختلفنا فى النفل وساءت فيه

یہ سورۃ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مالِ غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس

---

[1] سیرت ابن ہشام، ذکر الفئ ببدر والاساری۔ جلد اوّل۔

اخلاقنا فزعه الله من ایدینا فجعله الله الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقسمه رسول الله صلی الله علیه وسلم بین المسلمین عن سوأ[1]

میں ہمارے اخلاق برے ہوگئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دے دیا تو آپؐ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر برابر تقسیم فرما دیا۔

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحیٔ الٰہی نے آنحضرتؐ کے اس فیصلہ[2] پر کی اور آیت اتری:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۡ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اُس کے پاس قیدی ہوں تاکہ زمین میں فساد کریں۔ تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے۔ اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی۔ تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا حلال و پاک کر کے کھاؤ۔ اور اللہ کا ادب کرو۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

(الانفال: ۶۷ – ۶۹)

اسی قدر نہیں بلکہ اُن قیدیوں کو جن سے زرِ فدیہ وصول ہوا یا وصول کیا جا رہا تھا اس کے بعد

---

[1] السیرۃ الحلبیہ (انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون) ج ۲، ص ۱۸۔ [2] سیرت ابن ہشام، جلد اوّل۔

ہی یہ تسلی دی گئی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم	اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں ان سے
مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي	کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی جانے گا
قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا	تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا جو تم سے لی گئی اور
أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ	تم کو معاف کرے گا۔ اور اللہ معاف کرنے والا
غَفُورٌ رَّحِيمٌ (الانفال: ۷۰)	اور رحم کرنے والا ہے۔

بعضوں کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے زرِ فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کئے جانے پر ہوئی[۱] حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرِ فدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے اُن سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حُسنِ نیت سے ظاہر کریں تو اُن کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو ان سے بطور فدیہ لیا گیا، ان کو بہتر دولت دیئے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زرِ فدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؛ اور جن سے فدیہ لیا گیا اُن کے قتل کئے جانے پر اُن کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش، اور ان مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی؛

بہر حال وہی مالِ غنیمت اور زرِ فدیہ جس کو اس وقت آنحضرتؐ نے صاف و صریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرمالیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی، وہ آخر کار اجتہادِ نبویؐ کے مطابق مناسب موقع پر جائز اور حلال و طیب ہی ٹھہرایا گیا اور غلطی غلطی باقی نہیں رہی۔ مالِ غنیمت لینے کے متعلق كُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ[۲] کا حکم اسی وقت آگیا، اور فدیہ لینے کی اجازت إِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً[۳] کے الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آگئی۔ اور اس مال و دولت کی حرص و طمع سے اس وقت جو بد اخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا۔ اس میں تمام

---

[۱] مزید تفصیل کے لیے دیکھو سیرۃ النبی جلد اوّل میں غزوۂ بدر کا بیان [۲] الانفال: ۶۹۔ [۳] محمد: ۴۔

مغفرت قبول نہ ہوگی اور فرمادیا گیا تھا کہ

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط	تُو اُن کی مغفرت کی دُعا مانگے یا نہ مانگے۔ اگر ستّر
اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً	دفعہ بھی اُن کی مغفرت کی دُعا مانگے تو ہرگز اُن
فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ	کو خدا نہ بخشے گا۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے خدا کا
كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ط	اور اُس کے رسولؐ کا انکار کیا۔

(التوبۃ: ۸۰)

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی سلول کا انتقال ہُوا۔ یہ منافقوں کا سردار تھا۔ اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا اُس نے آکر آپؐ سے نمازِ جنازہ پڑھانے کی درخواست کی۔ جس کو آپؐ فرطِ کرم سے ردّ نہ فرما سکے۔ حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی کہ "یارسول اللہؐ! اِس کے عدمِ مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے"۔ فرمایا "مَیں ستّر دفعہ سے بھی زیادہ اِس کی مغفرت کی دُعا مانگوں گا"۔ بہرحال آیتِ بالا میں گو آپؐ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بیکار و بے سُود بتایا گیا تھا مگر اُن کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی۔ اس لئے آنحضرتؐ نے غایتِ شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا تاکہ اُس کے مخلص مسلمان فرزند کی دِل شکنی نہ ہو اور اس سے تغافل فرمایا کہ ایک مخلص کی دل جوئی تو ہوگی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھُپانے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے۔ اس لئے حکم ہوا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ	اور نہ کبھی اُن میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ
اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ط اِنَّهُمْ	اور نہ اُس کی قبر پر کھڑا ہو۔ بیشک انھوں نے
كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا	خدا اور اُس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گنہگاری
وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ (التوبہ: ۸۴)	کی حالت میں مرے۔

پانچواں واقعہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے کسی مباح چیز کو جو آپؐ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا یعنی اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا عہد فرما لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں۔ اُس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لئے اُس کے نہ کھانے کا عہد کر لے۔ اس لئے اگر آنحضرتؐ نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی، اُس کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو ظاہر ہے کہ آپؐ کا اپنی بعض بیویوں کی خاطرداری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپؐ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل و انصاف کے مناسب سمجھا۔ مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اُس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپؐ کی اقتداء میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے۔ اور یہ ایک طرح سے شریعتِ الٰہی میں تبدیلی و تحریف کا مرادف ہو جاتا۔ اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبر کو کسی کی دلجوئی اور خاطرداری کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

(التحریم: ۱)

اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے اُس کو حرام کیوں کرتا ہے۔ اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے۔ اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپؐ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپؐ ایسا کر سکتے تھے مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپؐ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے تھے جن میں آپؐ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی و معصومی کو پیشِ نظر رکھ کر

اس کو اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں۔ اور اسی وحیٔ الٰہی نے اُن میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی۔ اب کیا کسی کا شبہہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرتؐ کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحیٔ الٰہی نے کی ایسے ہی ممکن ہے کہ آپؐ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمتِ الٰہی نے پروا نہ کی اور خاموشی برتی۔ اگر کسی کو یہ شبہہ ہے تو درحقیقت رسالت و نبوّت کی مرتبہ شناسی اور دینِ الٰہی و شریعتِ ربّانی کی حقانیّت اور اللہ تعالیٰ کے طرقِ رُشد و ہدایت کی معرفت سے وہ کوسوں دُور ہے۔ رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسان کو اُن کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں نہ اس لئے کہ اُن کے ذریعہ اُلٹی ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ۔ اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام صادر ہو جو حکمتِ الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر اللہ اس کی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد و رائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہامِ الٰہی، القائے ربّانی، حکمتِ یزدانی، فہمِ رسالت، ملکۂ نبوّت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرمِ اسرارِ شریعت عمر فاروقؓ برسرِ منبر فرماتے ہیں:

یا یھا الناس ان الرای انما	اے لوگو! آنحضرتؐ کی رائے غلطی سے پاک تھی
کان من رسولہ صلی اللہ علیہ	کیونکہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو وہ رائے دکھاتا تھا اور
وسلم مصیبا لان اللہ کان	ہماری رائے ہمارا گمان اور از خود کہنا ہے۔
یریہ و انما ھو منا الظن و	
التکلف۔ (ابوداود کتاب الاقضیہ)	

وہ رائے نبویؐ جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے۔ اور اُس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحیِ الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلامِ ربّانی کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری تاکہ
لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ	لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے فیصلہ
اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ	کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف۔
خَصِيْمًا ۙ	

(النسآء، ۱۰۵)

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرتؐ کو جو دکھایا، سُجھایا اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی۔ یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

انّا اقضی بینکم برائی فیما	مَیں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی
لم ینزل علی	نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی اپنی رائے سے فیصلہ
(ابو داود کتاب الاقضیۃ)	کرتا ہوں۔

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دست گیری کرتی اور صحیح راستہ پر لے آتی جیسا کہ گذشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال | اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپؐ کو "اراءت الٰہی" ہوتی تھی یعنی خدا کی طرف سے آپؐ کو رائے سجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ اراءتِ الٰہی (خدا کی طرف سے سُجھایا جانا) تاکہ آپؐ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں، غلط نہیں ہو

سکتی۔ لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرتؐ نے اہلِ مقدمہ سے فرمایا:

"میں ایک بشر ہوں۔ تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو۔ اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں۔ تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔" (کتاب الاقضیہ)

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال کر سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے اس لئے اُمت آپؐ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں۔ لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد دُوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے۔ یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے علمِ غیب سے تعلق رکھتی ہے، جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلّم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ نہیں قرار پا سکتا۔ اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں۔ آنحضرتؐ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امرِ اوّل کے متعلق عموماً آپؐ کو غیب کا علم عطا نہیں ہُوا لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرتؐ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپؐ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح و صواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین و تحقیر ہے۔ اور اُس "آراتِ الٰہی" کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپؐ کو بخشا جاتا تھا۔ اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپؐ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت

کو سُن کر اُس کے صحیح یا غلط کے مطابق واقعہ یا مخالفِ واقعہ سمجھنے میں۔ لیکن جس کو آپؐ نے صحیح باور فرما لیا اُس کے مطابق مناسب و صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپؐ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی اور اُمت آپؐ کی پیروی آپؐ کے اِن قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاعِ مذکور کے گزشتہ واقعات اور گذشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں فشتّان بینھما۔

آنحضرتؐ کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا یا برسرِ باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپؐ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کرلے یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا لیکن جب عدالتِ نبویؐ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہو گئی اور غصبِ حق کے گناہ سے برأت ہو گئی، تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ گو قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا مگر عند اللہ جو برسرِ حق تھا وہ حق ہی رہے گا اور جو برسرِ باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا۔ اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا۔ اِسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرتؐ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے[1]

آنحضرتؐ رودادِ مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے صادر فرماتے تھے وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور اُن کی اطاعت سے انحراف، کفر و نفاق تھا۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	جب تک وہ تجھ کو حَکم نہ مانیں پھر اپنے دلوں
لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا	میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پاویں اور مان کر قبول
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○	کریں۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الاقضیہ۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ
اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا
اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ
اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ○

اور کسی ایماندار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ
جب اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا فیصلہ
کر دے تو بھی اسے اپنے کام کا اختیار رہے۔ اور
جو خدا اور اُس کے رسول کے بے حکم چلا وہ صریح
گمراہ ہوا۔

(الاحزاب : ۳۶)

کیا اُمت کو رسول کی اطاعت اور اُس کے فیصلوں کے بے چون وچرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم برسرِ باطل پہلو پر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپؐ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا:

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
مُّعْرِضُوْنَ ○ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ
الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ○
اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا
اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

اور جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف
بلائے جائیں تاکہ رسول اُن کے درمیان فیصلہ
کر دے تو اُن میں کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے۔
اور اگر اُن کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے
چلے آئیں۔ کیا اُن کے دلوں میں روگ ہے یا
وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اُس کا رسول اُن کے
ساتھ بے انصافی کرے گا۔ بلکہ وہی بے انصاف
ہیں۔

(النور : ۴۸ ـ ۵۰)

عقلِ بشری | اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور بلکہ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے

فرائض سے باہر کی چیزوں میں وہی عقل ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی و الہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرتؐ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں۔ فرمایا۔ "میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔" ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔" اس نے جا کر باغ والوں سے آپؐ کا یہ فقرہ بیان کر دیا۔ صحابہؓ نے جو سرتاپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ پھل اس سال کم آئے یا کم ٹھہرے۔ آپؐ کا پھر گزر ہوا تو ان لوگوں نے صورتِ حال عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا "میں نے تو یونہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا ہے تو کریں۔" پھر فرمایا:

اِنّما انا بشر اذا امرتکم بشیءٍ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیءٍ من رائی فانما انا بشر۔	میں تو ایک آدمی ہی ہوں۔ جب تمہارے دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

انتم اعلم بامر دنیاکم۔	تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو۔

تیسری روایت کے یہ الفاظ ہیں[1]:

انما ظننت ظنا فلا تؤخذونی	مَیں نے ایک گمان سا کیا تھا۔ گمان پر مجھ کو نہ
بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا	پکڑو۔ ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں
بہ فانی لن اکذب علی اللہ۔	تو اُس کو لو کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔

اِن تینوں روایتوں میں آپؐ نے اپنے اِس ارشاد کو ظن (گمان)، رائے اور امرِ دُنیا سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے یہ کلّیہ سمجھ میں آتا ہے کہ اُمورِ دین و شریعت میں آپؐ کا ہر حکم واجب اور منجانب اللہ ہے لیکن کھیتی باڑی، علاج و معالجہ وغیرہ خالص دُنیاوی امور میں اگر آپؐ نے کچھ کہا ہے تو اُس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ صحابہ کرامؓ جن باتوں میں اپنا مشورہ آپؐ کو دینا چاہتے تھے پوچھ لیتے تھے کہ یارسول اللہؐ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے۔ آپؐ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپؐ پسند فرماتے تو قبول فرماتے۔ غزوۂ بدر میں آپؐ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا۔ ایک صحابیؓ نے آکر عرض کی یارسول اللہؐ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے۔ فرمایا "محض رائے ہے"۔ تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں فلاں مقام بہتر ہے۔ آپؐ نے اُن کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا۔ اسی طرح صُلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہؓ سے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے۔ اور اسی میں خود حضورؐ کو وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ[2] (یعنی امورِ حکومت یا عام امور میں صحابہؓ سے مشورہ لے لو) کا حکم خدا کی طرف سے ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا۔ لیکن امورِ جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقلِ بشری سے نہیں بلکہ وحیٔ الٰہی یا فہمِ نبویؐ سے ہُوا تھا اُس میں آپؐ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ

---

[1] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعًا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معائش الدنیا علی سبیل الرای، جلد دوم۔ [2] آلِ عمران: ۱۵۹۔

کسی کے مشورے کو قبول فرمایا۔ صلح حدیبیہ کی شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحتِ الٰہی اور حکمتِ ربّانی پر مبنی تھے اُن کے بدلنے پر حضرت عمرؓ اور دُوسرے صحابہؓ نے کیا کیا زور نہیں لگایا مگر آنحضرتؐ نے کچھ التفات نہ فرمایا اور آخر مستقبل نے بتادیا کہ فہمِ نبوت سراسر صحیح تھا۔ اسی طرح غزوۂ اُحد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن اُبیّ کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا مگر مدینہ سے باہر جاکر صف آراء ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتادے گا کہ دُنیا میں ہر صاحبِ فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں۔ ایک اُس فن کے متعلق جس کی استعداد اُس کے اندر رکھی جاتی ہے، اور پھر تعلیم و تربیت، مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہوجاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کرلیتی ہے اور اُس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کردیتی ہے۔ لیکن اس دائرہ کے باہر اُس کی دُوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے۔ ایک شخص جو فنِ تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اُس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو۔ ایک فلسفی جو اپنے زورِ فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہو وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے زیادہ کم عقل ہو۔ یہ روزمرّہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں۔ اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو رُوحانیات کے اسرار، معرفتِ ربّانی کے حقائق، تزکیہ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ داں عقل رکھتا ہو، اس کو تعمیر و کاشت کاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اِسی طرح انبیاءؑ امورِ دین و شریعت میں وحی اور ملکۂ نبوّت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرّا اور پاک ہوتا ہے۔ لیکن دُوسرے امور مثلاً پہننے

اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت وسیاست، نظم ونسق، صلح وجنگ، سامان واسلحہ، مرکب وسواری، صنعت وحرفت، طب وعلاج وغیرہ دُنیاوی امور کی نسبت کلّی مصلحتیں بتاکر جزئیات کی تفصیل سے انھوں نے احتراز فرمایا اور کسی قطعی فیصلہ کا مُسلمانوں کو پابند نہیں کیا۔ پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں۔ پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرزِ لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے سترِ عورت نہ ہو۔ دُوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور ونخوت نمایاں ہو۔ کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں۔ نظم ونسق اور نظامِ حکومت وسلطنت میں چند کلّی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو۔ لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہلِ حلّ وعقد کا باہمی مشورہ ہو، وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدّن کی ترقّی کے ساتھ ساتھ تغیّر وانقلاب ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو ہمیشہ کے لئے محدُود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوّت یا عقلِ نبوّت کا شرعی ثبوت

گذشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی میں علم وفہم کے تین ذریعے ہیں۔ وحی، ملکۂ نبوّت اور عام عقلِ بشری۔ ان میں سے اوّل وآخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اوّل تو یہ مسلّمات سے ہیں اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں۔ لیکن اب تک ہم نے دُوسری چیز یعنی ملکۂ نبوّت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علماء نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے انھوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں۔ مگر مفہوم ومعنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں۔ سلف صالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الرّوع (دل میں ڈالنا)، نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیقِ ازلی اور قوتِ

تبیین سے تعبیر کیا ہے[1]۔ امام غزالی و امام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو "پیغمبرانہ قوتِ اجتہاد" کہا ہے۔ اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علمِ لدنی کہا جاتا ہے۔ مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح، اسرارِ شریعت کا بیان اور دقائقِ حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرامؑ کے اُن ربانی انعامات کی فہرست پڑھئے جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرستِ انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ "علم نبوت" ہے جس کو کہیں ذکر (یاد داشت)، کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ)، کہیں حکمت (دانائی)، کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا)، کہیں تفہیم (سمجھ بوجھ دینا)، کہیں تعلیم (سکھا دینا)، کہیں اراءت (دکھا دینا۔ سُجھا دینا) کہا گیا ہے۔ ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے اوپر اور عقلِ نبوی کے سوا اور کیا ہے۔ ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقلِ بشری اس لئے نہیں کہ عقلِ بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے۔ اس بنا پر اس سے مراد عقلِ نبوی اور حکمتِ نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت انبیاءؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں اُن میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآنِ پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے۔ آلِ ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے اُن کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

۱۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ	تو بے شبہ ہم نے ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب
وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝	اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت

---

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

(النسآء : ۵۴)

بخشی۔

حضرت لقمان علیہ السّلام کی نسبت ہے:

۲۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ

اور یقیناً ہم نے لقمانؑ کو حکمت دی۔

(لقمٰن : ۱۲)

حضرت داؤد علیہ السّلام کی شان میں ہے:

۳۔ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ○

اور ہم نے داؤدؑ کی سلطنت مضبوط کی اور اُس کو حکمت اور قولِ فیصل عطا کیا۔

(ص : ۲۰)

۴۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ

اور داؤدؑ نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤدؑ کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے اُس میں سے کچھ سکھایا۔

(البقرۃ : ۲۵۱)

حضرت عیسٰی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

۵۔ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ

مَیں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں اُن میں سے کھول دُوں۔

(الزخرف : ۶۳)

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسٰی علیہ السّلام پر اپنا احسان جتاتا ہے تو فرماتا ہے:

۶۔ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (المائدۃ : ۱۱۱)

اور (یاد کر) جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔

عام انبیاء کے متعلق ہے:

۷۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ

اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور کوئی حکمت دوں۔

(اٰل عمرٰن: ۸۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرتؐ کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی:

۸۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

(البقرۃ: ۱۲۹)

اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ دعا قبول فرمائی:

۹۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۵۱)

جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے۔ اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرتؐ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران میں ہم پر جتایا ہے:

۱۰۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان

اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

میں اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اُس کی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے اور اُن کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کُھلی گمراہی میں تھے۔

(اٰل عمران : ۱۶۴)

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان انہی الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دُہرایا ہے:

۱۱۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ○

وہی اللہ جس نے اَن پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اُس کی آیتیں سُناتا ہے اور اُن کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کُھلی گمراہی میں تھے۔

(الجمعۃ : ۲)

خود آنحضرتؐ کو خطاب کرکے اپنا یہ احسان اُن پر ظاہر فرمایا ہے:

۱۲۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

اور اگر خدا کا فضل وکرم تجھ پر نہ ہوتا تو اُن میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے۔ اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت

وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ○

اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تُو نہیں جانتا تھا۔ اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

(النسآء : ۱۱۳)

آنحضرتؐ سے خطاب ہے:

۱۳۔ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط

یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔

(بنی اسرائیل : ۳۹)

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

۱۴۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ط

اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اُس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے اُن کو یاد کرو، خدا تم کو اس سے سمجھاتا ہے۔

(البقرۃ : ۲۳۱)

خاص طور پر ازواجِ مطہراتؓ کو خطاب کیا ہے:

۱۵۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ط

اور تمھارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں اُن کو یاد رکھو۔

(الاحزاب : ۳۴)

یہ نعمت حسبِ استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے:

۱۶۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ج وَمَنْ

اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے۔

يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ط

اور جس کو حکمت بخشی گئی اُس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔

(البقرۃ : ۲۶۹)

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے :

۱۷۔ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط

اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف تُو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بُلا۔ اور اُن سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر۔

(النحل : ۱۲۵)

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے :

۱۸۔ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّنَ الْأَنبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝

اور اُن کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہو سکتی ہے، پہنچ چکے ہیں، مؤثر حکمت۔ تو اُن کو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

(القمر : ۴-۵)

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئی ہیں جن میں "حکمت" کا لفظ آیا ہے۔ اُن میں کہیں "حکمت" کا لفظ تنہا آیا ہے اور کہیں "کتاب" کے بعد آیا ہے۔ "کتاب" کے دو معنی قرآن میں ہیں۔ ایک "صحیفۂ ربانی" اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نوشتۂ الٰہی اور علمِ الٰہی۔ جیسے لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ [1] (اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا)۔ مذکورۂ بالا آیتوں میں تو کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفۂ ربانی یا یوں کہو کہ "وحی کتابی" مراد ہے جیسے تورات و قرآن وغیرہ۔ لیکن

---

[1] الانفال : ۶۸۔

"حکمت" کا مفہوم اِن آیتوں میں کیا ہے؛

حکمت کے لغوی معنی "دانائی کی بات اور کام" کے ہیں۔ مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے؛ اس تحقیق کے لئے ضرورت ہے کہ مستند اہلِ لغت اور ماہرینِ قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے۔ سب سے قدیم لُغت نویس ابن درید المتوفّٰی ۳۲۱ھ اپنی کتاب "جمہرۃ اللّغۃ" میں حکمت کے حسبِ ذیل معنی لکھتا ہے:-

فَكُلُّ كَلِمَةٍ وَعظتك اوزجرتك	ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے
اودعتك الى مكرمة اونهتك	یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بُری
من قبيح فهى حكمة وحكم۔	چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللّغۃ میں لکھتا ہے:

الحكمة من العلم والحكيم	حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا
العالم وصاحب الحكمة و	اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا۔
الحكيم المتقن للامور۔	

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

والحكمة عبارة عن معرفة	اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ
افضل الاشياء بافضل العلوم۔	سے جاننے کو کہتے ہیں۔

لغاتِ قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں:

والحكمة اصابة الحق بالعلم	اور حکمت علم اور عقل کے ذریعہ سے سچی اور صحیح
والعقل فالحكمة من الله	بات کو پہنچنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا
تعالىٰ معرفة الاشياء وايجادها	جاننا اور اُن کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان

علی غایۃ الاحکام من الانسان معرفۃ الموجودات و فعل الخیرات۔	کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں۔ اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے۔ ابنِ حیان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں اُن کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے[1]:

۱۔ قال مالك و ابو زرین الحکمۃ الفقہ فی الدین والفہم الذی ھو سجیۃ و نور من اللہ تعالیٰ۔	امام مالک اور ابوزرین کا قول ہے کہ حکمت دین میں سمجھ اور اُس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔
۲۔ وقال مجاھد: الحکمۃ فھم القرآن۔	مجاہد کا قول ہے: حکمت یعنی قرآن کا فہم۔
۳۔ وقال مقاتل: العلم و العمل بہ لا یکون الرجل حکیما حتی یجمعھما۔	مقاتل کا قول ہے کہ حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔
۴۔ وقیل: الحکم والقضاء۔	بعضوں کا قول ہے: حکمت فیصلہ کرنا ہے۔
۵۔ وقیل: ما لا یعلم الا من جھۃ الرسول۔	کسی کا قول ہے: حکمت وہ ہے جو رسول کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔
۶۔ وقال ابو جعفر محمد بن	ابو جعفر کا قول ہے: ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل

---

[1] زیرِ آیت وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ الآیۃ۔ جلد اوّل۔

يعقوب: كل صواب من القول ورث فعلا صحيحا فهو حكمة۔

پیدا کرے حکمت ہے۔

۷۔ وقيل: وضع الاشياء مواضعها۔

کسی کا قول ہے: چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا حکمت ہے

۸۔ وقيل: كل قول وجب فعله۔

ایک اور شخص کا قول ہے: ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو حکمت ہے۔

امام ابنِ جریر نے اپنی تفسیر میں حسبِ ذیل اقوال لکھے ہیں:

۱۔ قال (مالك): المعرفة بالدين والفقه في الدين والاتباع له۔

مالک کا قول ہے: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔

۲۔ قال ابن زيد: الحكمة الدين الذي لا يعرفونه الا به صلى الله عليه وسلم يعلمهم اياها۔

ابنِ زید کا قول ہے: حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوتا ہے۔ وہی اس کو سکھاتا ہے، نیز انہی کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ "جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی" اور خدا نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا کہ "خدا اُن کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھاتا ہے"۔ ابنِ زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ "ان کو اُس کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں تو وہ اُن سے الگ ہو گیا"۔ یعنی اِن آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کیونکہ ان کے ساتھ حکمت نہ تھی۔ انہی کا قول ہے کہ

قال والحكمة العقل في الدين وقرأ ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا وقال لعيسى ويعلمه الكتب والحكمة والتوراة والانجيل۔ وقرأ ابن زيد واتل عليهم نبأ الذي اتيناه ايتنا فانسلخ منها۔ قال لم ينتفع بالايات حين لم تكن معها

حکمۃ قال والحکمۃ شیء یجعلہ اللہ فی القلب ینورلہ بہ۔

حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ اپنے بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اُس سے اُس کو روشن کرتا ہے۔

۳۔ عن قتادۃ: والحکمۃ ای السنۃ۔

قتادہ سے مروی ہے: حکمت یعنی سنتِ نبویؐ۔

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

۴۔ قال ابن جریر الطبری: والصواب من القول عندنا فی الحکمۃ انہا العلم باحکام اللہ التی لا یدرک علمہا الا ببیان الرسول صلی اللہ علیہ وسلم والمعرفۃ بہا وما دلّ علیہ ذٰلک من نظائرہ وھو عندی ماخوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل بین الحق والباطل۔

ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت اُن احکامِ الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسولؐ کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور اُن کی اور جو اُن کی مثالیں اور نظیریں ہیں اُن کی معرفت کو کہتے ہیں، اور "حکمت" کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۵۔ وسمعت من ارضی من اھل العلم بالقرآن یقول: الحکمۃ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

میں نے قرآن کے اُن اہلِ علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرتؐ کی سنت کا نام ہے۔

امام شافعیؒ اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں:

وسنۃ الحکمۃ التی القی فی روعہ عن اللہ عز وجل۔

اور آپؐ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپؐ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ کُل کے کُل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط، صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور و فکر، دلیل و برہان اور تجربہ و استقراء کے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے، اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں۔ دُوسرے وہ جو اُس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت، صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ ہی اس کے متعلق جچی تُلی رائے دیتے ہیں اور حرف حرف صحیح دیتے ہیں۔ اسی کا نام آپ صحتِ وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری، انشا پردازی اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سُنی جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق و باطل اور افعال کے خیر و شر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے۔ وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربّانی ذوق و وجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دُوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے۔ یہی وہ معرفت اور نورِ الٰہی ہے جو جدّ و جہد اور سعی و محنت سے نہیں بلکہ عطا و بخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام "حکمت" ہے۔

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں

نہیں ملتا بلکہ حسبِ استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ حضرات انبیاءؑ کو حاصل ہوتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح اس ربّانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر "حکمت" کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت (حکمت) کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت دیئے جانے کا بیان ہے، اس کے بعد اس حکمتِ لقمانی کی حسبِ ذیل تعلیمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے: اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر و غرور کی ممانعت، میانہ روی، آہستہ بولنا۔ اسی طرح تیرھویں آیت میں حکمتِ محمدی کی حسبِ ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے۔ شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابت داروں اور بیکسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا۔ بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر و غرور کی مذمت۔ ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ

یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

(بنی اسرائیل: ۳۹)

حکمت کی ان بعضوں باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود

فطرتِ انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ اُن میں اِسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآنِ پاک نے بھی اپنی صفت "حکمت والا قرآن" ظاہر کی ہے۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ[۱]۔ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ[۲]۔ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ[۳]۔

اِن آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ "حکمت" کی بعض اہم تعلیموں کو وحیِ الٰہی خود اپنے اندر کبھی شامل کرکے ان کو آبِ مقطّر بنا دیتی ہے۔ یہ چیز انبیاءؑ کو کتابِ الٰہی کی وحی کے ساتھ ساتھ عام طور پر ملتی ہے۔ فرمایا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ	اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ
لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ	البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔

(اٰل عمرٰن: ۸۱)

بہرحال یہ حکمت کی قوّت انبیاءؑ کو بدرجۂ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اُن کی ہر بات دانائی اور اُن کا ہر کام دانشمندی پر مبنی ہوتا تھا۔ اور چونکہ یہ قوّت اُن کو حاصل تھی اس لئے اس کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے جن کا نہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ اُن پر عمل بھی نبوّت کی تصدیق میں داخل ہوا۔ پندرھویں آیت میں ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى[۴] فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ	(اے محمدؐ رسول اللہ کی بیویو!) تمھارے گھروں
اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ	میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی

---

[۱] یونس: ۱ ولقمان: ۲ [۲] یٰس: ۲ [۳] اٰلِ عمرٰن: ۵۸ [۴] لفظ یُتْلٰی سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لئے خاص ہو کہ آنحضرتؐ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سناتے تھے بلکہ الفاظِ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔

(الاحزاب : ۳۴) جاتی ہیں اُن کو یاد رکھو۔

محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو آیاتِ الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و دانائی کی باتیں تھیں۔ اَب اگر وہ باتیں امورِ دین سے متعلق نہ ہوتیں تو اُن کے لئے اُن کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا۔ اِسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرتؐ کی صفت میں ہے:

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے

(الجمعۃ : ۲)

محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی تو جس حکمت کی تعلیم وہ دیتے تھے وہ خود اُن کے اندر بھی تھی کہ جو چیز اُن کے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے۔ اور جب یہ قوت آپؐ کے پاس تھی تو اُس کے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے جن کی آپؐ تعلیم فرماتے تھے اور اپنے ان امورِ حکمت کی تعلیم سے آپؐ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان اُن پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ	میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ
لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ	جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں
(الزخرف : ۶۳)	اُن میں سے کھول دوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنیین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے اور اصل مقصود کی تشریح

لہ قرآن پاک میں حرف علت سے قبل اور آیا کرتا ہے جیسے وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، یہ حرفِ عطف نہیں۔

ہو جائے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے توراۃ کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے، تفصیل فرمائی اور اُن کی غلطی دُور کی۔

بارھویں آیت میں ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ	اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو اُن میں سے ایک
لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ	گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کرے اور وہ گمراہ نہیں
وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا	کرتے لیکن اپنے آپ کو۔ اور تجھے ذرا سا بھی
يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ	نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اللہ نے تجھ پر
عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ	کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو سکھایا جو تُو
تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ	نہیں جانتا تھا۔ اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا
عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝	ہے۔

(النسآء : ۱۱۳)

اِن آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپؐ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن کی یہ چال کارگر نہ ہُوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے، اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اُس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہُوا کہ گمراہی سے آپؐ کی یہ حفاظت، خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپؐ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب سے حاصل ہُوئی ہے۔ الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتابِ الٰہی کے ساتھ حکمتِ ربّانی کے انعام کو بھی دخلِ کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینۂ نبوت تھا۔ لیکن یہ فیض حسبِ استعداد پیغمبر

کی اتباع میں دُوسروں کو بھی ملتا ہے جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچّی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغِ اسلام کے تین ذریعوں، حکمت، موعظت اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے میں سب سے اوّل حکمت کو جگہ دی گئی ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط

تُو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور اُن سے مناظرہ بطریق احسن کر۔

(النحل: ۱۲۵)

سچّی، صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے۔ فرمایا:

حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ

دِل تک پہنچ جانے والی حکمت۔

(القمر: ۵)

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور ہر بھلائی کی اصل ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا:

مَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا ○

جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت نیکی (دولت) دی گئی۔

(البقرۃ: ۲۶۹)

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جن سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرنِ اوّل میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا۔ آنحضرتؐ نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سُن کر فرمایا:

انّ من الشعر لحکمۃ و ان	بعض شعر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں
من البیان لسحرا	جادو ہوتی ہیں۔

ایک حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریروں کو جادو کہا گیا ہے۔ اس تقابل سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اُس کے اُردو مفہوم سے بلند تر ہے یعنی سحر و جادو کے مافوق انسانی تصوّر کی طرح "حکمت" کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیّل ضرور ہے۔ اِسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اور اُردو میں اس حقیقت کو "حکمت" کے ساتھ لفظ "الہامی" بڑھا کر ادا کیا جا سکتا ہے یعنی "الہامی حکمت"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے[1] کہ ایک موقع پر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا، رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر۔ ایک اُس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اُس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے۔ دُوسرے رَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْحِکْمَۃَ فَھُوَ یَقْضِیْ بِھَا وَیُعَلِّمُھَا (اُس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اُس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دُوسروں کو سکھاتا ہے اور اُس میں معلّم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے)۔ جب عام انسانوں کا یہ درجہ ہے تو انبیاءؑ کو یہ دَولت کس بہتات سے ملی ہوگی اور وہ یقیناً آنحضرتؐ کے حصّہ میں بھی آئی۔ اب اس حصولِ دَولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپؐ سے ظاہر ہونا چاہئے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے۔ آپؐ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات تمام تر وحیٔ ربّانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب و حکمت کی تعلیم | اوپر کی چار آیتوں ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ میں خفیف سے تغیّر کے ساتھ حسبِ ذیل آیت ہے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب العلم۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (الجمعۃ : ۲)

وہ رسول اُن (اَن پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سُناتا اور اُن کو سنوارتا اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

اِن آیتوں میں آنحضرتؐ کے تین کاموں کا ذکر ہے:

۱۔ خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دُوسروں کو سُنانا۔

۲۔ اُن کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک وصاف کرنا اور سنوارنا۔

۳۔ اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو؟ اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سُود تکرار کا فائدہ کیا؟ کیوں نہ دُوسری جگہ بھی یَتْلُوْا (یعنی تلاوت کرتا ہے) ہی کا لفظ رکھ دیا گیا۔ اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں جیسا کہ ہر صاحبِ نظر سمجھ سکتا ہے، تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔ اگر رسول کا فرق محض وحی کی زبان سے سُنی ہُوئی آیتیں پڑھ کر دُوسروں کو سُنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے خصوصاً جب کہ تعلیم کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہو۔ وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہتا ہے۔ کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سُنا دینا اور پڑھا دینا یا دُوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظِ قرآنی کی تلاوت کے بعد جو آپؐ کا پہلا کام تھا، اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معنی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے اُن کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام "کتاب و حکمت کی تعلیم" ہے۔ اور یہ آپؐ کا دُوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا اِن آیتوں میں بار بار ذکر ہے۔ اب

جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپؐ کے فرائضِ نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی اور اس کی تعمیل بھی امت کے لئے ضروری ہوگی۔ آپؐ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہؓ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل کے ذریعہ سے محفوظ رکھا اور وہ "احادیث و سُنن" کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد "حکمت" کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو ائمۂ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آجائے گا کہ وہ کُل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں۔ آنحضرتؐ کے اقوال و افعال جن کے اصطلاحی نام احادیث و سُنن ہیں، کتابِ الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں۔ کتابِ الٰہی، وحیٔ ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سُنن، سینۂ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا۔ اس مقام پر امام شافعی کی یہ تحقیق پیشِ نظر رہے:۔

وسنة الحكمة التي القي في	اور آپؐ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپؐ کے
روعه عن الله عزوجل	قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

(کتاب الرسالة)

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحکمة فهم القرآن (حکمت فہم قرآن کا نام ہے)۔ دوسری عبارت میں یُوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے۔ اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہُوئی سنّت ہے۔ اور اس معنی کو امام مالک اور ابو رزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ "حکمت معرفتِ دین، فقہ دین اور اس علمِ دین کو کہتے ہیں جس کو رسولؐ نے بیان کیا اور حکمت اُس نُور کا نام بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منوّر کر دیتا ہے"۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمتِ نبویؐ وہ نورِ نبوت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالےٰ

نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب وسینہ میں ودیعت کیا تھا۔ اور چونکہ آپؐ کے سنن و اقوال آپؐ کی اسی ودیعت شدہ حکمتِ نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں اس لئے اُن پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے۔ اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعضوں نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے۔ اور دونوں حق پر ہیں۔

علم علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں۔ مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی۔ انبیاءؑ کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعًا خدا کی توحید، ذات وصفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ

اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصّہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

(مریم: ۴۳)

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہے:

وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا ○

اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔

(الکھف: ۶۵)

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے۔ پھر "اپنے پاس سے علم سکھانے" کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شئے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش اور جدّوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجانب اللہ کہی جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم واستدلال اور تلاش وتحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو۔ یہی علم خداداد ہے اور اسی لئے

صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو علم لدُنی (پاس والا علم) کہتے ہیں۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السّلام کی نسبت ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ — اور بے شبہ ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم دیا۔

(النمل، ۱۵)

حضرت یُوسف علیہ السّلام کے آغازِ نبوّت کے موقع پر ہے:

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ — اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نوازے گا اور
يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ — تجھ کو باتوں کی حقیقت رسی (تاویل) سکھائے گا
وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ — اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔

(یوسف، ۶)

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشاء وحیٔ موقّت ہے کیونکہ ان میں سیاقِ کلام سے علم کے یکبارگی دیئے جانے کا ذکر ہے جو وحیٔ موقّت کی شان نہیں۔ خصوصاً آخری آیت میں تو تاویلِ احادیث کا علم بیک دفعہ دیئے جانے کی تصریح ہے۔ اسی لئے حضرت یوسف علیہ السّلام ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دُوسرے موقع پر کہتے ہیں:

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ — یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔

(یوسف، ۳۷)

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت ان پر وحی آکر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوّت ہمیشہ کے لئے ودیعت کر دی گئی تھی۔ اِسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیاءؑ کو بچپن ہی میں عَلِیْمٌ (جاننے والے) کا خطاب ملا:

وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ — اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحبِ علم

(الذّٰریٰت : ۲۸) فرزند کی خوشخبری دی۔

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ○ ہم تجھے ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوشخبری

(الحجر : ۵۳) دیتے ہیں۔

یہاں لفظ عَلِیْمَ اختیار کیا گیا ہے عَالِمَ نہیں۔ اور یہ لفظ عَالِمَ سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے۔ ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحیٔ موقت جو گاہ گاہ آتی ہے، اُس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم و حکم | بہت سے انبیاءؑ کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے۔ حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اُردو میں سمجھ اور بُوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کر سکتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

والحکم بالشیٔ ان تقضی بالشیٔ بانہ کذا اولیس کذا سواء الزمت ذٰلك غیرہ او لم تلزمہ۔ کسی شے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شے ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے۔ عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دُوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

الحکم العلم و الفقہ والقضاء بالعدل۔ حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔

ان انبیاءؑ کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے۔ اس سے یہ معلوم ہُوا کہ وحیٔ کتاب کے علاوہ کسی اور عطیۂ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا اور جب یُوسفؑ جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم

وَّعِلْمًا ط (یوسف : ۲۲) نے اس کو حکم اور علم دیا۔

حضرت لُوط علیہ السّلام کے متعلّق ہے:

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (الانبیآء:۷۴) اور لُوطؑ کو ہم نے حکم اور علم دیا۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السّلام کے ذکر میں ہے:

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ز (الانبیآء : ۷۹)

تو ہم نے سلیمانؑ کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔

حضرت یحییٰ علیہ السّلام کی نسبت ہے:

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ط وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ (مریم : ۱۲)

اے یحییٰؑ! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اُس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (الجاثیۃ : ۱۶)

اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوّت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوّت تین چیزیں ہیں۔ یہاں کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حُکم سے مراد دُنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے۔ یہ اہلِ عجم کا محاورہ ہے۔ قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوّتِ فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے:

فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ — ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

(صٓ : ۲۲)

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ — تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

(صٓ : ۲۶)

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ — اور تُو اُن کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔

(المائدۃ : ۴۲)

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السّلام ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں:

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ (الانبیآء : ۷۸) — اور داؤدؑ اور سلیمانؑ کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ — اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

(الشوریٰ : ۱۰)

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر کہی گئی ہیں:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ — یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔

(الانعام : ۸۹)

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے

یہ ہیں: ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں "حکم" بمعنی حکومت وسلطنت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمان اور داؤد علیہما السلام، اور چاہے کسی طرح کتنی تاویل سے یوسف اور موسیٰ علیہما السلام کو بھی شامل کر لیجئے، باقی چودہ نام اُن پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح وصریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ غلط فہمی کا پردہ چاک کرنے کے لئے ایک اور آیتِ کریمہ پر نظر ڈالئے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ	کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو
الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ	کتاب حکم اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہے
يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ	کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو۔ بلکہ جو تم
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ	کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا	تھے اُس کے ذریعہ سے تم خدا والے
كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝	بنو۔

(آل عمران: ۷۹)

ان آیتوں میں مخاطب اہلِ کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے بظاہر اُس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور وناتواں تھا۔ ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے وہ کتاب ونبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو حکومت وسلطنت کا ادنیٰ

شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا اور آنحضرتؐ کو اُس وقت تک جب بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا۔ آیت اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربّانی ہے حکومت و سلطنت نہیں۔ تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو:

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ	کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی
بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ	دلیل پر ہوں اور تم اُس کو جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس
بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ	وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو۔ فیصلہ کسی کا نہیں
الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ○	لیکن اللہ کا۔ وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ
(الانعام: ۵۷)	کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاءؑ کو منصبِ نبوت اور وحیِ کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس کے صاف و صریح معنی کلامِ عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم و فہم، فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے۔ اور اس لئے رسول کی اس قوت و طاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرحِ صدر ربّانی علم و معرفت کا ایک اور مقام شرحِ صدر ہے۔ شرحِ صدر کے معنی "سینہ کھولنے" کے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل و نادانی کی علامت ہے۔ اور سینہ کی کشادگی اور فراخی، علم کی وسعت اور معرفت کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی لئے شرحِ صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں۔ اور خاص طور سے اُس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اِس حل سے اُس کی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے اور اس کے

شکوک وشبہات دُور ہو کر اس کو یقین کی راحت ومسرّت حاصل ہو جاتی ہے۔ جمہرہ ابن درید میں ہے:

والشرح من قولهم شرحت لك الامر اى اوضحته وكشفته وشرح الله صدره فانشرح اذا اتسع بقبول الخير۔

شرح اہلِ عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ "میں نے تیرے لئے بات کی شرح کر دی" یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا۔ یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔

صحاح جوہری میں ہے:

الشرح الكشف تقول شرحت الغامض اذا فسّرته۔

شرح یعنی کشف (کھولنا)۔ تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اس کی تفسیر کر دی۔

لسان العرب میں ہے:

الشرح الكشف يقال شرح فلان امره اى اوضحه و شرح مسئلة مشكلة بيّنها۔ وشرح الشئ بشرحه شرحا وشرحه فتحه بيّنه وكشفه وكل ما فتح من الجواهر فقد شرح ايضا تقول شرحت الغامض اذا فسّرته۔ وشرح الله صدره

شرح یعنی کشف کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اُس کو بیان کر دیا۔ اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اُس کی شرح کی گئی۔ تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی تفسیر کر دی۔ اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے

بقبول الخير بشرحه شرحًا فانشرح وسّعه لقبول الحق فانسع۔

تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبولِ حق کے لئے وسیع کر دیا تو وہ وسیع ہو گیا۔

قال ابن الاعرابی الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البیان والشرح الفهم۔

ابنِ اعرابی نے کہا، شرح کے معنی ہیں یاد رکھنا کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعاء مانگی:

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۙ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ۙ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۙ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۙ

اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔

(طٰہٰ: ۲۵-۲۸)

دُعاء کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحتِ بیان کی۔ یعنی اوّل میں صحیح معنی کے القاء اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دُعاء کی ہے۔ تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں۔ لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بن مانگے ملی۔ خدا نے فرمایا:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ

کیا ہم نے اے محمدؐ! تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا۔

(الم نشرح: ۱-۲)

شرح صدر اور "سینہ کھولنے" کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح

شقِّ صدر ہے۔ یعنی عالم رؤیا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینۂ مبارک کو واشگاف کیا، اُس کو آبِ زمزم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینۂ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا۔[۱] اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینۂ مبارک کو واقعًا چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک وصاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی۔ اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو بھی یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینۂ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا۔ بہرحال شرحِ صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرحِ صدر کے اس مذکورۂ بالا معنی کو جو شقِّ صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بھی بحمداللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ	بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول
لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ	دیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی
رَّبِّہٖ ط (زمر - ۳)	میں ہے۔

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین آگیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزلِ مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہے۔ یہی "شرحِ صدر" کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی وبیشی درجوں اور منصبوں کے

---

[۱] صحیح بخاری وصحیح مسلم ونسائی ابواب معراج واسراء وفرائض الصلوٰۃ ومسند احمد بروایت انس بن مالک وسنن ترمذی سورۂ انشراح۔

کے مطابق ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ "شرح صدر" کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ پیشِ نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں بلکہ صدرِ اوّل کے کلامِ عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے:۔

۱۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ آکر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفۂ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچا لیا۔ حضرت صدیقؓ جواب دیتے ہیں "خدا کی قسم میں اس سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے۔ اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیتے تھے اب نہ دیں گے تو میں اُن سے لڑوں گا۔" اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

فو اللہ ما ھو الا ان قد شرح	تو خدا کی قسم! نہ تھا یہ لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ
اللہ صدر ابی بکر فعرفت انہ	نے ابوبکرؓ کے سینہ کو۔ تو میں نے جان لیا وہی
الحق۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ)	حق ہے۔

۲۔ دوسرا واقعہ ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے۔ اُس وقت حضرت عمرؓ نے آکر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ قرآنِ پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں بھی بات آگئی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں:

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذلك ورایت فی ذٰلك الذی رای عمر۔

تو عمرؓ بار بار مجھ سے کہتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ دیکھتے تھے۔

(صحیح بخاری جمع القرآن)

اِن دونوں موقعوں پر لفظ شرحِ صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہی شرحِ صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گزرا، نورِ ربّانی یا نورِ بصیرت کہا ہے۔

آنحضرتؐ کو شرحِ صدر کی جو وُسعت عطا ہوئی تھی اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیے۔ جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقیّد ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے۔ لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے۔ جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں۔ اور اس عبارت میں اُس علم سے مقصود اسی خاص شئے کا علم ہوتا ہے جس کو مفعول بنایا ہے۔ لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا۔ ایک جگہ قرآن میں ہے يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا[1] (وہ حیوٰۃ دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں) ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دُنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے عام علم سے نہیں۔ لیکن دوسری جگہ ہے هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ[2] (کیا جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں)۔ یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں بلکہ مقصود عام علم ہے۔ تو یہاں معنی یہ ہوں گے کہ "جو ہر طرح کے علم

---

[1] الروم: ۷۔ [2] الزمر: ۹۔

والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔" بلاغت کی کتابوں میں ھو یامر وینھی، ھو یطعی ویمنع، ھو اضحك وابکیٰ کی مثالوں سے اس کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرحِ صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالئے۔ ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے اُس پر لام آتا ہے یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعینِ زکوٰۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرتؐ کے لئے قرآن میں جس شرحِ صدر کا ذکر ہے اُس میں اُس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیاءؑ کے سینے کھولے گئے۔ اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیاءؑ کو امورِ دین میں مطلق اور عمومی شرحِ صدر عنایت ہوا اور یہیں سے عام امّت اور انبیاءؑ کے فرقِ مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امّت کے عام افراد کو خاص خاص امور کے سمجھنے کے لئے شرحِ صدر ملتا ہے اور انبیاءؑ کو اپنے دائرہ میں کلّی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان دونوں موقعوں پر لِی اور لَکَ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں "میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے"۔ اور آنحضرتؐ کے لئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا"۔ سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لئے" کے اضافہ کی ضرورت اور اس "لام" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لامِ تملیک کے بجائے لام افادہ ہے جیسا کہ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا[1] میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ شرحِ صدر کی دولت تجھ کو تیرے لئے ملی ہے یعنی تیرے کشفِ علم کے لئے یا تائید کے لئے یا فائدہ کے لئے اور یہ کشفِ علم اور

---

[1] البقرۃ: ۲۹

شرح صدر خود تیری ذات کے لئے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو دین کا جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوا اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا؛ دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو افعال و اقوال اور احادیث و سننؐ کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیین کتاب آنحضرتؐ دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی۔ اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلّی اور ابدی اصول و مبادی پر دے۔ چنانچہ اس آخری وحیٔ الٰہی نے اپنی کتاب کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پُر نور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیض یاب ہوں، وہ علی قدر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں۔ چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی کو ملا۔ اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے اس لئے اُس کے اِس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے یہ منصب خلفائے راشدین، اکابر صحابہؓ، ائمۂ تابعین و تبع تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام کو ہمیشہ ملتا رہا۔ اسی کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یابانِ علوم نبوت اور حاملینِ اسرارِ شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے۔ فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ	تُو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض
بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ	سے حرکت نہ دے تاکہ تو اس کی (تلاوت و اشاعت
قُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ	میں) جلدی کرے۔ بیشک ہم پر ہے قرآن کو جمع

قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ○ (القیٰمۃ : ۱۶—۱۹)

کرنا اور اُس کو پڑھانا۔ اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا تو تُو اس کی پڑھائی کی پیروی کر پھر ہم پر ہے اُس کی شرح کرنا۔

اس بیان و شرح کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔ پھر کبھی رسولؐ کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث و سُنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔ یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا، حسبِ ذیل آیت سے ثابت ہے:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ (النحل : ۴۴)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تُو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔

"بیان اور تبیین" کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے۔ ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفاء کے مقابل، دوسرے توضیح و تفسیر کے معنی میں۔ قرآن پاک میں یہ لفظ "تبیین" اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہیں سیاق و سباق اور موقع و محل سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ (المائدۃ : ۱۵)

اے کتاب والو! تمھارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ ان کو تمھارے لئے ظاہر کر دے اور بہت سی باتوں سے درگزرے۔

یہاں "تبیین" صریح طور سے اخفا کے مقابلہ میں ہے اس لئے یہاں "تبیین" کے معنی تعیینی طور پر اظہار و اعلان کے ہیں۔ لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا	اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اُتاری لیکن اس لئے
لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ	تاکہ تو واضح کر دے اس کو جس میں انھوں نے
وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○	اختلاف کیا۔ اور ایمان والوں کے لئے رہنمائی
(النحل : ۶۴)	اور رحمت بنا کر اُس کو اُتارا۔

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح و تشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو وہ اس توضیح و تفسیر کے بعد دُور ہو جائے۔ اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہئے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ	اور ہم نے (اے پیغمبر) تیری طرف نصیحت کی کتاب
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ	(قرآن) کو اُتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اُتارا
يَتَفَكَّرُوْنَ ○	گیا تو اس کو ان کے لئے کھول کر بتا دے شاید
(النحل : ۴۴)	کہ وہ سوچیں۔

سوال یہ ہے کہ اس آیتِ پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح و تفصیل کرنے کے؛ ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے۔ امرِ مخفی کا اظہار سُننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے کے نہیں۔ سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لئے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی۔ اب جبکہ آنحضرتؐ کے لئے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپؐ کی یہ

تبیین و تشریح آپؐ کے نورِ حکمت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتابِ الٰہی کے اندر آپؐ کو موجود نظر آتے تھے۔

اراءت | انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ اُن کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے جو ایک طرف اختلافِ فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں، پوری طرح حاوی ہو سکے۔ لیکن فہمِ انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جا سکتا تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اپنے قانونِ الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلافِ فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرا دی۔ گو انسانی ذرائع حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلافِ فہم پیدا ہو گیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرتؐ کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہتے اور آپؐ وحیٔ کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنے نورِ بصیرت اور فہمِ حکمت سے اُن کے فیصلے فرماتے رہتے۔ خلفائے راشدینؓ نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لئے اوّلاً وحیٔ کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرتؐ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہمِ نبوت، نورِ بصیرت اور اراءتِ الٰہی کے ذریعے فیصل ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا اور یہی اصول بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے اختیار کیا اور ہر نئے واقعہ کو وحیٔ کتاب اور فیصلۂ نبوی کے معصوم و مسلّم معیار پر جانچ کر اُن میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں اُن میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل

وانصاف، رسم ورواج، عقل وفکر واستحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا۔ یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحیٔ الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرتؐ کے قضایا اور فیصلے احادیث وسُنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں۔ وحیٔ الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہوسکتا۔ اب رہ گئی آنحضرتؐ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی تو اس کے متعلق بھی وحیِ الٰہی ناطق ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	ہم نے (اے پیغمبرؐ) تیری طرف سچائی کے ساتھ
لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ	کتاب اُتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سجھائے اُس کے ذریعہ فیصلہ کرے۔

(النسآء : ۱۰۵)

اس کتابِ الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبرؐ! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اُس فہم کے ذریعہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپؐ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحیٔ الٰہی کے بعد دُوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرتؐ کے عدل وانصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا۔ چنانچہ اُن کا قاعدہ تھا کہ جب اُن کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دوڑے ہُوئے عدالتِ نبویؐ میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپؐ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا۔ لیکن جب اُن پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی سرزنش کی:

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم
مُّعْرِضُونَ ○ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ
يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ○ أَفِي
قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ
يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ
وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○
إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا
إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ
أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○ وَمَن
يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ
وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ○

(النور: ۴۸—۵۲)

جائیں کہ رسول اُن کے درمیان فیصلہ کردے
تو اُن میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں۔ اور اگر
اُن کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول
کے پاس چلے آئیں۔ کیا اُن کے دل میں بیماری
ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا
اور اس کا رسول اُن کے ساتھ بے انصافی کرے
گا بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں
کی بات یہ تھی کہ جب اُن کو خدا اور رسول کی طرف
بلایا جائے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کردے
تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ انہی لوگوں
کا بھلا ہے۔ اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول
کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ سے
بچ کر نکلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ رسولؐ کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسولؐ کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○ (النساء: ۶۵)

تو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے،
جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ
بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل
میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ
اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ
يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ
ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝

اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب
اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو اُن کو اپنے
کام کا اختیار رہے۔ اور جس نے اللہ اور اُس
کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ
ہُوا۔

(الاحزاب : ۳۶)

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربّانی ذمہ داری ہر حاکمِ وقت اور سلطانِ زمانہ کے لئے نہیں۔ یہ انبیاءؑ کے لئے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جُزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحیٔ قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسولؐ کے فہمِ نبوّت، نورِ نبوّت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور اراءت (دکھانا اور سمجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا۔ لیکن کلّیات کی حیثیّت سے وہ یقیناً وحیِ قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپؐ کو سُجھاتا تھا۔

آپؐ کے اِن قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مُسلمان پر قیامت تک ضروری ہے۔ آپؐ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اُس قسم کے مقدّمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپؐ نے اپنی زندگی میں اُن کے متعلّق کئے کہ آپؐ کے فیصلے بحکمِ خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزّہ تھے۔ اور دُنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رُتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے۔ یعنی نبوّت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد اُن کی ذات مجسّم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی

کے لئے خاص ہو جاتی ہے۔ اُن کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور اُن کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں۔ جس امّت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی روشنی مِل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنھیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کر کے فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ

اے مومنو! اگر تم اہلِ کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمھیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے۔ اور تم کو کیوں کفر کرنا چاہئے درآنحالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

(آل عمران: ۱۰۰–۱۰۱)

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں۔ ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسولؐ کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے اُن کو بہکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا۔ اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتابِ صامت (قرآن) اُس کی کتابِ ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے اور غالباً اس حدیثِ صحیح کے بھی یہی معنی ہیں جس کا اعلان آپؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا:

انی تارك فیكم الثقلین كتاب اللہ وسنتی۔

مسلمانو! میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد آپؐ کا ظاہری وجود مٹ گیا مگر آپؐ کی عملی زندگی جس کو سنّت کہتے ہیں، قائم و باقی ہے۔ اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ انبیاء علیہم السّلام کا عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے۔ تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں۔ نبوّتِ محمدیہؐ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپؐ کی یہ توصیف کی گئی ہے "ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے۔ یہ پاک و صاف کرنا آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیّت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ کی تعلیم و تربیت، فیضانِ صحبت، حُسنِ اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے بُرے اچھے، بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیاءؑ کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوئے ہر طرح کی اذیّتیں اٹھائیں، تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدّت تک اُن کی تاثیر کا فیض جاری رہا۔ اُن کا یہ وصفِ تزکیہ وحیٔ و الہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دِل کی کیمیا اثری کا نام ہے خواہ اُن کی زبان اُس وقت وحیٔ الٰہی سے مترنّم ہو یا خاموش، ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلعِ نبوّت سے نکل نکل کر دِلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

نُور اِسی لئے نبوّت کا سینہ صدق و صفاء کا آئینہ ہوتا ہے۔ نبی کا مجسّم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلعِ نور ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا صحیفۂ الہامی اور وحیٔ ربّانی نور ہوتی ہے۔ وہ

خود بھی سراپا نور ہوتا ہے جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے اور اُن کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں۔ خود آپؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ	اے نبیؐ! ہم نے تجھ کو بتانے والا، خوشخبری سنانے
شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝	والا، چوکنا کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا	بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔
مُنِيرًا ۝ (الاحزاب: ۴۵-۴۶)	

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسولؐ کی ذات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپؐ کے جسم و جان، زبان و دل، خُلق و عمل، علم و فہم میں روشنی نہیں تو آپؐ کی ذات جو ان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے، روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی۔ اور جب آپؐ کی ذاتِ مبارک کی یہ تمام چیزیں انوارِ الٰہی ہیں تو اُن انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطعِ نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات و ملکوت کی رویت جس طرح انبیاءؑ اپنی قوتِ سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کی سماعت کرتے ہیں اسی طرح اُن کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ	اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمان اور زمین
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ	کی مملکت دکھاتے تھے تاکہ وہ یقین کرنے والوں
مِنَ الْمُوقِنِينَ ۝	میں ہو۔

(الانعام: ۷۵)

استعدادِ نبوت کی تربیت اور نشو و نما کے لئے یہ رویت و بصیرت کی مافوق قوت اُن کو عطا

ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حُسن و عشق کی مشہور کہانی۔ ۔ ۔ آنحضرتؐ کے مشاہداتِ رُوحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے اِن الفاظ میں کیا گیا ہے:

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ط — تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

(بنی اسرائیل : ۱)

دوسری جگہ ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ○ — دِل جھوٹ نہیں بولا جو اُس نے دیکھا۔ کیا اس
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ○ وَلَقَدْ — پر اس سے جھگڑتے ہو؟ اور دوسری بار اُس کو
رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ○ — اُترتے دیکھا۔

(النجم : ۱۱-۱۳)

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○ لَقَدْ — نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی۔ اُس نے اپنے
رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ○ — رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

(النجم : ۱۷-۱۸)

ایک اور مقام پر ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ○ — اور اُس نے یقیناً اُس کو آسمان کے کھلے کنارے
(التکویر : ۲۳) — میں دیکھا۔

یہ مشاہدہ وحی و الہام کے علاوہ نبوّت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماعِ غیب جس طرح آیات و ملکوت کا مشاہدہ انبیاءؑ کے حاسۂ بصارت کا امتیازی وصف ہے اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سُننا بھی اُن کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے۔ قرآنِ پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاءؑ خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا[1] (اور خدا نے موسیٰؑ سے بات کی)۔

حضورؐ کو حکم ہوا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ز

اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔

(طٰہٰ: ۱۱۴)

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انھوں نے اس کی آوازیں سنیں۔ نَادَيْنَا (ہم نے پکارا) بار بار یہ مضمون قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ و دعوت | نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے۔ یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اُس کو دُوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اُس کو عطا ہُوا ہے اُس سے اَوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اُس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سُنا دینا۔ اُس نے اُس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اُس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، رُوحانی اور اخلاقی طاقتیں اُس کو بخشی گئی ہیں اُن کو اس راہ میں صَرف کرنا اور اس سمجھانے بُجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اُس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اُس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اُس کو آرام سمجھنا۔ جو کانٹے بھی اس وادی میں اُس کے تلووں میں چُبھیں اُن کو رگِ گُل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لئے جو قوّت بھی سر اٹھائے اُس کو کُچل دینا اور مال و منال، اہل و عیال، غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اُس کو ہٹا دینا اور اُس کی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضامندی، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

---

[1] النساء: ۱۶۴۔

یہ ہے انبیاءؑ کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم۔ دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انھوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار و قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ اور آج دُنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بیکسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطحِ زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلاواسطہ دانستہ یا نادانستہ انھیں کی دعوت و تبلیغ اور جدّ و جہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

دُنیا کے بڑے سے بڑے مفکّر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں۔ لیکن انبیاءؑ جس صداقت کو پاتے ہیں اُس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کے پھیلانے اور اہلِ دُنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوّت صَرف کر دیتے ہیں۔ وہ ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہِ راست دکھاتے ہیں۔

انبیاءؑ کی تعریف میں خدا فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ۝

(الاحزاب : ۳۹)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اُسی سے ڈرتے ہیں اور اُس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اور اللہ بس ہے حساب (اعمال) کے لئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو حکم ہوتا ہے:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝

(طٰهٰ : ۲۴)

فرعون کے پاس جا کر اُس نے سرکشی کی۔

آنحضرتؐ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغامِ ربّانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دُشمنوں سے نہ ڈریں کہ

اُن کی حفاظت کا خود شہنشاہِ دوعالم ذمّہ دار ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ

اے پیغمبرؐ! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اُترا ہے اُس کو پہنچا دے اور تُو نے نہ کیا تو اُس کے پیغام کے پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا۔ اور اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔

(المآئدۃ : ۶۷)

انبیاءؑ کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور اَنذار دونوں ہوتے ہیں۔ تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا اور اَنذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا، عذابِ الٰہی کا خوف دلانا اور لوگوں کو اُن کے انجامِ بد سے آگاہ کرنا۔ اور انبیاءؑ کی آمد اس شان سے اس لئے ہوتی ہے کہ خدا کی حجّت بندوں پر تمام ہو جائے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ

یہ سب پیغمبر خوشخبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجّت نہ رہے۔

(النسآء : ۱۶۵)

اِن سب نے پیغامِ الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ○

مَیں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور مَیں تمھارا خیر خواہ ہوں۔

(الاعراف : ۶۸)

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ○

اے میرے لوگو! مَیں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی کر چکا لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔

(الاعراف : ۷۹)

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ○

اے میرے لوگو! مَیں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیئے اور تمھاری خیر خواہی کر چکا تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں

(الاعراف : ۹۳)

یہ بھی فرمایا کئے:

لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ

مَیں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا۔ میری مزدوری تو اُس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔

(ھود : ۵۱)

لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ

مَیں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں۔ میری مزدوری تو خدا پر ہے

(ھود : ۲۹)

ایک شبہہ کا ازالہ اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دُور کرنا ہے جو بعضوں کو حضورؐ کی صفتِ تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسولؐ کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے۔ اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحیِ الٰہی کی تبلیغ ہے یعنی قرآنِ پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا

دینا اس کا کام ہے۔ اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اُس کا منصب ہے اور نہ اِس کا اُس کو حق ہے۔ ان کے نزدیک مبلّغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ سے دُوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اُس کو حق نہیں ہوتا بلکہ اُس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید اُن کو یہ دھوکا اِس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہُوا ہے جس کے لفظی معنی پیغامبر اور قاصد کے ہیں۔ لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے نبی (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مبشّر (خوشخبری سنانے والا)، نذیر (ڈرانے والا)، سراج منیر (روشن کرنے والا چراغ)، صاحبِ حکمت، صاحبِ خُلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ (مقبول)، مصطفیٰ (برگزیدہ)، مبین (بیان اور شرح کرنے والا)۔ معلّم (سکھانے والا)۔ مزکّی (پاک وصاف کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا)، حاکم (فیصلہ کرنیوالا)، مطاع (واجب الاطاعۃ)، آمر (حکم دینے والا) اور ناھی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف والقاب اُس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بَر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی داں کو حق حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدّعی کو دعویٰ ہے مگر خود صاحبِ پیغام کو اپنی پیغامبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اُس کی تشریح کا اُس کو حق تھا۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ[1]۔ ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ

---

[1] ص: ۵

تعالیٰ کے لئے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصلی شارع ہے۔ اب اگر رسول کے لئے بھی وحیٔ کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں۔ کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے سلطانِ وقت بن کر واضع قانون کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلّم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقۂ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطّلع نہیں فرماتا جس طریقِ خاص سے قرآن مجید نازل ہُوا ہے بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے۔ اور اُن میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام اُمّت پر فرض ہے خواہ وہ وحی ہو جو الفاظِ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو جس کو قرآن کہتے ہیں یا ربّانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں جس کو حدیث و سنّت کہتے ہیں۔ الغرض خواہ وہ کتابِ الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمتِ ربّانی کے فیض سے ہو۔

قرآنِ مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ "ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے"، اِن کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوشخبری سُنانے والا نہیں، ہوشیار اور بیدار کرنے والا نہیں، پیغامِ الٰہی کے الفاظ سُنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیاتِ الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں، رہنما و ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں۔ ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے۔ قرآن میں کئی جگہ ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ — تو تُو صرف ڈر سُنانے والا ہے۔

(الرعد، ۷، النازعات: ۴۵)

ایک جگہ ہے:

اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ (ص : ۶۵) میں تو صرف ڈر سُنانے والا ہوں۔

کیا اِن آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سُنانے کے سوا رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سُنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے مبشر نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اِس قسم کی آیتوں

اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○ ہمارے رسُول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

(المآئدۃ:۹۲)

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے، مبین اور شارح نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ زبردستی لوگوں کے دِلوں میں اس پیغام کا اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوا لینا نہیں اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر و انکار اور عدمِ ایمان کی ذمہ داری اُس پر ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں اُن کا منشاء یہی اور صرف یہی ہے۔ قرآنِ پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے، اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے:

۱۔ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ○

کتاب والوں اور اَن پڑھوں سے کہہ دے کیا تم نے اسلام قبول کیا؟ اگر کیا تو ہدایت پائی اور اگر مُنہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسولؐ) صرف پیغام پہنچانا ہے۔ اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔

(اٰل عمرٰن : ۲۰)

مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں۔ اگر لوگ قبول

کریں تو انھوں نے حق کی راہ پائی۔ اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا وہ اُس نے پہنچا دیا۔ اُس کا فرض ادا ہو چکا اب خدا جانے اور اُس کے بندے جانیں:

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ○ (الرّعد، ۴۰)

تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض اُن سے حساب لینا ہے۔

اِس کی مزید تفصیل سُورۂ غاشیہ میں ہے:

فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۝ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ○

(الغاشیہ: ۲۱ – ۲۶)

تو (اے پیغمبر!) تو نصیحت کر۔ تُو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے ان پر داروغہ نہیں۔ لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اُس کو بڑی سزا دے گا۔ بیشک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہمیں پر اُن کا حساب ہے۔

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے۔ وہ سلطان، کارفرما داروغہ اور فرماں روا بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوا لے:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ

(الشوریٰ: ۴۸)

تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو اُن پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا تو انھوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے۔ ماننے نہ ماننے کا تمھیں اختیار ہے:

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ

کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو خدا

وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ○ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ○ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

(یٰسٓ : ۱۵ – ۱۷)

نے کچھ نہیں اتارا تم جھوٹ کہتے ہو۔ رسولوں نے جواب دیا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بے شبہ تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا۔ پیغمبروں کا فرض لوگوں سے منوانا نہیں بلکہ اُن تک خدا کا پیغام پہنچانا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

(النحل : ۳۵)

اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو نہ پوجتے نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا۔ اور نہ اُس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے۔ (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے۔ تو کیا ہمارے پیغمبروں پر کھول کر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

(العنکبوت : ۱۸)

اگر تم جھٹلاؤ تو (کیا ہے) تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں۔ اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علّام الغیوب جو چاہے سو کرے:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ○

رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

(المآئدہ ۵ : ۹۹)

بقیہ آیتیں حسبِ ذیل ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو۔ اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

(المآئدہ ۵ : ۹۲)

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول پر وہ ہے جس کا بوجھ اُس پر ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے۔ اور اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

(النور : ۵۴)

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا

اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا تاکہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اور اگر انھوں نے منہ پھیرا تو

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ — تجھ پر کچھ نہیں ہے مگر کھول کر پہنچا دینا۔

(النحل : ۸۱-۸۲)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ — اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو۔ اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

(التغابن : ۱۲)

پیغمبرؑ کا قول ہے:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّا اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ — تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمھارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)۔

(ھود : ۵۷)

اِن تمام آیتوں کا تعلق نبوّت کے منکروں سے ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوّت کے منکر ہوں اُن سے رسولؐ کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و مواعظت اور سمجھانے کا ہے۔ لیکن جو خوش قسمت اقرارِ نبوّت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر اُن کا تعلق رسول سے اتّباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے بعد رسول اُن کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے۔ کوئی حکومت دوسرے ملک کے باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزورِ مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیاءؑ کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ دنیا میں جس قدر پیغمبرؑ آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے۔ وہی توحید، وہی نبوّت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی

پرسش۔ اس لحاظ سے انبیاءؑ کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا[۱] الآیۃ (یعنی خدا نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جو نوحؑ وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے)۔ لیکن انبیاءؑ کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوّت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دُنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں اور اُن کی دعوت بھی مفید ہو، اُن کے اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں۔ وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے اوتار لیکن اُن کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوّت کے رُتبہ کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے۔ اگر یہ نہیں تو نبوّت بھی نہیں۔ فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ	اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا،
رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ	لیکن اُس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود
اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○	نہیں۔ میری ہی پرستش کرو۔

(الانبیآء : ۲۵)

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا	اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا	عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔
الطَّاغُوْتَ ۚ (النحل : ۳۶)	

اس سے معلوم ہُوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوّت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے۔ اسلام سے پہلے جس مدعیٔ نبوّت کی تبلیغ کا اہم ترین جزو توحید نہیں اُس کو دعوائے نبوّت کا کوئی حق نہیں۔

---

[۱] الشوریٰ : ۱۳۔

نبوّت کی غرض و غایت انبیاء کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوشِ بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وحیٔ مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اصل دعویٰ وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو نہ کہ گواہ۔

انبیاء کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روزِ الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمانِ بندگی کی یاد دہانی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ	اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ	اُن کی نسلوں سے عہد لیا اور اُن کو خود اپنے اوپر
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ	آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟
قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ	انھوں نے کہا کیوں نہیں تُو ہے۔ ہم نے گواہی دی
الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا	کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو ہم اس کو بھول گئے
غٰفِلِيْنَ ۝	تھے۔

(الاعراف: ۱۷۲)

اس لئے ضرور ہوا کہ اُن کو موقع بموقع اُن کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اُس کا وجود بنی آدم پر اتمامِ حجّت ہے۔ ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا۔ اس لئے فرمایا:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا	رسول خوشخبری سُنانے والے اور ڈرانے والے
يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَي اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ	تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر

الرُّسُلِ ط — کوئی حجت باقی نہ رہے۔

(النسآء : ۱۶۵)

تذکیر کے بعد نبی کا فرضِ اوّلیں ہدایت و رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہادی کا مظہر اور مورد ہے۔ اسی لئے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لئے ہادی کا لفظ آیا ہے۔ فرمایا:

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ○ — اور ہر قوم کے لئے ایک راہ دکھانے والا آیا۔

(الرعد : ۷)

سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

وَإِنَّكَ لَتَهْدِيٓ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ○ — اور تُو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

(الشوریٰ : ۵۲)

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے:

وَجَعَلْنَٰهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا — اور ہم نے اِن پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔

(الانبیآء : ۷۳)

اسی طرح آسمانی کتابوں کو جو اُن کو دی گئی تھیں بار بار ھُدًی (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں اُن کو ضیاء اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت و رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔ لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور رُوحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیاءؑ اِن اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر اُن کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں۔ ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی

جگہ حق اور ظلمت کی بجائے نور عطا کرتے ہیں:

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ	وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے
اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ	تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ	

(الحدید : ۹)

اس دُنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے۔ جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اُس کے اُن عناصر میں جن سے اُس کی ترکیب ہوئی ہے، افراط و تفریط پیدا ہوئی روئے زمین پر فساد رُونما ہو گئے۔ انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی کبھی دونوں پلّے برابر نہ ہوں گے۔ آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرّہ اعتدال کی ترازو میں تُلا ہوا ہے۔ "کیمسٹری" اور "عِلم الفلک" کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرّہ کی کمی بیشی نہیں ہے۔ جس طرح اِس مادی دُنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے ٹھیک اُسی طرح رُوحانی اور اخلاقی دُنیا میں بھی اِس توازن کی ضرورت ہے۔ عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات اِسی توازن کا نام "حق" اور "عدل" ہے۔ فرمایا:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ۙ	اور آسمان کو اُونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس
اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ۝ وَاَقِیْمُوا	ترازو میں کمی بیشی نہ کرو۔ اور تول کو ٹھیک
الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔
الْمِیْزَانَ ۝	

(الرحمٰن ...)

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دُنیا کے ذرّہ ذرّہ اور اُس کی ایک ایک

حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے، یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک جنبش میں ہونی چاہیئے۔ بے ارادہ دُنیا کی میزان کا نام قانونِ فطرت ہے اور بالارادہ دُنیا کی میزان کا نام قانونِ شریعت ہے۔ بے ارادہ دُنیا کا نام نظامِ عدل اسی خدائی میزان فطرت سے چل رہا ہے۔ اگر اس میزان میں ایک ذرّہ بھی کمی بیشی ہو جائے تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی طرح انسانی دُنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزانِ شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	ہم نے بے شبہہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	کر بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ	تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں۔

(الحدید : ۲۵)

انبیاءؑ کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں اس موجودہ دُنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لئے ہے۔ آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دُنیا کے گوشہ گوشہ کو پُرشور بنا دیا ہے۔ آج رسولوں کی اہمیت اور اُن کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک و شبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے۔ لیکن وہمی و خیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دُنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو۔ آج جہاں کہیں بھی سچائی کی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے وہ اسی مطلعِ خورشید سے چھن کر نکلی ہے۔ کوئی دیندار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحارا کا وحشی، رُومی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بُت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا

غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں کہیں بھی ہو کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی و بدی کی تمیز سے آشنا ہے تو وہ خدائی رسولوں اور ربّانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلّموں کی کوششوں کا ممنون ہے۔ آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے وہ کسی یونانی حکیم یا یوروپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف اور تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے بلکہ طبقۂ انبیاءؑ ہی کے بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلّغ سہی، مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی، نکوکاری، حُسنِ خُلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت اُن ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں۔ جو عقیدہ کے مُلحد ہیں اُن کی بھی نیکوکاری اُن ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس بناء پر جو لوگ ذہنی طور سے پیغمبروں کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور سے اُن کی تعلیم کے مُقر اور معترف ہیں۔ اس لئے انبیاءؑ کا وجود تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر ظاہر ہُوا ہے اور قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رَحْمَةً وَّهُدًى (رحمت اور رہنمائی) کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے اور اسی لئے خاتمِ نبوّت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ والا صفات تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئی۔ خدا نے فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

اور ہم نے تجھ کو اے محمدؐ تمام دُنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

(الانبیآء : ۱۰۷)

تائید و نصرت انبیاءؑ جو مقصد لے کر آتے ہیں خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی سیرت اور اُن کی دعوت کی تاریخ خود اس دعویٰ پر گواہِ صادق ہے۔ قرآن نے کہا:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ○

(الصّٰفّٰت : ۱۷۱-۱۷۳)

اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لئے پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً انہی کی مدد ہوتی ہے، اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوتا ہے۔

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دِن بھی انہی کو اور اُن کے ذریعہ اہلِ ایمان کو کامیابی ہوگی:

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ○

(المؤمن : ۵۱-۵۲)

بے شبہہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دِن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ جس دِن گنہگاروں کو اُن کے بہانے کام نہ دیں گے، اُن پر پھٹکار ہوگی اور اُن کے لئے بُرا گھر ہوگا۔

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں جب اُن کو اپنی قوم کے قبولِ ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور اُمید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے اُن کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اُن کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعتہً اُمید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اِس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لئے کھول دئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آکر اُن کا استیصال ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَآءَھُمْ نَصْرُنَا

(یوسف : ۱۱۰)

یہاں تک کہ جب پیغمبروں کو (اپنی قوم کے ایمان سے) مایوسی ہونے لگی اور اُن کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ اُن سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آگئی۔

اللہ تعالیٰ کی اِسی تائید و نُصرت اور حفاظتِ دعوت کا یہ یقین اُن کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں۔ مخالفوں کی فوج و لشکر، تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے۔ منکروں کو شروع شروع میں اُن کی ظاہری بیچارگی اور تنہائی کو دیکھ کر اُن کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُن کے سُوءِ ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے:

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ مُخْلِفَ وَعْدِہٖ رُسُلَہٗ ط

(ابراھیم : ۴۷)

سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے اُن پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی:

کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ط

(المجادلہ : ۲۱)

اللہ لکھ چکا کہ مَیں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔

خاتمہ اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا:

فلسفی را از پیمبر واشناس — آبگینہ راز گوہر واشناس
آبگینہ را نہ پنداری بدست — جز دمے کہ گوہرے آری بدست
چوں گہر آمد بدستت شب چراغ — آبگینہ شد سیہ چوں پرِ زاغ!
فلسفی اندر بنِ چاہِ نژند — نردباں دارد بخورشیدِ بلند
نردبانش می برد تا چند ارش — پس بخاک افتد نگوں گشتہ سرش
واں پیمبر خود زبامِ آسماں — رشتہ ہا افگندہ سوئے خاکیاں
رشتہ جاں را بدیں رشتہ بتاب — پس برآ تا بارگاہِ آفتاب
ز آسماں پیغمبر آوازت دہد — فلسفی از خاک پروازت دہد

ایں زدورت رہ نماید سوئے جاں
واں نخواند خود ترا از کوئے جاں[۱]

---

[۱] از دیوانِ فارسی مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء۔

شبِ ظُلمت

پیمبرِ اسلام کی بعثت کے وقت دُنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت اُمس کے بعد ہی زیادہ خوش گوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شبِ تاریکی میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیئے کہ دنیا اُس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لئے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما سکے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا	جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا
یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ	کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے
اَیْدِیْہِمْ ۚ	ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔

(الفتح : ۱۰)

اسلام یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشرتی دعوت تھی۔ اس بنا پر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اُس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا

جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا۔ تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا۔ توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرّہ ذرّہ محروم تھا۔ مصر و یونان و روم میں سورج چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی۔ اُن ہی کے معبد تھے اور انہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹّی کے صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلّم تھے۔ رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو اور یہ تینوں کے تینوں تجرّد، رُہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضوِ معطّل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دستِ ترقّی شل ہو کر رہ گیا تھا۔ اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مترادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح علیہ اسلام نے چھ صدی قبل تزکیۂ نفس کے کچھ درس دیئے تھے۔ لیکن مدّت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ علیہ اسلام نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں چراغِ طور بھی جل کر گُل ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدّت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈھ نکالا تھا مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا۔ ہر قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا۔ حرص و طمع اور کُشت و خون کی گرم بازاری تھی۔ نفسِ انسانی کی ملکوتی طاقت جذباتِ خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی۔ عدل و راستی اور پاکبازی و پارسائی کے عطرِ معنبر کی خوشبو انسان کے جامۂ خاکی سے اُڑ چکی تھی۔ توحید اور خداپرستی کا نور دیوتاؤں، دیبیوں،

ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسّموں کی پرستش کی عالمگیر تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالَم کا مصلح، اخلاق کا معلّم، حق کا داعی، بنی نوع انسان کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصۂ دراز سے پراگندہ اور منتشر ہو رہا تھا پھر نظم و انتظام پیدا کر دے اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سرِ نو پُربہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا۔ تفصیل کے لئے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اُس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیئے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدّنی اور مذہبی حالت کیا تھی

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانۂ پارینہ بن چکی تھی۔ خود عرب و مضافات عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدّت گزری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبحِ سعادت کے طلوع کے وقت کون کون قومیں دنیا میں حکمراں تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے۔ اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا۔ اور روم کا مذہب عیسوی تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں برّاعظموں کو گھیرے تھا۔ لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوسِ فارس

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی جس کے تمدّن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوجِ کمال

پر تھا مگر عہدِ بعثت سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سارہ گیا تھا۔ مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ بادشاہوں کے ظلم و ستم اور امرا کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاص اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے، فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی۔ اُسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے۔ زرتشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزدان و اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی مسجود بنی۔ اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب[۱] نہ ہوا۔ اُس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اُس کو ویران برباد اور ترکِ ازدواج سے نسلِ انسانی کو منقطع کر دیا جائے تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے[۲] اخلاقی حیثیت سے محرکات کا وجود ہمیشہ اُن کے ہاں مختلف فیہ رہا۔ باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی[۳] یہ سُن کر کس قدر حیرت ہو گی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اُس کو قتل کر ڈالا[۴] عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جز ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آ سکتی ہے۔ عورتوں کی

---

[۱] کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی و کتاب البدو والتاریخ مقدسی ذکر فرقۂ مانویہ۔ [۲] تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی۔ [۳] تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی۔ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعلِ شنیع سے باز رکھا جائے (کتاب الخراج والامارۃ والفی جلد دوم)۔ [۴] مورخوں کی تاریخ عالم جلد ہشتم۔

بیوفائی، بداخلاقی اور ان پر عدمِ اعتماد پرانے ایرانی تمدّن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امراء درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے جن کو سجدے کئے جاتے تھے[1]۔ اُن کی اُلوہیت کے گیت گائے جاتے تھے۔ اُن کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اُن کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اُن کے جرائم پر اُن کو سزا نہیں دی جاسکتی تھی۔ رعایا اُن کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصّہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتشکدوں کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا۔ جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے۔ یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے تھے اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصۂ ایستر میں نظر آتا ہے۔ اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے اس کی تفصیل گبن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اوّل بن فیروز کے نام پڑا۔ بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا۔ آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا[2]۔ قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا۔ لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس کے عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی مِلک نہیں بلکہ اُن کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رُو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہو سکتی تھی۔ عیش پرست اور ہوس راں امرا اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی[3] قبول کیا۔ اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصّہ لیا۔ قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ

---

[1] غرر اخبار الفرس ثعالبی۔ [2] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد بست و یکم [3] غرر اخبار الفرس ثعالبی۔

سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہوگیا۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ خسرو نوشیرواں نے لی۔ ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے۔ مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کے بدولت ملا۔ مزدک کی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبانا اور کیشِ زردشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا۔ مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا۔ جو اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زرتشتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا۔

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا پایۂ تخت ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا۔ اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تغافل شعاری، امرا کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہی ہوتی گئی یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدینِ اسلام کی فتح مندی کی طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

اُوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمۂ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی۔ اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو اُن کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے۔ یزدان و اہرمن، نور و ظلمت اور خیر و شر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا۔ حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیّل خدائی کا ہم مرتبہ تھا۔ اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہؓ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالارِ ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جاکر اس کے برابر بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور مغیرہؓ کو سامنے سے ذلّت کے ساتھ اُٹھا دیا۔ انہوں نے جواب میں کہا "ہم عربوں میں دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں[۱]"

---

[۱] تاریخ طبری واقعاتِ ۱۴ھ۔

آنحضرتؐ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتشکدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اسی لئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا۔ جان ملکم جن کا مسیحی تعصب عساکر اسلامی کو ان کی زباں سے "قہرّاقانِ عرب" کا لقب دلواتا ہے، فتحِ فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں:

"یزدجرد ثالث کا عہدِ حکومت اس لئے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن "سوسمار خواروں" کے ایک دستہ نے اُلٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے۔ اس انقلابِ عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہوسکتا۔ (مسلمان) قاری مؤرخین کچھ تو اپنے حبِ وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزۂ عظیم خیال کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے خدا نے محمدؐ کی صداقت کو ظاہر کردیا۔ لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انھیں فوراً نظر آجاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہوچکی ہو، جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں، جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتوان ہو اور جو اپنی کبرسنی اور نقاہت سے تعرضِ زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو اس کے لئے پرجوش "قہرّاقانِ عرب" کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔"[1]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی، نقاہت و کمزوری "قہرّاقانِ عرب" ہی کی ترقی کی کیوں تمہید بنی؟ کیا نہتے عربوں کے پاس اُس سے زیادہ سامانِ جنگ اور سپاہی۔ جو عراق و ایران کے اخیر اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے؟ واقعہ یہ ہے کہ

---

[1] ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اوّل۔

زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی۔ نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی۔ "یزدان اور اہرمن" کی دو عملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کر دی تھی۔ بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجونِ مرکب تھا۔ آخر میں مزدک کی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا[1]۔ نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں "بادشاہ عادل و دادگر" کا خطاب بھی پایا۔ تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ اُبل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

عیسائی روم آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے، روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی۔ حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لئے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مرادف بن گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اسی سلطنت میں مبعوث ہو کر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سُنا کر رخصت ہوئے۔ اُن کے رفع و صعود کے بعد ہی اُن کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں۔ بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصلی عیسویت ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئی اور باپ بیٹے اور روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہو گیا۔ اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السّلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے[2]، وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدّعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے لعنت[3] قرار پائی۔ ۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و

---

[1] تفصیل کے لئے فہرست ابنِ ندیم دیکھو۔ [2] انجیل متی ۵۔ ۱۷-۱۸۔ [3] یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا تصریح مذکور ہیں۔

مغربی دو حصّے ہو گئے۔ مشرقی حصّہ کے تاجدار قسطنطینِ اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا۔ مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدارِ روم کے اس قبولِ مذہب کا جذبۂ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں، ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا۔ تختِ سلطنت کے غیر متوقّع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیّار کیا۔ اتّحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیرِ خاکستر آگ بھی زور شور سے شعلہ زن ہوئی۔ اعیانِ سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہو گئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا۔ بالآخر سلطنتِ روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر مختلف دعویدارانِ حکومت کے حصّہ میں آئی۔[1] ناقابلِ فرمانرواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ، وِنڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کئے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنتِ روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا، بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔[2] اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا، کہ ان کے مورثِ اعلیٰ نے جو بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانے کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ

---

[1] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، جلد اوّل۔ [2] گبن کی تاریخ زوال سلطنتِ روم، جلد دوم باب ۳۶ و باب ۳۸۔

سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا۔ مؤرخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے :-

"اس پیشین گوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج واقبال کے زمانہ میں کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت اور بدقسمتی کا سامنا تھا، اہلِ روم کو یاس آمیز جذبات سے پُر کر دیا۔ لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح ونمایاں موجود تھیں۔ رومن حکومت مخالفین کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالمانہ اور ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی۔ کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی اسی نسبت سے اُس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی۔ اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا"[1]

امرا نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہوگئی۔ محصول کی عدم ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اُس کے دِل میں حکومت کی طرف سے نفرت وعداوت پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر ہر وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی۔ امرا، وزرا اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے۔ غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں؛

"اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو اُن کی مجموعی معدومیت

---

[1] گبن کی تاریخ زوال سلطنتِ روم، جلد دوم باب ۳۶ و باب ۳۸۔

بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بربادی سے نہیں بچا سکتی تھی۔"[1]

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینوب سے لے کر دجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی، لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں چھ لاکھ پینتالیس ہزار تھی اب شاہ جسٹنین کے زمانہ (یعنی ۵۲۷ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی کل ایک لاکھ پچاس ہزار رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں۔ رعایا کی جیبیں خالی تھیں۔ فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور امرا و اعیانِ سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح کے حیل و فریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے۔ فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے لیکن میدانِ جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے۔ فوجی افسر فنِ جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کرے۔[2]

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہلِ روم کو ایک دم کے لئے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا۔ پھر لومبارڈس، گوتھس اور وینڈالس وغیرہ کے پیہم حملے رُوم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور (گبن کی زبان میں) اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہو گئی تھی جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام

---

[1] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، جلد دوم۔ [2] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، جلد سوم۔

عالم آباد تھیں مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں اور اب خالی تنہ خشک ہو رہا تھا۔ خود پایۂ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے۔ وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اب ویران اور سنسان پڑی تھیں عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں[1]۔

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطعِ نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے۔ بُت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنھوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی وہ بھی باپ بیٹا روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے۔ حضرت عیسیٰ اور مریم و روح القدس علیہم السلام کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ و جدل کی نوبت آگئی تھی۔ یہاں تک کہ ۴۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں پینسٹھ ہزار عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا[2]۔ اس جنگِ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آجاتی۔ پادریوں نے اپنے منصبِ مذہبی کو حصولِ جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا۔ اس بناء پر محض حبِ جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے۔ ان پادریوں کے ایک اسقفِ اعظم سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں اُن کی تفصیل کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر

---

[1] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، جلد سوم۔ [2] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، جلد سوم۔

غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا اور ان سب کو جلاوطن کر دیا۔ ان کا مال واسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین کے برابر کر دیئے گئے۔ سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا۔ ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گزر رہا تھا تو پانسو راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا[1]۔ سرل کی ایک خاتون دوست ہلیشیا نامی تھی۔ ایک روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آ رہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا۔ گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اسے کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا۔ نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور آلائشِ جسم کو آگ میں[2] ڈال دیا گیا، یہ واقعات ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے۔ مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا۔ یعقوبی نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی پناہ ڈھونڈھتے تھے۔ نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں انھوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ "شہزادۂ امن" کا مذہب ان جنگجویوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس جو پیغمبر اسلامؐ کو (نعوذ باللہ) بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں، اپنی "تاریخِ ہندوستان" میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

---

[1] گبن کی تاریخ زوال والخطاط سلطنت روم، جلد سوم۔ [2] گبن کی تاریخ زوال والخطاط سلطنت روم، جلد سوم نیز ڈریپر کی کی تاریخ معرکہ آرائی مذہب وسائنس۔

"اس نازک موقع پر (یعنی ظہورِ اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو نگل رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدہم۔ روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قعرِ فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی۔ یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہو جانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہو گئی تھی اور ہر اس تحریک کی مدد کے لئے تیار تھے جو ایسے قابلِ نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے۔ اہلِ فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پرجوش و ناروادار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے جنھوں نے ان کے معبود "آتش شمسی" کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھئے ہوئے معبودوں پر ماتم کر رہی اور ان کے انتقام کے لئے آمادہ اور مستعد تھی۔"[1]

مارس صاحب واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفسِ واقعات کی صحت اُن کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلّم ہے۔

بہر حال مؤرخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل مصر کو قابو میں لانے کے لئے کی گئی۔ جس سے حضرت مسیح علیہ السلام کے "وہی ایک ہے" کی تعلیم ہمیشہ کے لئے اُن کے مذہب سے مٹ گئی۔ ضعیف الاعتقادی اس درجہ

---

[1] مارس کی تاریخِ ہندوستان جلد اوّل۔

بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہوگئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی۔ ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے اُن کے معتقدان کو سجدے کرتے تھے۔[1] "مسیحؑ و مریمؑ روح القدسؑ اور حوارئین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر اُن کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانۂ بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بُت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔[2]"

سیل صاحب اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"گرجا کے پادریوں (CIERC) نے مذہب کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن و محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا۔ اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے۔ اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لئے باعثِ ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کئے گئے خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔

نیس کی کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہوگیا اور ایرنیس، سلبینس، نسطورنیس اور یوٹیکینیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔

مغربی چرچ میں ڈمیس اور اراسیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لئے قتل تک نوبت پہنچا دی۔ اور آخر ڈمیس کی فتح ہوئی۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نینس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ایک سو پینتیس آدمی قتل کیے ہوئے پائے گئے۔ اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے۔ اس لئے اس ذریعہ سے ان کو گرانبہا تحفے ملتے تھے۔ اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے

---

[1] سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ۔ [2] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن، مقدمہ۔

تھے۔ اوران کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان وشوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے جسٹنین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی۔ اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں اُس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی متبدل ہوگئی۔ ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اُڑاتے تھے۔

عقائد کی خرابی کے علاوہ روم و فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہوگئی تھیں۔ شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لئے مشہور تھے آنحضرتؐ کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ (GOTHS) لوگوں نے روند ڈالا تھا، یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے اُن کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔"

رومیوں نے عیسوی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا، اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"دونوں (عیسایت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر وشکر ہوگئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہوگیا، جس میں بُت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں[1]، جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے، متغیر ہوکر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہوگیا عقیدۂ تثلیث قدیم

---

[1] معرکہ مذہب وسائنس، ڈریپر۔

مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا .... مریم عذراؑ کو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا[۱]

اسی زمانہ میں ایک گروہ "مریمی" کے نام سے پیدا ہوا جو حضرت مریم علیہا السلام کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلاثہ کے اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا۔ جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آلِ عمران میں فرمائی ہے۔ اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کئے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کی رسوم مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگیں اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلافاتِ باہمی نہایت شدّ و مد سے پیدا ہوئے یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لئے حکومت کو بارہا دست اندازی کرنا پڑتی تھی۔ رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی[۲]

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصّہ کا حال تھا۔ مغربی حصّہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لئے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لئے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ایک سو سینتیس آدمی کام آئے[۳]۔ اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتسابِ زر، حصولِ لذائذ اور کسبِ جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں[۴]

---

[۱] معرکہ مذہب و سائنس، ڈریپر۔ [۲] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن، مقدمہ۔ [۳] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن، مقدمہ۔ [۴] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن، مقدمہ۔

سلاطین اور مذہب کے حاملین کے اخلاق کا پَرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی۔ لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بیدردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہو ولعب اور عیاشیوں میں اڑا ڈالتے[۵۱]

پوپوں نے اور اُن کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ پر شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ جو وہ زمین پر کھولتے تھے وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا۔ قرآن مجید نے اُن کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ[۵۲] (انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا)۔

دینداری کا سب سے اہم جزو تجرّد کی زندگی اور رہبانیت تھی۔ ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف و عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی۔ کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔ کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا۔ کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا۔ کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند کر لیا تھا۔ ماں، باپ، عزیز و اقارب، اہل و عیال، دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ کے کانٹے تھے۔ اُن سے پرہیز بلکہ ان سے نفرت کمالِ تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا[۵۳]

ہندوستان | دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی بااثر مذہب قائم تھا ایک ہندوستان

---

۵۱ سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن، مقدمہ۔ ۵۲ التوبہ ۳۱۔ ۵۳ تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔

بھی ہے۔ ہندوستان کے تمدّن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں۔ ایک اصلی ہندو ویدک عہد جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک رہا۔ دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار قبل مسیح تک رہا۔ تیسرا دور عقلیت جس میں حکماؤ عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ایک ہزار قبل مسیحؑ سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیحؑ کے نصف تک رہا۔ چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو پچاس قبل مسیحؑ سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا۔ پانچواں دور پُرانِک جس میں بجائے ویدیا گوتم بدھ کی تعلیمات کے پُرانوں کی تلقین پر عمل درآمد تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مؤرخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل تھیں :۔

(۱) شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا اب وہ حدِ اعتدال سے باہر ہو گیا چنانچہ ویدمیں جو تینتیس دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے تینتیس کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی [۱]

(۲) ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بُت پرستی علی العموم رائج ہو گئی [۲]

(۳) مندروں کے محافظین بداخلاقی کے سرچشمے تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے [۳]

---

[۱] آرسی دت کی "ہندوستانِ قدیم"، جلد سوم۔ [۲] آرسی دت کی "ہندوستانِ قدیم"، جلد سوم۔ [۳] آرسی دت کی "ہندوستانِ قدیم"، جلد سوم۔

(۴) ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی جو نظامِ معاشرت کے لئے تباہ کن تھی[۱]۔

(۵) عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا[۲]۔

(۶) قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری و حمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا۔ مثال کے لئے چند قوانین درجِ ذیل ہیں:۔

(الف) برہمن کو کسی حالت میں، خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضاء قطع کر ڈالنے چاہئیں۔ اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیئے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیئے[۳]۔

(۷) راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالتِ خمار میں جامۂ عصمت اُتار ڈالتی تھیں[۴]۔

(۸) شاہراہوں پر آوارہ گرد و جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا[۵]۔

(۹) خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی

---

[۱] آر سی دت کی "ہندوستانِ قدیم"، جلد سوم۔ [۲] آر سی دت کی "ہندوستانِ قدیم"، جلد سوم۔ [۳] آر سی دت کی "ہندوستانِ قدیم"۔ [۴] آر سی دت کی "ہندوستانِ قدیم"۔ [۵] آر سی دت کی "ہندوستانِ قدیم"۔

جاتی تھی۔ جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف اُن کی بہترین عبادت تھی۔

(۱۰) اوہام اور خیالاتِ فاسدہ، بھوتوں، پلیتوں اور سیکڑوں قسم کے ظنون واوہام اُن کا مذہب تھا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا ان کا دھرم تھا۔ بتوں دیوتاؤں، دیبیوں کا شمار اندازہ وقیاس سے باہر تھا، اور اُن کے افسانوں کا گیت ان کا ترانۂ حمد تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہاں آتے رہے انھوں نے تپسیا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر اُن کی حالت پر رحم وافسوس آتا ہے[۱]۔ اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں انھوں نے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں[۲] وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کے رُو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے[۳]۔ وہ بیوہ ہوکر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لئے قانوناً محروم کردی جاتی تھیں اور اسی لئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ درآتش ہونا پسند کرتی تھیں۔ لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں اُن کو خود اُن کے باپ بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کرڈالتے تھے یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کرکے اُن کی پوجا کرتے تھے[۴]۔ اور مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انھیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی۔ اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے۔ شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ

---

[۱] دیکھو ابوزید سیرافی کا سفرنامہ وآثار البلاد قزوینی۔ [۲] سفرنامہ ابوزید واحسن التقاسیم مقدسی۔ [۳] مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو۔ [۴] ستیارتھ پرکاش سملاس گیارہ۔

تعلیم وتربیت، تہذیب واخلاق اور دین وایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا۔ وید کی آواز بھی اُس کے کان میں پڑ جائے تو اُس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی۔ قانون کی بنیاد مساواتِ انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی۔ عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

اس مختصر خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ بدءِ اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس وروم ہو رہے تھے۔

یہود دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اس قوم سے ہو سکتی ہے جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحیٔ الٰہی کی امانت دار بنی۔ اسی لئے قرآن نے اُن سے کہا وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ[1] (اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الٰہی کے منکر نہ بنو)۔ مگر یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ سنگدل بھی ثابت ہوئی۔ اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اُس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا۔ قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا:

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ	ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان
(البقرۃ: ۷۴)	سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔

اُس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور اُن کی سرکشی پر اُن کے حق میں بددعا نہ کی ہو۔ چنانچہ قرآن مجید نے کہا:

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي	بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان

---

[1] البقرہ: ۴۱۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

(المائدہ: ۷۸، ۷۹)

پر داؤدؑ اور مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے۔ ان کا کام کتنا برا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے۔ زبور ۷۸ میں ہے:

"اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو.....

.....تاکہ آنے والی پشت سے وہ فرزند جو پیدا ہوں سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں بلکہ اس کے حکموں کو حفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں۔ نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے لگے نہ رہے۔.....باوجود اس سبب کے پھر انھوں نے گناہ کئے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا،.....لیکن انھوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریاکاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے۔ اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے۔ کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے .....کتنی بار انھوں نے بیابان میں اس (خدا) سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا۔.....تس پر بھی انھوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ داداں کے مانند بیوفائی کی۔ وہ

ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے۔"

زبور ۸۱ میں ہے :

"اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا۔ اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو۔ تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کر۔ خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا۔ اپنا منہ کھول کہ اُسے بھر دوں گا۔ پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا۔ تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔"

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤد علیہ السلام سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے متعلق یہ دعا کی کہ

"تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو۔ شریر تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے۔ تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے۔ تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کر دے گا۔ ..... اے خداوند اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو۔ میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر۔ ..... ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے۔ ..... اے خدا تو انھیں ملزم جان ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں۔ اُن کو اُن کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ اُنھوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔" (زبور ۔ ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا :

اے ریا کا فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھیری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پر بھیتر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری

ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے پر باطن میں ریا کار اور شرارت سے بھرے ہو۔"

"اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔ بس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو۔ اے سانپو! اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔" (متی ۲۳۔ ۲۷۔ ۳۳)

بعینہٖ یہی الزام قرآن نے بھی اُن کو دیا ہے:

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ (البقرۃ: ۶۱)

اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں اس لئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۹۱)

کہہ کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے تم قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے۔

آلِ عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ

بیشک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے

مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	ہیں جو اُن کو عدل و نیکی کی بات سمجھائے
اَلِيْمٍ ۝	تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سُنا
(آل عمران : ۲۱)	دے۔

سورۂ بقرہ آلِ عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملّت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا۔ ان کی مذہبی سنگدلی اور تعصّب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے پچاس۔ ساٹھ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرتناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس پُر درد داستان کو ان لفظوں میں انھیں یاد دلایا :

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ	گڑھے والے لوگ مارے گئے۔ بھڑکتی
ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا	آگ کے گڑھے جب وہ ظالم ان کے
قُعُوْدٌ ۙ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ	کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو
بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا	کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے ان
مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ	کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں
الْحَمِيْدِ ۙ ۝	والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔

(البروج : ۴-۸)

جزئیات کو چھوڑ کر کلّی طریقہ سے ان میں حسبِ ذیل نقائص تھے :۔

۱۔ ان کو اپنے محبوبِ خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہم سے قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا :

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط

(المائدۃ ۱۸)

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط

(البقرۃ: ۸۰)

اور کہا کہ ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی لیکن چند روز۔

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لئے خاص ہیں۔ قرآن نے کہا:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(البقرۃ: ۹۴)

کہدے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف اُن کے گھر کی چیز ہے کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں۔ قرآن نے اُن کے جواب میں کہا:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط

(الجمعۃ: ۴)

یہ خدا کی مہربانی ہے، وہ جس کو چاہے دے۔

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولتمندوں کی خوشنودی کے لئے اپنی باطل تاویلوں سے اَدلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتابِ الٰہی کا درجہ دیتے تھے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ

وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے

(المائدہ : ۱۳) ہٹا دیتے ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ○

(البقرۃ : ۷۹)

تو پھٹکار ہو اُن پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ وہ اُس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں، تو پھٹکار ہے اُن پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو اُن پر جو وہ کماتے ہیں۔

جو اُن میں ان پڑھ اور جاہل تھے، وہ اپنے سُنے سنائے قصّوں پر ایمان رکھتے تھے:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ○

(البقرۃ : ۷۸)

اور اُن میں بعض اَن پڑھ ہیں جن کو تورات کا علم نہیں لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں۔ وہ صرف اُن کے خیالات ہیں۔

احکامِ الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مُطابق حکم ہوتا اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پسِ پشت ڈالتے:

نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ۗ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

(البقرۃ : ۱۰۱)

جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب پسِ پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا

کیا جب جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش کے

كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ○ (البقرۃ: ۸۷)

موافق نہ ہو تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔

ایک دفعہ جب آنحضرتؐ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپؐ کی ملکی سرداری کو یک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپؐ کی عدالت میں لائے۔ آپؐ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے؟ بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ آپؐ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی۔ جب وہ لائے اور اس جرم کے متعلقہ حکم کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ ساری کا حکم چھپا دیا۔ مگر ایک نو مسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا۔ آپؐ نے فرمایا خداوندا میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مُردہ حکم کو زندہ کرے گا۔[1]

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار اُن میں گرم تھا۔ ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا۔ اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر اس کو چھڑا بھی لیتے تھے۔ قرآن نے کہا:

ثُمَّ أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَإِنْ يَّأْتُوكُمْ أُسٰرٰى تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ط أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ج (البقرۃ: ۸۵)

پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو۔ ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آئے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو۔ حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا۔ کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم، کتاب الحدود، و ابو داؤد باب رجم الیہودیین۔

۲۔ دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی۔ اس کی وجہ سے اُن میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہوگئی تھی۔ کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ	ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے مشرکوں سے بھی زیادہ۔ ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔

(البقرۃ: ۹۶)

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس قدر سختی اور بددیانتی کا برتاؤ کیا جائے وہ مذہبًا منع نہیں۔ قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہلِ کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہلِ کتاب کی نسبت فرمایا:

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○	کتاب والوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لئے دو وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں جب تک تم اُن کے سر پر کھڑے نہ رہو۔ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔

(آل عمران: ۷۵)

توراۃ میں "اپنے بھائی" کے علاوہ "اجنبی" سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ

یہود یہود سے نہ لیں اور اہلِ عرب جو یہود نہ تھے ان سے بھاری بھاری شرحِ سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ اُن کے علماء ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے۔ اس حرام خوری اور اُن کے علماء کی اس خاموشی پر اُن کو قرآن نے بار بار ٹوکا :

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○

(المآئدۃ : ۶۲-۶۳)

اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے کرتوت کتنے بُرے ہیں۔ اُن کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں باز رکھتے۔ ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ

(المائدۃ : ۴۲)

جھوٹ کو سُننے والے اور حرام کھانے والے ہیں۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ

(النسآء : ۱۶۱)

اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے، اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔

اسی لئے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کرکے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ ان سے ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے۔ خدا نے فرمایا :

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ

ہم نے توراۃ اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے مطابق نبی جو تابعدار

اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (المائدة ۴۴)	تھے یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے اور ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصّوں کو انھوں نے بچا رکھا تھا اُن میں سے فیصلہ کرتے۔

اس کے بعد اس کے احکام کے اجراء اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (المائدة : ۴۴)	اور جو خدا کے اُتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی لوگ کافر ہیں۔

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے۔ وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے۔ قرآن اُن کو خطاب کر کے کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (النساء : ۴۷)	اے کتاب والو! ہم نے جو اُتارا جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ط (النساء : ۴۸)	خدا شرک کو معاف نہیں کرتا، اور اُس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا	کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصّہ دیا گیا۔ وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ

هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ○

کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔

النساء : ۵۱)

وہم و خرافات پر ان کا ایمان تھا۔ تعویذ، گنڈا، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعلیم ہے[۱]۔ لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کے پھونکتے تھے[۲]

عرب سے باہر یہودی یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا۔ عرب کے اندر جو یہود زمانۂ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا۔ سودی کاروبار کرتے تھے۔ غریب عربوں کو اپنے گراں شرحِ سود اور قرضوں کے بار میں اس طرح دبائے تھے کہ اُن کی حالت اُن کے سامنے غلاموں کی سی تھی۔ اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا۔

محمد بن مسلمہ انصاریؓ اور ان کے رفقاء جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے، وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے۔ انھوں نے اس سے کہا "اے کعب! اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو دق کر ڈالا اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں"۔ اس نے کہا "خدا کی قسم مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بیزار ہو جاؤ گے"۔ انھوں نے کہا "میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رُخ پلٹتی ہے۔ میں تم سے کچھ غلّہ قرض لینے آیا ہوں"۔ اس نے

---

[۱] البقرہ : ۱۰۳۔ [۲] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب باب السحر۔

کہا "مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے"؟ انھوں نے کہا "تم بتاؤ کیا چاہتے ہو"۔ اس نے کہا "اپنی بیویاں گرو رکھو"۔ انھوں نے جواب دیا "ہم اپنی بیویاں کیسے گرو رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حُسن کا جواب نہیں"۔ بولا "اچھا تو اپنے لڑکوں کو گرو رکھو"۔ کہا "ہم اپنے لڑکوں کو کیسے گرو رکھیں۔ ان کی کوئی بے عزّتی نہ کرے۔ یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے۔ ہاں اپنے ہتھیار گرو رکھ سکتے ہیں"[۱]

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی۔ کوئی غیر عورت اگر اُن کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزّت بچنی مشکل ہو جاتی[۲]۔ کسی بچّہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے[۳]۔ علما اور پیشوایانِ دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اِس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔ لفظی موشگافیوں اور ظاہری دینداری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا۔ اسلام جو ابراہیمؑ حنیف کے ترانۂ توحید اور طور کی صدائے غیبی کی آوازِ بازگشت تھا، وہ اُن کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ بُرا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اِن مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں[۴]۔ اسلام کی اس مصالحانہ دعوت

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ	اے کتاب والو! آؤ اُس ایک بات پر ہم
سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ	سب متحد ہو جائیں جو ہم میں تم میں مشترک
اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا	ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ	اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں
دُوْنِ اللّٰهِ ؕ	اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے

---

[۱] صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف۔ [۲] دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب۔ [۳] صحیح بخاری جلد دوم باب من اقاد بحجر۔ [۴] نساء: ۵۱۔

کہا "مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے"؟ انھوں نے کہا "تم بتاؤ کیا چاہتے ہو"۔ اس نے کہا "اپنی بیویاں گرو رکھو"۔ انہوں نے جواب دیا "ہم اپنی بیویاں کیسے گرو رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حُسن کا جواب نہیں"۔ بولا "اچھا تو اپنے لڑکوں کو گرو رکھو"۔ کہا "ہم اپنے لڑکوں کو کیسے گرو رکھیں۔ ان کی کوئی بے عزّتی نہ کرے۔ یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے۔ ہاں اپنے ہتھیار گرو رکھ سکتے ہیں"[۱]

اس سوال و جواب سے اندازہ ہو گا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی۔ کوئی غیر عورت اگر اُن کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی[۲]۔ کسی بچّہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے[۳]۔ علما اور پیشوایانِ دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اِس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔ لفظی موشگافیوں اور ظاہری دینداری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا۔ اسلام جو ابراہیمؑ حنیف کے ترانۂ توحید اور طور کی صدائے غیبی کی آوازِ بازگشت تھا، وہ اُن کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ بُرا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اِن مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں[۴]۔ اسلام کی اس مصالحانہ دعوت

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ	اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ	سب متحد ہو جائیں جو ہم میں تم میں مشترک
إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا	ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن	اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں
دُونِ اللَّهِ	اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے

---

[۱] صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف۔ [۲] دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب۔ [۳] صحیح بخاری جلد دوم باب من اقاد بحجر۔ [۴] نساء: ۵۱۔

(آل عمران : ۶۴) کو اپنا رب بنائیں۔

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلے میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے (وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ[1]) اپنی دولت و ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ[2]۔ (خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں)۔ قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں، (وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ[3]) ان فقروں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزیں تھیں۔ اُن کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کہ کھو چکے تھے۔ ابراہیم یعقوب علیہما السلام کے خدا کے بجائے ہر جگہ وہ سونے چاندی کے ڈھیر ہی کو خدا بنائے ہوئے تھے۔ اُن کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اِس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بیتابانہ انتظار کر رہے تھے[4]۔ خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے توراۃ کے صحیفے بھرے تھے اور ان ہی سے سُن سُن کر یثرب کے اوس و خزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئی سے باخبر تھے[5]۔

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ

---

[1] التوبہ ۱:۳۰۔ [2] المائدہ: ۶۴۔ [3] البقرہ: ۸۸۔ [4] البقرہ: ۸۹ [5] سیرت ہشام ذکر بیعتِ عقبہ۔

اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے وطن کے افق سے نبوّت کی صبحِ سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطحِ زمین سے ایک سو بیس فٹ تھی تو اس کا پائے تخت مآرب اور اس کے اصلاع دفعتہً برباد ہو گئے۔ یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے[1]۔ قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیلِ عرم کہا ہے۔ اس سیلاب کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہو کر اِدھر اُدھر نکل گئے جس سے نظامِ سلطنت میں ضعف آگیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرماں روا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا رعایا نے بغاوت کی اور شاہِ حبش سے اعانت چاہی۔ اس نے ۵۲۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۶۰۳ء میں قبیلۂ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا اور یمن شاہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے اُن میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے، ایک سلطنت قائم کی۔ لیکن وہ فارس کے زیرِ اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی۔ دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو عیسائی خاندان کہلاتا ہے[2]۔ چونکہ یہ خاندان رومیوں

---

[1] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لئے اس کی تعیین میں کئی نظریے ہیں۔ ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا۔ اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے۔ آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا۔ (سلیمان)

[2] اکثر علمائے انساب کا بیان ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان)

کے زیر اثر تھا اس لئے رفتہ رفتہ عیسائی ہوگیا اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا۔ یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادیاں تھیں اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحبِ اقتدار اور صاحبِ حکومت تھے۔ باقی تمام ملک میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے تھے۔ لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ عرب زمانۂ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے۔ آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں اُن پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے۔ البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھَلَہ ہے۔ عرب شمال کے عرب جو ناباتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا، مثلاً زید اللّٰہی، عبداللّٰہی[1]۔ خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ	اور جو تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔ تم کہو، کہ خدا کا شکر ہے۔

(لقمٰن: ۲۵)

یہ اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں گو اللہ ان سب میں بڑا ہے۔ یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہوگیا کہ اور معبودوں کے انکار سے ان کو اُسی قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے

---

[1] مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا جلد اوّل بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

انکار سے ہو سکتا تھا۔ بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرّہ کی ضرورتیں ان ہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر ان ہی خداؤں سے پڑتا تھا اس لئے اللہ کا خیال کچھ یونہی سا رہ گیا تھا۔ ان ہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے، ان ہی پر قربانی چڑھاتے تھے، ان ہی سے حاجتیں مانگتے تھے۔ اللہ تو زمین و آسمان بنا کر بے کار سا ہو چکا تھا۔ جو کچھ کرتے تھے یہی خدایانِ اصغر کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ	اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ
قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ	لوگ جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں ناک
وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ	بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن جب خدا کے
يَسْتَبْشِرُوْنَ ○	سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے
(الزمر: ۴۵)	تو دفعۃً وہ کھل جاتے ہیں۔

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش ہوگا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى	ہم ان بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ
اللّٰهِ زُلْفٰى ط	ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔

(الزمر: ۳)

ملائکہ کی اُلوہیت | شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اُس کے بال بچے بھی ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ	جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے
لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ○	وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے

(النجم : ۲۷)

ہیں۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ○ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ○

تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔

(النجم : ۲۱-۲۲)

اس لئے جس طرح بعض یہود حضرت عزیز علیہ السلام کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے، وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھ کر اُن کی الوہیت کے بھی قائل تھے:

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ

اور نہ خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔

(اٰل عمران : ۸۰)

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ؕ ○ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ○

اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا۔ بیشک انسان کھلا نافرمان ہے۔ کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لئے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر عزت دے۔

(الزخرف : ۱۵-۱۶)

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ

اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، لڑکیاں قرار دیا۔ کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے؟ ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی۔ اور کہتے ہیں کہ اگر خدا نہ چاہتا

(الزخرف : ۱۹-۲۰)

تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنٰتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝

تو اُن سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور اُن کے لڑکے ہوں۔ کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا اور وہ حاضر تھے۔ ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔

(الصّٰفّٰت : ۱۴۹-۱۵۲)

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے۔ خدا نے اس کی تردید میں کہا:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ اُن کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

(النجم : ۲۶)

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے:

ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝

پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تم ہی کو پوجتے تھے۔

(سبا : ۴۰)

جنات کی اُلوہیت فرشتوں کی طرح وہ جنّات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے:

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ط (الصّٰفّٰت : ۱۵۸)

اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی۔

اسی لئے وہ جنات کو خدا کی خدائی میں شریک کرتے تھے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ط (الانعام : ۱۰۰)

انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں۔ اور وہ بن جانے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں۔

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو اُن کی عبادت اور پرستش بھی ضروری ہوئی۔ چنانچہ جاہلیت میں اہلِ عرب ان جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے[۱]۔ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۔ (بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں سے اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے)۔ مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دُہائی پکار لیتے تھے۔ قرآن میں ہے "وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝ (اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دُہائی پکارکرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا)۔ چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے اُن کے نام کی قربانی کی جاتی تھی۔ ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا، جہاں کے رہنے والے جنوں (سکّان الدراہم) پر جانور ذبح کرکے چڑھائے جاتے تھے، تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں[۲]۔ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی، اور کلبی کا بیان ہے کہ انہی کے متعلق یہ آیت اُتری ہے[۳]:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

خدا کو چھوڑ تم جن کو پکارتے ہو، وہ تمہاری

---

[۱] صحیح مسلم کتاب التفسیر۔ [۲] لسان العرب لفظ "سکن"، [۳] کتاب الاصنام ہشام الکلبی

عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ہی طرح بندے ہیں۔

(الاعراف: ۱۹۴)

بُت پرستی جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے اُن کے بُت بنا لیئے تھے اور جا بجا عظیم الشان بتکدے قائم ہو گئے تھے۔ یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا اُٹھا لیا اور اُس کی پرستش شروع کر دی۔ اُس سے زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے۔ جہاں کوئی پتھر نہ ہاتھ آیا خاک کا ایک تودہ بنا لیا۔ ایک بکری لا کر اس کا دودھ اس پر دوہا پھر اس کے گرد طواف کیا۔ اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

اس بُت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلۂ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا، ایک دفعہ بلقاء گیا۔ وہاں لوگوں کو بُت پرست دیکھ کر بُت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لا کر کعبہ میں نصب کیا۔ چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا اس لئے تمام عرب نے بُت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے۔ ان میں ہبل سب سے بڑا تھا۔ اس سے اُتر کر منات، لات اور عزّیٰ تھے۔

منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا۔ انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے اور قبائل اسی کا حج کرتے تھے۔ کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آکر اتارتے تھے۔ حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے۔ عبد العزیٰ مزنی کہتا ہے[1]۔

انی حلفت یمین صدق برة	میں نے منات کی سچی قسم کھائی۔ اہلِ خزرج
بمنات عند محل آل الخزرج	کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔

---

[1] یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ منات میں ہے۔

لات قبیلۂ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا۔ اہلِ طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔

عزّیٰ ایک درخت تھا۔ اس کے پاس ایک بُت تھا۔ یہ قبیلۂ غطفان کا بت تھا۔ لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے۔ قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے[1]:

واللات والعزّیٰ ومناۃ الثالثۃ	لات، عزیٰ اور تیسرا منات یہ بڑے برگزیدہ
الاخریٰ۔ انھن الغرانیق العلیٰ	ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں
وان شفاعتھن لترجی	اُمید ہے۔

بُت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دیں۔ جانوروں سے گذر کر انسانوں کی قربانیاں اُن پر چڑھائی جانے لگیں۔ آنحضرتؐ کے جدّامجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحبزادہ (عبداللہ) کی قربانی کرنی چاہی تھی وہ اسی کہنہ رسم کی تقلید تھی۔

بحیرۃ، سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے۔ کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے[2]۔ بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے۔ ان میں سے ایک پر "ہاں"، ایک پر "ناں" لکھا رہتا تھا۔ جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے "ہاں" کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسم کی تھیں۔ اصنام واوثان انصاب اور بیوت۔ اصنام واوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے، یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے۔ اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بعیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالہ سے بنتے تو ان کو دُمیہ کہتے۔ انصاب اور

---

[1] معجم البلدان، لفظ لات وکتاب الاصنام للکلبی۔ [2] نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام۔

نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کر کے اُن پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے۔ بیوت جس کا واحد بیت ہے، چند گھر تھے جیسے رضا، رئام، تلیس وغیرہ جن میں بُت پرستانہ رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ جن بتوں کے اردگرد چکر لگاتے تھے ان کو دَوّار کہتے تھے اور اُن پر جو قربانی کی جاتی تھی اس کو عتیرہ کہتے تھے۔ پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجمہ کہتے تھے۔ جاہلی شاعر کہتا ہے ؏

کما طاف بالرجمۃ المرتجم — جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنے والا طواف کرے[1]

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی ان کی کوئی انتہا نہ تھی ؏

قبیلہ قبیلہ کا اک بت جدا تھا

خاص خانۂ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بُت[2] تھے۔ ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں: لات، عزیٰ، مناۃ، یغوث، یعوق، نسر، ودّ، سواع، بعل لیکن جاہلیات کے پُرانے مؤرخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعراء کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کئے ہیں۔ ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جواب مصر میں چھپ بھی گئی ہے، تقریباً تیس بتوں کے نام ہیں۔ علامہ نکی پاشا جنھوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے، اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں۔ یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں ان میں المقہ، عشتار، نکرہ، قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے۔ میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں:۔

---

[1] ان الفاظ کے لئے دیکھو لسان العرب۔ [2] صحیح بخاری باب فتح مکہ۔

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف
عزّیٰ	قریش و بنو شیبان بن جابر
منٰاۃ	اوس و خزرج اور عام عرب
یغوث	بنو مذحج و اہلِ جرش
یعوق	بنو ہمدان و اہلِ خیوان
نسر	حمیر
ودّ	بنو کلب
سواع	بنو لحیان
اساف	بُت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی
نائلہ	بت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی
اُقیصر	قضاعہ و لخم و جذام، عاملہ و غطفان
باجر	ازد و طی و قضاعہ
ذوالخلصہ	بنو امامہ، خثعم، بجالہ، ازد السراۃ
رُضاء یا رُضی	بنو ربیعہ کا بت خانہ
رئام	حمیر کا بت خانہ
سبحہ	ایک بُت
سعد	بنی ملکان بن کنانہ
سُعَیر	عنزہ

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف
عزّیٰ	قریش و بنو شیبان بن جابر
منٰاۃ	اوس و خزرج اور عام عرب
یغوث	بنو مذحج و اہلِ جرش
یعوق	بنو ہمدان و اہلِ خیوان
نسر	حمیر
ودّ	بنو کلب
سواع	بنو لحیان
اساف	بُت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی
نائلہ	بت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی
اُقیصر	قضاعہ و لخم و جذام، عاملہ و غطفان
باجر	ازد و طی و قضاعہ
ذوالخلصہ	بنو امامہ، خثعم، بجالہ، ازد السراۃ
رُضاء یا رُضی	بنو ربیعہ کا بت خانہ
رئام	حمیر کا بت خانہ
سبحہ	ایک بُت
سعد	بنی ملکان بن کنانہ
سُعَیر	عنزہ

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
ذوالشریٰ	بنو حارث
عائم	ازد السراۃ
عم انس (یا) عمیانس	خولان
قلس .	طی
ذوالکفین	بنو دوس
مناف	قریش
نُہم	مزینہ
ہُبل	قریش
بَعْل	قبائلِ بنی عدنان
یعبوب	جدیلہ (بنی طی)
اشہل	بنو عبدالاشہل
اوال	بکر و تغلب
بس	غطفان کا بت خانہ
بعیم	ایک لکڑی کا بُت
بلج	ایک بُت
جبہ	ایک بُت
جُرَیش یا جَرِیش	ایک بُت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے
جَلسد	ایک بُت کا نام

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
جِہار	ہوازن کا معبود
دار	بنو عبدالدّار
دوار	ایک بُت کا نام
ذوالرّجل	حجاز کا ایک بُت
شارق	ایک بُت کا نام جس کی طرف عبدالشارق کی نسبت ہے
شمس	بنو عبد شمس
صدا	عاد کا بُت
صمودا	عاد کا بُت
ضمار	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ
ضیزن	منذر اکبر
عبعب	قضاعہ
عوض	بکر بن وائل
عوف	ایک بُت کا نام
غبغب	اس پر جانور ذبح کئے جاتے تھے
فرّاض	سعد العشیرہ
کثریٰ	جدیس وطسم
کسعہ	ایک بُت کا نام
محرّق	بکر بن وائل

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
مدان	عبدالمدان
مرحب	حضرموت
منہب	ایک بُت کا نام
ہبا	عاد
ذات الوَدُع	ایک بت کا نام
یالیل	عبد یالیل

ستارہ پرستی عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا۔ مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔ اُن میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے۔ اسی لئے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ — نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔

(حٰمٓ السجدۃ : ۳۷)

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو دیبی مانتی تھی۔ یمن کے بادشاہ شمر یُرعش نے سورج دیبی کا مندر بنوایا تھا[1] سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعریٰ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اسی لئے قرآن پاک نے کہا:

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ○ — اور وہی خدا شعریٰ کا مالک ہے۔

(النجم : ۴۹)

صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسبِ ذیل

---

[1] تاریخ الملوک الارض حمزہ اصفہانی۔

قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے:۔

قبیلۂ حمیر سورج کو پوجتا تھا۔ کنانہ چاند کو، تمیم وبران کو، لخم اور خدام مشتری کو، طی سہیل کو، قیس شعری العبور کو اور اسد عطارد کو۔[1]

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت | جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے۔ وہ جن شیطان اور بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے گو اختلافِ صورت اور اشغال کی وجہ سے اُن کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے۔ جو اجنّہ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں یا لباس، بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے اُن کا نام غول تھا۔ یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

عبید بن ایوب الغیری ؎

وغولا قفرۃ ذکروا انثی	اور بیابان کے دو غول مرد بھی اور عورت بھی
کان علیھما قطع البجاد	گویا کہ اُن دونوں پر کمل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔

مؤنث کو سعلاۃ کہتے تھے ؎

رل وسعلاۃ وغول بقفرۃ	میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان
اذا اللیل واری الجن فیہ اربّت	میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو بھوت اُس میں آواز دیتے تھے۔

عمرو بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا۔ اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوتی تھی۔ راجز کہتا ہے ؏

یاقاتل اللہ بنی السعلاۃ	خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے۔

---

[1] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی۔

بلقیس ملکۂ یمن (اُن کے زعم میں) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی۔

یہ اکثر گاتے بجاتے تھے اور اہلِ عرب اُن کے نغموں سے محفوظ ہوتے تھے ؎

کم حببت دونك من بهماء مظلمة	کتنی اندھیری گھپ راتوں میں مَیں نے
تنیه اذا ما مغنی جنه سمرا	صحرا کو قطع کیا جب وہاں کے جنّات کا مغنّی افسانہ گوئی کر رہا تھا۔

یہ صحرانشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ جاڑوں میں جب بدّو آگ جلا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی آگ تاپنے کو آجاتے تھے لیکن جب اُن کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے ؎

اتوا نارى فقلت منون انتم	وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے
فقالوا الجن قلت عموا ظلاما	کہا تم کون ہو انھوں نے کہا ہم جن ہیں میں
دعوت الى الطعام فقال منهم	نے کہا اس تاریکی میں خوش رہو۔ میں نے ان
زعيم نحسد الانس الطعاما	کو کھانے کے لئے بلایا تو اُن میں سے ایک سردار نے کہا ہم انسانوں کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی، بقار اور عبقر تھے۔

ع۔ جن البدي رواسيا اقدامها	بدی کے جن، جن کے قدم جمے تھے۔
ع۔ تحت السنور جنة البقار	زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے۔
ع۔ عليهن فتيان كجنة عبقر	اور اُن پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔

اُن کے اقسام حسب ذیل تھے :۔

جو آدمیوں کے ساتھ مل جُل کر رہتے تھے اُن کو عامر کہتے تھے۔

جو بچّوں کو ستاتے تھے اُن کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے اُن کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کے جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچّوں اور جوانوں کو اٹھا لے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے۔ یہ ان کو اُٹھا لے گئے اور پھر اُن کا پتہ نہ لگا۔ عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد جذیمہ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصّہ ہے جس کو جن اٹھا لے گئے تھے۔ مدّت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان[1] کرتا تھا۔

ان اجنّہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلّقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں سے تابّط شرًّا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور ہیں۔ طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت کو مار ڈالا تھا۔ اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں ؎

لقیت الغول تنہی فی ظلام	میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے
.....	میں چلتے ہیں۔
فصدّت وانتحیت لها بغضب	تو اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی
حسام غیر مؤتشب یمانی	اصیل تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا۔
فقد سراتها والبرد منها	تو اُس نے اس کے سر کو اور اس کی زرہوں

---

[1] شمائل ترمذی باب السمر۔

فخرت للیدین وللجران[1] — کو کاٹ ڈالا اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لئے قرآن نے قیامت کے اس سوال وجواب کا انداز اختیار کیا کہ ان کے دوست انسان وہاں بھی اُن کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلاء تھا۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓـُٔهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ

اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا۔ اور ان کے دوستدار انسان بولے اے ہمارے رب! ہم میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔

(الانعام : ۱۲۸)

کہانت کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے۔ اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن[2] رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے۔ وہ اپنی شکل وصورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گذرا۔ انھوں نے قیافہ سے پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے۔ اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی۔ اس نے کہا میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا:

الم تر الی الجن وابلاسھا — کیا تم جنوں کی سراسیمگی، ان کی ناامیدی

---

[1] بقیہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے۔ اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں۔ دیکھو کتاب مذکور۔

یاسہا من بعد انکاسہا ولحوقہا	اور ان کے کاروبار کی ابتری نہیں
بالقلاص و احلاسہا۔	دیکھتے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ ہے۔ میں ایک روز زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لاکر ذبح کیا۔ اس کے بعد ایک شخص زور سے چلّایا:

یاجلیح! امر نجیح رجل فصیح	اے جلیح! کامیاب امر! ایک فصیح شخص
یقول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔	لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہتا ہے

اس کے چند ہی دنوں کے بعد آنحضرتؐ کی بعثت[1] ہوئی۔ صحیح بخاری (تفسیر سورۂ والضحیٰ) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات کو عبادت کے لئے نہیں اُٹھے۔ اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آکر آنحضرتؐ سے کہا:

انی ارجوان یکون شیطانک قد	میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو
ترکک۔	چھوڑ دیا۔

یہ وہی خیال تھا۔ چونکہ کفار آپؐ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لئے ان کا خیال تھا کہ آپؐ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے۔ قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:۔

ھَلْ اُنَبِّئُکُمْ عَلٰی مَنْ تَنَزَّلُ	کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر
الشَّیٰطِیْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ	اُترتے ہیں؟ شیطان ہر جھوٹے گنہگار
اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ ۝ یُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ	پر اُترتے ہیں۔ وہ سُنی سنائی بات
اَکْثَرُھُمْ کٰذِبُوْنَ ۝	القا کرتے ہیں اور اکثر وہ جھوٹے

---

[1] صحیح بخاری جلد اوّل۔

(الشعراء : ۲۲۲-۲۲۳) ہوتے ہیں۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بناء پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا۔ ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزیٰ بہت مشہور تھے۔ جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کئے ہیں:

والارض والسماء والعقاب	قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور
والصقعاء! واقعۃ ببقعاء لقد	آفتاب کی۔ ایک واقعہ میدان میں واقع
نفر المجد بنی العشراء للمجد	ہوا کہ بزرگی بنو عشراء پر غالب آگئی بوجہ
والسناء۔	بڑائی اور بلندی کے۔

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف کے مقفّٰی اور مسجّع فقرے ہوتے اس لئے جب ایک دفعہ آنحضرتؐ کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا اور آپؐ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا:

ارأیت من لا شرب ولا اکل	غور فرمایئے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا نہ
ولا صاح فاستھل ایبس دمہ	چیخا نہ رویا کیا اس کا خون معاف نہ
یطل؟	ہوگا؟

آپؐ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے[1]۔ یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے۔ جب لوگ اُن سے غیب کی بات پوچھتے یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے۔ مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں۔ یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے

---

[1] صحیح مسلم دیۃ الجنین و صحیح بخاری باب الکہانۃ۔

کے لئے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے۔ یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے وہ علانیہ اپنے خدع و فریب کا اعتراف کرتے تھے[۱] ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا یعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کے لئے تحفہ۔ اسلام نے آکر اس کو روک دیا[۲]۔

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سیکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

شعرا کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے۔ چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ عمرو کی بیٹی تھی اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا، اس کے شیطان کا نام مسحل تھا۔ اعشیٰ خود کہتا ہے ؎

دعوت خلیلی مسحلا و دعوالہ	میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انھوں
بجھنام یدعی للھجین المذمم	نے اس کے لئے جہنام کو پکارا۔ اور یہ کمینہ بدلطوار
حبانی اخی الجنی نفسی فداءہٗ	کے لئے بلایا جاتا ہے۔ مجھ کو میرے جن دوست نے
بافنج جیاش العشیات مرجم[۳]	میری جان اس پر فدا ہو شاموں کے وقت
	سب سے بڑے جوش مارنے والے اور سخت
	پتھراؤ کرنے والے کو دیا۔

جو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوتا تھا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا۔ ابو النجم کہتا ہے ؎

انی وکل شاعر من البشر	ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے مگر میرا

---

[۱] بخاری جلد اوّل کتاب الطب، باب الکہانۃ۔ [۲] صحیح بخاری جلد اوّل کتاب الطب باب الکہانۃ۔ [۳] اعشیٰ کے دیوان مطبوعۂ ویانا میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرعہ اس طرح ہے جھنام جدعا للھجین المذمم۔

شیطانۃ انثیٰ و شیطانی ذکر — شیطان مذکر ہے۔

شنقنان اور شیصبان روسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے۔ ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے ؎

ولی صاحب من بنی الشیصبان — میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے تو کبھی میں

فطورا اقول و طورا ھوہ — شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔

اوہام پرستی سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آکر بدلہ لیتا ہے[۱]۔ یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہامہ کہتے تھے۔ یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے۔ جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے۔ مثلاً اس وقت کوئی پرند داہنی جانب سے اُڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اُڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے۔ بکری کے جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بُت پر چڑھا دیتے۔ اونٹنی جب دس بچے جَن لیتی اس کو چھوڑ دیتے۔ وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔

کسی شخص کے پاس جب اونٹوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی ایک آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر نہ لگ جائے۔ جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑیا دنبہ کی دم میں گھانس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا۔ سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورا باندھ کر گرہ لگا دیتے۔ واپس آکر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی۔ سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے اُلٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے گا[۲]۔ یہ خیال تھا کہ جو شخص لات و عزیٰ کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے[۳]۔ ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی

---

[۱] ابوداؤد جلد سوم۔ [۲] یہ باتیں بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ [۳] مسند دارمی۔

پہنتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے۔[1]

اس قسم کے سیکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو اُن کے مذہبی حالات و خیالات تھے۔ ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی اُن کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگجوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگجوئی ذرا ذرا سی بات پر لڑ مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا اُن کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسرپیکار تھا۔ ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا۔ ان ہی لڑائیوں کو مؤرخین اور اہلِ ادب ایّام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ایک سو تیس لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے:۔

هذا الفن لا يتقصاء الاحصاء	یہ فن شمار کا استقصاء نہیں کر سکتا اس لئے
فاقتصرت على ما ذكرت	جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اسی پر میں نے قناعت کی۔

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں۔ ان میں سب سے مشہور لڑائی عبس و ذبیان کی ہے۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دو قبیلوں کے دو گھوڑے حس اور غبراء کا باہمی مقابلہ تھا۔ ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی

---

[1] ابن ماجہ اریق التمائم، ابواب الطب۔

کی اور لڑائی ہو پڑی۔ یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی۔ دوسری مشہور لڑائی حربِ بسوس ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کے چراگاہ میں جا پڑی۔ کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کیا۔ اس بات نے قبیلہ میں آگ لگا دی۔ کلیب جان سے مارا گیا اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی۔ عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا۔ چند روز کے بعد موقع پاکر ایک قتل کر دیا گیا۔ اس کے انتقام میں خون کی ندیاں بہ گئیں۔ بکر و تمیم میں ایک چراگاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی۔ اوس و خزرج مدینہ کے دونوں قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں اُن میں سب سے مشہور یومِ بُعاث ہے جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے۔ اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا۔ قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایامِ فُجار ہے۔ ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی۔ قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا[1]۔ ان میں لڑنا اور مر جانا اور مارنا جاہلیت کا شرف اور قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ ان لڑائیوں میں سفاکی، بیرحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

شراب خواری شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے، عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میکدہ بن گیا تھا۔ اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا ان کے نام یاد رکھے گئے ہیں۔ دوست احباب کسی گھر میں جمع ہوتے۔ شراب کا دور چلتا ساتھ ہی جُوا کھیلتے۔ اُس میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی۔ جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کر کے کھلا دیتا۔ کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب

---

[1] ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لئے دیکھو عقد الفرید ابن عبد ربہ جلد سوم اور امثال میدانی لفظ "یوم"۔

خانہ اُٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا۔ لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے کھِلاتے اور اپنی اِس بیجا فیاضی پر فخر کرتے رہتے۔ سامنے فاحشہ مغنّیہ عورتیں گاتی بجاتیں اور وہ اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے۔ جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے ؎

فان تبغنی فی حلقۃ القوم تلقنی　　وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد

پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائے گا　　اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

متی تاتنی اصبحک کأسا روّیۃ　　وان کنت عنہا غانیا فاغن وازدد

جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر آئے تو جا اور بے نیازی کر۔

ندامای بیض کالنجوم وقینۃ　　تروح الینا بین برد ومجسد

میری محفلِ شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں اور ایک مغنّیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔

رحیب قطاب الجیب منہا رفیقۃ　　بجس الندامی بضۃ المتجرد

اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے۔ شرابی رفیقوں کی دست درازی سے مانوس اور اس کے بدن کے برہنہ حصّے لطیف ہیں۔

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا　　علی رسلہا مطروقۃ لم تشدّد

جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سُناؤ، تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

وما زال تشرابی الخمور ولذتی　　وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار رہا۔

ولولا ثلاث هن من لذّة الفتی وجدك لم احفل متی قام عودی

اور اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطفِ ذوق ہیں تو تیری قسم میں اپنی موت کی پروا نہ کرتا۔

فمنهن سبقی العاذلات بشربة کمیت متی ما تغل بالماء تزبد

ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کیئے بغیر سرخ و سیاہ رنگ کا پیالہ پی لینا جس میں پانی پلانے سے جوش آئے۔

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب ببهنکة تحت الخباء المعمد

اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے، کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرنا۔

کریم یروی نفسه فی حیاته ستعلم ان متنا غدا ایّنا الصدی

میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کے سیراب کرتا ہے۔ موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیارا کون ہے۔

وبرك هجود قد اثارت مخافتی بوادیها امشی بعضب مجرد

اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا جب میں تلوار لے کر چلا۔

فمرت کهات ذات خیف جلالة عقیلة شیخ کالوبیل بلندد

تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی، جو لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا، قیمتی چیز تھی، سامنے آگئی۔

وقال الا ماذا ترون بشارب شدید علینا بغیه متعمد

اور جب میں نے تلوار سے کونچیں کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا تو اس نے بڈھے نے کہا کہ اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ہم پر ظلم کر رہا ہے۔

فظل الاماء یمتللن حوارھا　　وتسعیٰ علینا بالسدیف المسرھد

تو لونڈیاں اونٹنی کے بچہ کو جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے کہتا ہے ؎

بل انت لا تدرین کم من لیلۃ　　طلق لذیذ لھوھا وندامھا

بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پُر لطف تھی۔

قد بت سامرھا وغایۃ تاجر　　وافیت اذ رفعت وعز مدامھا

میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب فروش کی منزل میں آتا جاتا رہا۔ جب جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہو گئی۔

اغلی السباء بکل ادکن عاتق　　اوجونۃ قدحت وفض ختامھا

میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا۔ پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم کو خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑ دی جاتی۔

وصبوح صافیۃ وجذب کرینۃ　　بموتر تئتا له ابھا مھا

اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔

بادرت حاجتھا الدجاج بسحرۃ　　لاعل منھا حین ھب نیامھا

میں نے شراب کی ضرورت مرغِ سحر کی آواز سے پہلے پوری کی تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دُہرا لوں۔

تغلب اُن قبیلوں میں تھا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بُری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہی عیسائیوں

کے ملک شام سے ہوتی تھی۔ تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے ؎

الا ھبّی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

ہاں اپنا پیالہ لے کر اُٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندریں (شامی گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔

مشعشعۃ کان الحص فیھا اذا ما الماء خالطھا سخینا

پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔

تجور بذی اللبانۃ عن ھواہ اذا ما ذاقھا حتی تلینا

غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے اگر اس کو چکھ لے۔ یہاں تک کہ اُس کو نرم کر دے۔

تری اللحر الشحیح اذا امرّت علیہ لمالہ فیھا مھینا

تنگدل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گزار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔

صبنت الکاس عنا ام عمرو وکان الکاس مجراھا الیمینا

اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف تھا۔

وما شر الثلثۃ ام عمرو بصاحبک الذی لا تصبحینا

حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بدتر نہیں۔

وکاس قد شربت بیعلبک واخری فی دمشق وقاصرینا

اور کتنے پیالے بعلبک میں پیئے اور کتنے دمشق اور قاصرین میں۔

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا۔ شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لئے وہاں جھنڈا اُڑا کرتا تھا جس کو غایۃ کہتے تھے۔ (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ "شراب فروشی" کا

مترادف بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمیئہ کہتا ہے ؎

اذا اسحب الریط والمرحل الی ادنیٰ تجاری وانفض اللمما

یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانہ میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔

بدر میں قریش کے دولت مند رؤسا مارے گئے تھے۔ ان کے مرثیے میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزمِ شراب اور مجلسِ رقص و سرور کی بربادی کا ماتم کرتا ہے ؎

وماذا بالقلیب قلیب بدر من القینات والشرب الکرام[1]

بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔

شراب کے رواجِ عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں اور گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے۔ یہ شعر اوپر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے ؎

صبنت الکاس عنا ام عمرو — اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔

وکان الکاس مجراھا الیمینا

حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کمسنی میں یہ سنا کرتا تھا اسقنا کاسا دھاقا (شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا)[2]

صحیح بخاری کتاب الاشربۃ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی ہے

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ، جلد اوّل [2] صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ جلد اوّل۔

تو اُس وقت ایک مجلس قائم تھی جس میں حضرت ابو دجانہؓ، ابو طلحہؓ، سہیل بن بیضاء شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کمسن تھا، ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت[1] سے ہوگا جو حرمتِ شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ کو مالِ غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی۔ خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرتؐ نے عطا فرمائی۔ حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے ہو چکا تھا اور وہ دعوتِ ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے۔ ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھانس کا نام ہے) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں۔ اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لیئے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے۔ لوگوں سے پوچھا یہ کس کا کام ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہؓ چند انصار کے ساتھ شراب پی رہے تھے۔ ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا ؎

الا یا حمز للشرف النواء — اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لیئے۔

حضرت حمزہؓ تلوار لے کر اُٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لیئے۔ حضرت علیؓ نے جا کر آنحضرتؐ کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا۔ آنحضرتؐ نے چادر اوڑھی اور حضرت علیؓ اور زیدؓ کو لے کر حضرت حمزہؓ کے پاس گئے۔ حضرت حمزہؓ مخمور تھے۔ آنحضرتؐ کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور کہا "تم سب میرے باپ کے غلام ہو"۔ آنحضرتؐ یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہؓ نے ۳ھ میں شہادت پائی ہے۔ اُس وقت تک شراب حرام نہیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی، غزوۂ بدر۔

ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا۔ کس طرح وہ مقبولِ عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنائے اور اشارے سے گذر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابو داؤد کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا "اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے"۔ ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں :۔

اللّٰھم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء	اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کر دے۔

اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اُتری :۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ط قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا ط	لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں۔ کہدو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر ہے۔

(البقرۃ : ۲۱۹)

اس آیت کے اُترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ کی دعوت کی شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔

ایک صاحب[۱] نے امامت کی۔ مگر نشہ کے خمار میں قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کی سورۃ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے۔ اس پر یہ آیت اتری :۔

---

[۱] شراب کی حرمت کی یہ تدریجی صورت حضرت عمرؓ (ترمذی تفسیر مائدہ و ابوداؤد کتاب الاشربہ) حضرت ابوہریرہؓ (مسند احمد جلد دوم) اور حضرت علیؓ (ابوداؤد کتاب الاشربہ) سے مروی ہے۔ یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنھوں نے نشہ کی حالت میں غلط سلط سورہ پڑھ دی تھی روایات سے صاف طور سے ظاہر نہیں ہوتی ایک روایت میں حضرت علیؓ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے۔ حضرت الاستاذ نے سیرۃ جلد دوم و تاریخ احکام ذکر حرمت شراب میں ابوداؤد کتاب الاشربہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا نام لکھ دیا تھا۔ مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن ہے۔ ابوعبدالرحمٰن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے۔ اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آتی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالتِ نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ ہیں :۔

وہ روایتیں جن میں حضرت علیؓ کا نام ہے :۔

۱۔ عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علی بن ابی طالبؓ قال صنع لنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ طعاما فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوٰۃ فقدموني فقرأت قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون

ابوجعفر رازی نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی۔ جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(النسآء : ۴۳)

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔

(بقیہ حاشیہ) فانزل اللہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى۔ (ترمذی تفسیر نساء)

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون ۔ پڑھی۔ اس پر خدا نے یہ آیت اتاری یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو)۔

۲۔ عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن السلمی عن علیؓ ان رجلا من الانصار دعاہ وعبد الرحمٰن بن عوفؓ فسقاھما قبل ان تحرم الخمر فامہم علی فی المغرب فقرا قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فخلط فیھا فنزلت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(ابوداود کتاب الاشربہ)

۲۔ سفیان نے عطاء بن سائب سے عطاء نے ابو عبد الرحمٰن سلمی سے، ابو عبد الرحمٰن سلمی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی، پھر علیؓ نے نماز مغرب کی امامت کی اور قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۔ پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کر دیا۔ اس پر یہ آیت اتری لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو اس کو جان لو)۔

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ "کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے" لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعد

(بقیہ حاشیہ) وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام ہے:۔ ص ۲۶۸

۳۔ عن سفیان عن عطاءٍ بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علیؓ قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبدالرحمٰن بن عوفؓ وصلی بھم المغرب فقرء قُلْ یَا اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ فالتبس علیہ فنزلت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی

(مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۳۔ سفیان نے عطاء بن سائب سے عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور قُلْ یَا اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ۔ پڑھی لیکن اس میں غلط ہو گیا۔ اس پر یہ آیت اتری لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی (نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو)۔

۴۔ سفیان عن عطاء بن السائب عن بن (؟) عبدالرحمٰن عن علیؓ انہ کان ھو وعبدالرحمٰن ورجل آخر یشربون الخمر فصلی بھم عبدالرحمٰن بن عوفؓ فقرء قُلْ یَا اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ فخلط فیھا فنزلت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ

۴۔ سفیان نے عطاء بن السائب سے عطاء نے ابن عبدالرحمٰن سے، ابن عبدالرحمٰن نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبدالرحمٰن ابن عوفؓ اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے نماز پڑھائی اور قُلْ یَا اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ ۔

وقاصؓ کی دعوت کی۔ اس میں شراب کا دور بھی چلا۔ یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں۔ اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت☆ پہنچی۔ اس پر یہ حکم آیا:۔

(بقیہ حاشیہ) الآیۃ۔ ص ۲۶۹

(مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا۔ اس پر یہ آیت اتری لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ۔

۵۔ خالد بن عبد اللہ عن عطآء بن السآئب عن ابی عبد الرحمٰن ان عبد الرحمٰنؓ صنع طعاما فدعا ناسا من اصحاب النبیؐ فیہم علی بن ابی طالبؓ فقرء قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لا اعبد ما تعبدون و نحن عابدون ما عبدتم فَنَزَلَتْ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ الاٰیہ۔

(مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۵۔ خالد بن عبد اللہ، عطاء بن سائب سے، عطاء ابی عبد الرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہؓ میں سے چند لوگوں کو جن میں علی ابن ابی طالبؓ بھی تھے بلایا پھر انھوں نے قُلْ یٰاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَنَحْنُ عَابِدُوْنَ مَا عَبَدْتُّمْ پڑھی۔ اس پر یہ آیت اتری

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں:

۶۔ سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن عن علیؓ قال دعانا رجل من الانصار قبل تحریم الخمر فحضرت صلوٰۃ المغرب فتقدم رجل

۶۔ سفیان عطاء بن سائب سے، عطاء ابو عبد الرحمٰن سے، وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو

☆ صحیح مسلم فضائل سعد وقاصؓ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ	اے ایمان والو! بیشک شراب، جوا بت
وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ	اور پانے ناپاک اور شیطان کے کام

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۰) فقراء قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ فالتبس عليه فنزلت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ الآیہ (مستدرک حاکم تفسیر نساء)

کیا۔ نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا۔ اس پر یہ آیت اُتری لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ (الایۃ)

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں۔

۱۔ پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے۔ دوسری، تیسری اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے۔ چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے۔

۲۔ پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؓ تھے جنھوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا۔ تیسری چوتھی اور پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے اور چھٹی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

۳۔ اور روایتوں میں ہے کہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی۔ چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمتِ شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں۔ تاہم حضرت علیؓ کا پینا جو بچپن سے آنحضرتؐ کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے، قیاس کے خلاف ہے خصوصاً اس آیت کے بعد قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ (کہدے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں جو ناقابلِ تطبیق ہیں۔

ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے جب ان کے راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ سب سے پہلا راوی ابو عبدالرحمٰن سلمی جس کا نام عبداللہ بن حبیب ہے۔ وہ پہلے حضرت علیؓ کا طرفدار و حامی (شیعہ) تھا۔ بعد کو

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (المائدہ:۹۰)

ہیں تو ان سے بچو تاکہ فلاح پاؤ۔

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی۔ حرمتِ شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری ہے

(بقیہ حاشیہ ص۲۷۱) عثمانی (بنی اُمیہ کا طرفدار) اور حضرت علیؓ کا مخالف ہوگیا۔ پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علیؓ سے سُنا ہے محدثین میں مسلم نہیں۔ بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے۔ روایت کے دوسرے راوی عطاء بن سائب کا حافظہ خراب ہوگیا تھا اس لئے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو کہ خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابلِ تطبیق اختلاف موجود ہے۔ ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلّم ہیں اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ موجود تھے کہ نماز کا وقت آگیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے نماز پڑھانے کھڑے ہوگئے اور آیتیں غلط سلط پڑھ دیں۔ چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لئے یا تو ابو عبدالرحمٰن سلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطاء نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت اِدھر سے اُدھر کر دی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے:۔

۷۔ عن ابی هريرة قال حرمت الخمر	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں
ثلاث مرات۔ قدم رسول الله صلى	نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی۔ رسول اللہ
الله عليه وسلم المدينه و هم	صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو لوگ
يشربون الخمر ويأكلون الميسر	شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے۔
فسألوا رسول الله صلى الله عليه	لوگوں نے آپؐ سے ان دونوں کے متعلق

حضرت ابو عبیدہؓ امین اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے ابو طلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انس کی زبانی روایت ہے:

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۲) وسلم فانزل الله علی نبیه صلی الله علیه وسلم یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا الایة فقال الناس ما حرم علینا انما قال فیهما اثم کبیر وکانوا یشربون الخمر حتی اذا کان یوم من الایام صلی رجل من المهاجرین امّ اصحابه فی المغرب خلط فی قرأته فانزل الله فیها ایة اغلظ منها یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وکان الناس یشربون حتی یاتی احدهم الصلوٰة وهو مفیق ثم انزلت ایة اغلظ من ذٰلك یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ

سوال کیا تو خدا نے آپؐ پر یہ آیت نازل فرمائی یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا لیکن لوگوں نے کہا خدا نے ہم پر حرام نہیں کی، صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قرأت میں خلط کر دیا۔ اس لئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیۃ اتاری یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے۔ البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا۔ پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی، یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ

كنت اسقى اباعبيدة و ابا	میں ابو عبیدہؓ اور ابو طلحہؓ اور ابی ابن کعبؓ
طلحة و ابی بن كعب فجاءهم	کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر
آت فقال ان الخمر حرمت	کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔

حافظ ابنِ حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۳) وَالْاَنْزَلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ فقالوا انتهينا ربنا۔

الْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اب لوگوں نے کہا کہ خداوندا ہم باز آئے۔

(مسند احمد جلد ۲)

اس میں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر بھی نہیں۔ حضرت علیؓ جیسے قرآن کے صاحبِ فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں۔ محدثین میں حاکم نے مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود حضرت علیؓ روایت فرماتے ہیں۔ حاکم کہتے ہیں:

وفی هذا الحديث فائدة كثيرة و	اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور
هی ان الخوارج تنسب هذا السكر	وہ یہ ہے کہ خوارج نے اس نشہ اور اس غلط
وهذه القراءة الى امير المومنين	قرأت کو امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ ہی
علی بن ابی طالبؓ دون غيره وقد	کی طرف منسوب کیا تھا۔ تو خدا نے ان کو اس
برأه الله منها فانه راوی هذا	الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث
الحديث (مستدرک تفسیر نساء ۶)	کے راوی ہیں۔

درحقیقت یہ وہ واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علیؓ کو صاحب واقعہ بنایا۔

لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی شریک تھے۔ اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے[1] تھے تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کردی کسی نے پوچھ گچھ تک نہ کی اور دفعتہً جام وسبو توڑ ڈالے۔ یہ صرف ابو طلحہؓ کے گھر کا حال نہ تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہ گئیں۔ بخاری باب المظالم میں ہے:۔

فجرت فی سکك المدینة — مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی شراب خواری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہوگیا تھا۔ عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلّوں تک محدود تھا اس لئے جُوا بھی انہی کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے ؎

اعیرتنا البانها و لحومها — وذلك عار یا بن ریطة ظاهرا

کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں۔ اے ابن ریطہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔

تحابی بها اکفاءنا و نهینها — ونشرب فی اثمانها و نقامرا

ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جُوا کھیلتے ہیں۔

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کرکے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کردیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے۔ ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کرلیتے تھے

---

[1] فتح الباری جلد دہم بحوالہ روایت ابی عاصم۔

جن کے نام یہ ہیں، فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلی، منافس، منیح، سفیح، وغد۔ ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لیئے تھے اور جب جُوا کھیلتے تھے تو اُن کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دیدیتے تھے۔ وہ اُن کو گڈمڈ کر کے ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا۔ جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے ان کو ناکامیابی ہوتی تھی۔ اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لئے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا۔ اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو "برم" کا خطاب دے رکھا تھا[1] جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے ؎

و اذا ھلکت فلا تریدی عاجزا غسا ولا برما ولا معزالا

اور اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور اور جُوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔

جُوئے کی ایک صورت جس کو "رہان" کہتے تھے یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے۔ چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لئے چھ برس کی مدت مقرر کی۔ چنانچہ جب یہ مدت

---

[1] اس کی تفصیل تفسیر کبیر جلد دوم میں ہے۔

گذر چکی اور رومیوں کو فتح وظفر نصیب نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر کو بازی ہار جانا پڑا[1]۔ رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بی بی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے[2]۔ یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی، عبس ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی۔ حصولِ دولت اور کسبِ شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سود خواری عرب میں سود خواری کا عام رواج تھا۔ تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے۔ حضرت عباس بن عبد المطلب رضؓ نے جو قریش کے سردار اور آنحضرتؐ کے چچا تھے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سود خواری میں نہایت شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے انہی کے سود کو باطل قرار دیا۔ حضرت عثمان رضؓ اور خالد بن ولید رضؓ سود پر قرض دیتے تھے۔ مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل اور حبیب بن ربیعہ نہایت دولتمند تھے۔ بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے۔ چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لائے تو انھوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا اس پر یہ آیت نازل[3] ہوئی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ	مومنو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو
وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا	اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔
إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○ (البقرۃ : ۲۷۸)	

---

[1] ترمذی جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔ [2] تفسیر کبیر جلد دوم۔ [3] تفسیر کبیر جلد دوم۔

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولتمند شہر تھا۔ اس لئے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے، چنانچہ آنحضرتؐ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی اُن میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سودخواری نہ کریں گے[1] اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے۔ ان سے بھی یہی شرط کی گئی[2]

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے اور راس المال کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کر دیتے تھے۔ جب میعاد گذر جاتی تھی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے تھے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا دیتے تھے۔ لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد معینہ کے لئے کسی کو مثلاً سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گذر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی تھی۔ یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تمام طبقہ چند دولتمندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا	مسلمانو! دونا چارگن سود نہ کھاؤ اور
الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ	خدا سے ڈرو یقین ہے کہ تم کامیاب

---

[1] فتوح البلدان بلاذری فتح طائف۔ [2] ابو داؤد کتاب الامارت۔

اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ ہو جاؤ۔

(آل عمران : ۱۳۰)

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اگر راہن میعاد کے اندر مال مرہون کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا[1] مال و دولت سے گزر کر عورتوں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے تھے[2]

لوٹ مار عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے قائم ہو گئے تھے جنھوں نے راہزنی کو اپنا ذریعۂ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو "لصوص" کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں کے کھوؤں میں رہتا تھا اور اُدھر سے جو مسافر یا قبیلے گذرتے تھے اُن کو لوٹ لیتا تھا۔ اس کا استیصال صرف ایک پُرزور نظامِ حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپؐ سے ملنے آئے اور آپؐ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ وہ دن آئے گا جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضرموت کا سفر کرے گی تو چونکہ وہ قبیلہ طے کے ایک رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لئے ان کو تعجب ہوا کہ ہیں! طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے؟

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہلِ و عیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان سے

---

[1] موطا امام مالک۔ [2] صحیح بخاری قتلِ کعب بن اشرف۔

بسلامت گزر نہیں سکتے تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا۔ صبح کا وقت جب کہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے، اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ چنانچہ "صبح" کا لفظ عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور سے بولا جاتا تھا۔ کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے ؎

یالھف زیابۃ للحارث الصابح فالغانم فالآئب

اے زیابہ کا افسوس حارث کے لئے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا پھر لوٹنے والا پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے۔ اور چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پاکر اسی طرح تصرف کرتا تھا اس لئے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج بھی تھا۔ مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے۔ وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جاکر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرًا شہرت عام رکھتے تھے۔ تابط شرًا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا

خزانہ جمع رہتا تھا اس لئے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے۔ چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنھوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا[۱]۔ بلکہ اس کے لئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے[۲]۔

عام بدّو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ آنحضرتؐ ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے دوسری باتوں کے ساتھ یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ آئندہ وہ چوری نہ کریں گے[۳]۔ بلکہ خود قرآن پاک نے آپؐ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا[۴]۔

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لئے تھے۔ ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا (مجمن) لگا رکھا تھا۔ حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا[۵]۔

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے۔ چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بناء پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے[۶]۔

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی اس لئے اس کے لئے غیر و بیگانہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب، ہمسایہ، دوست و آشنا، خاندان غرض سب پر پڑتا تھا۔ چنانچہ مدینہ میں بشر، بُشَیر، مبشر تین آدمی تھے جن کو بنو ابیرق کہا جاتا تھا۔ ان میں بُشَیر منافق تھا اور آنحضرتؐ کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ یہ لوگ نہایت تنگدست اور فاقہ مست تھے۔ انہوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالاخانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی، نقب لگا کر چوری کی۔ آپؐ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے۔ لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جا ملا[۷]۔

---

[۱] فتح الباری جلد دوم۔ [۲] کتاب المعارف لابن قتیبہ۔ [۳] صحیح بخاری کتاب الحدود۔ [۴] سورۂ الممتحنہ: ۱۲۔ [۵] مسلم باب فی صلوٰۃ الکسوف۔
[۶] مسلم و بخاری کتاب المناقب باب اسلم و غفار۔ [۷] ترمذی کتاب التفسیر سورۂ القلم۔

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں اسی لئے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ وَلَا یَسْرِقْنَ یعنی وہ چوری نہ کریں گی، شرفاء اگر اس الزام میں پکڑ جاتے تو وہ چھوڑ دیئے جاتے تھے اس لئے یہ برائی رُکنے نہیں پاتی تھی۔ چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا اس کے متعلق آنحضرتؐ کی خدمت میں کون سفارش کرے گا۔ لوگوں نے اسامہ بن زیدؓ کو منتخب کیا جن کو آپؐ بہت پیار کرتے تھے۔ انہوں نے سفارش کی تو آپؐ نے فرمایا "تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو"؟ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "گزشتہ قومیں صرف اسی لئے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہؓ بنتِ محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا"[1]

خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے۔ ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اُڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرتؐ کی خدمت میں لایا گیا تو آپؐ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! ایک چادر کے لئے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا، "میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا۔ حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں"[2]

---

[1] الممتحنہ: ۱۲۔ [2] صحیح بخاری جلد سوم کتاب الحدود [3] دار قطنی کتاب الحدود

سفّاکی و بے رحمی و وحشت رات دن کی لوٹ مار اور کُشت وخون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے۔ زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ اُن کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالے۔ مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں اُن کے ہار بنا کر پہنتیں۔ منّت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضا ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے، مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ ڈال دیتے۔ اُن کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے۔ اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔

کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پانی بند کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اس طریقہ سزا کا نام ان کے یہاں "صبر" تھا۔ مُردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے۔ وہ چند روز میں مر جاتا تھا۔ سمجھتے تھے کہ یہ مُردے کی سواری بنے گا۔ اس اونٹ کو "بلیہ" کہتے تھے۔

زنا اور فواحش زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کئے جاتے تھے۔ امرأ القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اِس کے ساتھ شاہزادہ اور والیٔ ملک بھی تھا۔ اُس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور اور عورتوں کے ساتھ جو افعالِ شنیعہ اور بے حیائیاں کیں اپنے قصیدۂ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں۔ باوجود اس کے اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ اہلِ جاہلیت گو بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپے

چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں[۱]۔ فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں[۲] اور صاحب الرایات کہلاتی تھیں۔ ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام عناق تھا۔ مرثد غنوی نے آنحضرتؐ سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کروں اس پر یہ آیت اتری[۳]:

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ج (النور: ۳)

اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کما لائیں اور ان کی نذر کریں۔ عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنوا کر پہنائیں گے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے کہ عبداللہ ابن ابی کی دو لونڈیاں تھیں۔ ایک کا نام مسیکہ اور دوسرے کا نام امیمہ تھا۔ وہ ان دونوں کو زنا کاری کرانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس پر قرآن مجید کی آیت اتری[۴]:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ

اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

(النور: ۳)

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں۔ مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیج دیتے کہ اس سے ہمبستر ہو۔ بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت

---

[۱] تفسیر طبری آیت مُحْصِنٰتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ جلد پنجم۔ [۲] صحیح بخاری کتاب النکاح جلد دوم۔
[۳] ابوداؤد کتاب النکاح۔ [۴] صحیح مسلم باب التفسیر۔

کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے۔ جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچّہ جنتی تو سب کو بُلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچّہ تمہارا ہے۔ اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سرِ بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں۔ وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے۔ عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچّہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدّتِ معیّنہ کے لئے نکاح کر لیتے تھے۔ اس مدّت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے۔ اس کو متعہ کہتے تھے۔ اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی شرم و حیا کا وجود نہ تھا۔ حجِ کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا باقی) سب مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے۔ عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ سترِ عورت ہو جاتا۔ پھر یہ شعر پڑھتیں ؎

الیوم یبدو بعضہ او کلہ	آج بدن کا کچھ حصہ کُھلے گا یا سارا اور جو
فما بدا منہ فلا احلہ	کُھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی
	میں اجازت نہیں دیتی۔

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے:۔ نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے۔ کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔[1]

---

[1] نسائی باب الاستتار عند الغسل۔

پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے[1] جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے۔[2]

سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کرکے ان کو بیوی بناتے۔

عورتوں پر ظلم عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا، عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہو۔ اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدانِ جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آجاتیں۔ اگر صلح ہو جاتی اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے، بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اس کو اشعار میں ظاہر کرتے۔ بنو ضبہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عینِ میدانِ جنگ میں رسوا کیا۔ فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے

ے فظلت وظلت یرکبون ھبیرھا — تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے اور
ولیس لھم الاعوالیھا ستر — اگر کوئی پردہ بیچ میں تھا تو وہ صرف نیزے تھے۔

قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا جو رحرحان کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت جریر کہتا ہے ع

نکحت نساءھم بغیر مھور — ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔

عمرو معدیکرب عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے۔ ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا ؎

---

[1] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [2] ابوداؤد: باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابۃ اہلہ۔

امن ریحانۃ الداعی السمیع	کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے
یؤرقنی واصحابی ھجوع	والا ہے جس نے کو مجھے بے خواب رکھا ہے
اذالم تستطع امرا فدعہ	لیکن میرے احباب سوتے ہیں۔ اگر تم کسی کام کو نہ
وجاوزہ الی ما تستطیع	کرسکو تو اس کو چھوڑ کر وہ کرو جو کر سکتے ہو۔

طلاق کے لئے کوئی مدت اور عدت نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ غیلان بن سلمۃ ثقفیؓ جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ وہب اسدیؓ نے اسلام قبول کیا تو آٹھ بیویاں اُن کے عقدِ نکاح میں تھیں[1]۔

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے۔ باپ مرجاتا تو اس کی کُل بیویاں (بجز حقیقی ماں کے) بیٹے کے تصرف میں آئیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں۔

ایامِ کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جاتے۔ خوشبو وغیرہ قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی۔ اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے۔ اس سے وہ اپنے جسم یا..... کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی۔ وہ مینگنی کو پھینک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی[2]۔ عورت کا جو مہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا۔ عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہِ مشق تھی۔

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح۔ [2] ابوداؤد کتاب النکاح باب احداد المتوفی عنہا زوجہا۔

رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا، اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى	اور جب اُن میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝	سُنائی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا	اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اِس
بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ	خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا
يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ	ہے اور سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ اس کو
(النحل: ۵۸ - ۵۹)	قبول کرلے یا زندہ زمین میں دفن کردے۔

ابوحمزہ ایک رئیس تھا۔ اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا۔ اِس پر اُس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی ؎

مالابی حمزۃ لا یاتینا	ابوحمزہ کو کیا ہوگیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا
یبیت فی بیت التی تلینا	اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔
غضبان الا نلد البنینا	اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے۔
تاللّٰہ ماذالک بایدینا	خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔
ونحن کالزرع لزارعینا	ہم بطور کھیت کے ہیں۔
ننبت ماقد زرعوہ فینا	ہم میں جو بویا جائے گا وہی اُگے گا۔

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہوگئی۔ لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جاکر گڑھا کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے۔ اس کو عربی میں وادٗ کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ

سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں[1]۔

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے[2]۔ عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی۔ وہ اگر آکر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مدخولہ بن جاتی[3]۔

وحشت وجہالت حرام و حلال کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ہر چیز اور ہر جانور جو کھا سکتے تھے کھاتے تھے۔ حشرات الارض عام غذا تھی۔ چھپکلی تک کھا جاتے تھے۔ خون کو جما لیتے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے۔ مردہ جانور کھانا عام بات تھی۔ چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے[4]۔ زندہ جانور کا گوشت کا ٹکڑا کھا لیتے تھے۔ گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر، درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے[5]۔ گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے[6]۔

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ میمون جس نے آغازِ اسلام کا زمانہ پایا ہے اور اہل عرب نے آنحضرتؐ کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے، اُس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یہ ہیں:۔

و ایاك و المیتات لا تأکلنها	و لا تاخذن سهما حدید التفصدا
مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا	اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا۔
و ذا النصب المنصوب لا تنسکنه	و لا تعبد الاوثان و الله فاعبدا
اور نہ کھڑے کیے ہوئے بتوں پر قربانی کر	اور نہ بتوں کی پوجا کر بلکہ اللہ کی عبادت کر۔

---

[1] تفسیر ابن جریر و ابن کثیر تفسیر سورہ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ [2] تفسیر یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ [3] تفسیر وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ [4] اسباب النزول سیوطی آیت حرمت علیکم المیتة [5] تفسیر طبری سورۂ مائدہ بیان ماکولات [6] صحیح نسائی کتاب الصید والذبائح [7] دیوان اعشیٰ مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء۔

ولا السائل المحروم لا تتركنه — لعاقبة ولا الاسير المقيدا

اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لئے چھوڑ مت — اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو۔

ولا تسخرن من بائس ذی ضرارة — ولا تحسبن المرء یوما مخلدا

نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر — اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ آدمی ہمیشہ رہنے والا ہے۔

ولا تقربن جارة ان سرها — علیك حرام فانكحن او تابدا

اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر — وہ تجھ پر حرام ہے تو نکاح کر اور یا کنوارہ رہ جا۔

عربوں کی خصوصیات

اور

خیر الامم بننے کی اہمیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہلِ عرب میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں جو دنیا کی تمام قوموں میں ان ہی کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی ان ہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلاّقِ فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا۔

صحتِ نسب ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز اس کی صحیح النسبی ہے۔ شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے۔ اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی ہمت نہیں کی۔ توراۃ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ ریورنڈ رفاسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں۔ قدیم یہودی مورخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے[1]۔ اور آجکل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں

---

[1] ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اوّل۔

پیش کی ہیں[1]۔ اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے۔ اور غالباً اسی لئے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں "عرب کی ہاجرہ" کی تمثیل بیان استعمال کی ہے[2] اور قرآن پاک نے اہلِ عرب اور قریش کو خطاب کرکے صاف کہا ہے۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ — تمھارے باپ ابراھیمؑ کا مذہب۔ (الحج : ۷۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کرلی جائے کہ وہی تمدن اور طرزِ معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اہل وعیال کا نظر آتا ہے، اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم وباقی ہے۔ وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے، وہی رسم ورواج ہیں جن کو اسلام نے آکر اور زیادہ نکھار دیا۔ وہی بیت اللہ، وہی حج اور قربانی کی عبادتیں ہیں۔ اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے:۔

"اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیریکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے[3]"

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب لاسرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد مصر [2] سینٹ پال گلتون کے نام باب ۴۔ ۲۵ [3] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم، مضمون "السنہ سامیہ"۔ میں نے ارض القرآن جلد اول میں اس پر مدلل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے یکجا کردیئے ہیں۔

اہلِ عرب کو اپنے حسب و نسب کی حفاظت کا جو خیال و لحاظ تھا اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں۔ چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے قبائل کے نسبی تعلّقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلۂ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے۔ اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہلِ عرب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لئے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لئے نسلِ ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے اسی طرح اُن کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں۔ مثلاً وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے۔ مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا۔ مجوسیت

خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی۔ یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی۔ عیسائیت اپنی فوج لشکر اور راہبوں اور قبیلوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کے حدود تک پھیلی تھی اور بعض افراد اور قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی۔ مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا۔ عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لئے اپنے مذہب کا نام دینِ حنیفی رکھتے تھے۔ یہ سب اسی لئے ہو رہا تھا تاکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دینِ ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلا رہے۔

محکوم نہ تھے عرب کا ملک تخلیقِ عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا۔ شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی۔ بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و زبر کر دیا۔ مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا۔ یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لیکر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے۔ سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپاہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی۔ عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران و روم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنی حرص و آز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں۔ گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی۔ مگر قدرتِ الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا۔ یہ تمام اہتمام و انتظار اس لئے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے۔ ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کارآمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح

صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے۔ وہ امّی تھے۔ تاکہ ایک امّی معلّم کی زبانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے۔ ایک طرف ایشیا دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے۔ پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا۔ اس لئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل اور ہندوستان پہنچ گئے۔ اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، ٹیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار پھر ادھر جزائر ہند، جاوا، سماٹرا اور چین تک ان کا گزر ہوا۔ اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا۔ یہ تمام مواقع اس لئے میسّر آئے کہ عرب کا محلِّ وقوع اس دعوت کے لئے مناسب مرکز تھا۔ فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتا تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا۔ پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی۔ ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کیلئے عرب کے سوا دنیا میں کوئی موزوں جگہ نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا بآسانی ممکن ہوا۔

بعض اخلاقی خوبیاں ان کے علاوہ اہلِ عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لئے شاید نمونہ اور مصلح ہونے کے لئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشّان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے۔ اور نہ وہ دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے | وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے۔ وہ خطرات سے بے خوف تھے۔ وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ و قیصر کو انھوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پُرجوش تھے | ساتھ ہی وہ پُرجوش بھی تھے۔ اس لئے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اُٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا۔ ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا۔ ہر جگہ وہ توحید کا علم لئے بحر و بر، دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزم راسخ سے ارکانِ عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے | ان کی جسمانی شجاعت و بہادری کے ساتھ ان کا دل شجاع اور بہادر تھا۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی، وہی ان کی زبان پر تھی۔ اہلِ مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا ورنہ قریش اور عام اہلِ عرب میں یہ بات نہ تھی۔ یا تو وہ کھُلے دشمن تھے یا کھُلے دوست۔ اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے | باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیۂ عقل و دانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، ابوعبیدہ بن الجراحؓ وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ نے علم و مذہب، اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں۔ روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انھوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور

علم وسیاست کے اُلجھے سے اُلجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے ان کے شعرا کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں ان کے فصحاء کے مقولے سُنیئے تو ان کی اس فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل وگہر وہ اپنے منہ سے اُگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی کے بعض قوٰی بیکار ہیں تو انکی قوّت دوسرے زیرِ عمل قوٰی کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوّت کو وہ ترقّی دیتی رہتی ہے۔ اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں عرب کے بعض قوٰی بیکار ہو رہے تھے وہاں ان کو اپنی یادداشت کے لئے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل ودماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے شعراء اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوّت کا فیض یہ تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے۔ اور یہ ان ہی کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصّہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہلِ عرب کی اسی خصوصیّت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث وسیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمّہ واری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔ اور سینکڑوں اصحابؓ ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ اہلِ عرب کی اس خصوصیّت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیّاض تھے اہلِ عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی۔ مہمان نوازی انکی

سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے۔ اپنی شہرت اور ناموری کے لئے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا یا جُوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسۂ دعوت میں اُڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی صفت تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ مدح میں سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات و زکوٰۃ سے بدل دیا۔ اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے | چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ہوئے تھے اور نہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اس لئے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا۔ وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے۔ وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بے باکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے۔ اہلِ عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی، مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے | اہلِ عرب کے فطری اخلاق و کردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے۔ وہ اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آراء اور نظریہ باز نہ تھے۔ وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے وہ چون وچرا اور کیسے، کیونکر کی فلسفیانہ اُلجھنوں سے پاک تھے۔ وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے اُن پر فوراً عامل بن جاتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی اُلجھنوں کے سُلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے۔ اسی بنا پر

شارع علیہ السلام نے ان کے سامنے عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ دور دور سے بدوی آنحضرتؐ کی خدمت میں آتے تھے اور شک و حجت اور مناظرہ و قیل و قال کے بغیر فرائض و اخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیتے تھے۔ وہ اگر مگر اور ممکن ناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے۔ وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کر کے دینی و دنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے۔ اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے تھے۔ اہلِ عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت و نظریت سے اس کو پاک و مبرا رکھا۔ اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب و مشرق، شمال و جنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا۔

اِن اوصاف کی مصلحت اہلِ عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لئے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لئے منتخب ہو چکی تھی۔ باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے یہ چند اچھے اوصاف اس لئے ان میں ودیعت کیے گئے تھے تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لئے خزانۂ غیب کا کام دے۔ یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند و عجم میں تھا نہ روم و فرنگ میں، نہ ترک میں تھا، نہ زنگ میں تھا وہ عرب اور صرف عرب میں تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لئے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے سپرد کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر

پر ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اولاد میں اسمٰعیلؑ کو پسند کیا اور اسمٰعیلؑ کی اولاد میں ہی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں۔ اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سب سے بہتر نسل میں رکھا۔ ان کو دو حصوں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصّہ میں (یعنی عرب میں) بنایا جو سب سے بہتر تھا۔ اس حصّے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا۔ پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا۔ پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا"[1]۔

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی باب المناقب میں ہیں۔

صبحِ سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اسی ظلمت میں تھی کہ صبحِ سعادت نمودار ہوئی اور خورشیدِ نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا۔ ظلمتِ شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرّہ ذرّہ سورج کی کرنوں سے پُرنور ہوگیا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعت کامل عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لئے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستورالعمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات، ہر ادا، ہر جنبش عملی خطیب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور اپنا ہم عمل بنا لے۔

اس بنا پر خاتمِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لئے تیار کرنا تھا[1]۔ دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں۔

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو ادیانِ مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:۔

یدعوا قوما الی السنۃ الراشدۃ	وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت
ویزکیھم ویصلح شانھم ثم یتخذھم	دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے پھر

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار و ذلیل ہے اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ[1] (ہم نے تم کو تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت دی) کا تاج پہن چکی تھی۔ لیکن اوپر بہ تفصیل گزر چکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ وہم پرست ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشو و نما سے لبریز تھا اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا۔ مشیتِ ایزدی نے اُسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ پن تھا

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ○

(آل عمران : ۱۱۰)

(تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لئے (پردۂ عدم) سے باہر لائی گئی۔ جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے

کا مظہر بن گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۱) بمنزلة جوارحه فيجاهد بهم اهل الارض ويفرقهم فى البلاد وهو قوله تعالىٰ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ. (حجة الله البالغه)

پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور انکو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا "تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لئے پیدا کیے گئے ہو"۔

[1] البقرہ : ۴۷

[2] آلِ عمران : ۱۱۰

ان لوگوں کا حلیہ وجمال اور خط وخال یہ تھا:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ	ایسے لوگ کہ ہم اگر ان کو دنیا میں اقتدار
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ	دیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں،
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ	اچھی باتوں کا حکم دیں اور بُری باتوں
الْمُنْكَرِ ؕ	سے روکیں۔

(الحج : ۴۱)

اصلاح وہدایت کی مشکلات | ہر قوم کی اصلاح وہدایت میں اوّل سخت اور متعدّد مشکلات پیش آتی ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت، ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں۔ اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرتِ انسانی سے بالاتر تھا۔ بنواسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور وظلم کا طوفان ان کے سر سے گزر چکا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسانِ عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے۔ لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلّت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لے لو اور اسی پر تختِ سلطنت بچھاؤ تو انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمھارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ یہ ایک امتدادِ معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا۔ اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر منقرض نہیں ہوگئی، بنواسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی۔ اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت | عرب کی قوم امّی محض تھی۔ اُلوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت ان میں سے

کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں۔ اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بے گانہ آواز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن مجید نے ان کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے:

یٰسٓ ○ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ○	قرآن حکیم کی قسم! تو بے شبہ پیغمبروں
اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ عَلٰى	میں سے ہے۔ راہ راست پر ہے۔
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ تَنْزِيْلَ	یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے
الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ○ لِتُنْذِرَ	پاس سے اترا ہے تاکہ تو اس قوم کو
قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ	آگاہ کرے۔ جن کے اسلاف کو آگاہ
غٰفِلُوْنَ ○	نہیں کیا گیا اور اس لئے وہ غفلت
(یٰسٓ : ۱-۶)	میں پڑے ہیں۔

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بے گانہ تھی:

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ	اور انہوں نے تعجب کیا کہ ان ہی میں
وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ○	سے ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا۔
اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ	کافروں نے کہا یہ ورد غگو جادوگر ہے۔
هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ وَانْطَلَقَ	اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا
الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا	بنا دیا، یہ عجیب بات ہے۔ اُن کے
عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ○	بیچ اُٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے
مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِى الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ	معبودوں پر جمے رہو۔ اس میں اس

إِنْ هٰذَآ إِلَّا اخْتِلَاقٌ ○

(صٓ : ۴-۷)

(پیغمبر) کی کوئی غرض ہے۔ ہم نے تو سابق مذہب میں یہ نہیں سُنا۔ تو یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔

بَلْ عَجِبُوٓا أَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ○

(قٓ : ۲)

بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا۔ کافروں نے کہا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔

صفاتِ الٰہی، آثارِ نبوّت، احوالِ معاد، ان میں سے ہر بات کو سُن کر وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے اور نبوّت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں۔ اس منصب پر فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیئے تھا:

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ

(الفرقان : ۲۱)

اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اُتارے گئے۔

إِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّا اللّٰهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَإِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُونَ ○

(حٰمٓ السجدۃ : ۱۴)

پیغمبر جب اُن کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اُتارتا۔ ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○

(بنی اسرآئیل : ۹۴ — ۹۵)

ہدایت آنے کے بعد صرف اِس شُبہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

بنی کا تخیل اگر اُن کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماورا صورت میں یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزّہ ہو۔ اس کے پیچھے خدا اور فرشتوں کا پَرا ہو۔ آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دستِ قدرت میں ہوں:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِىَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ○ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ ؕ

(بنی اسرائیل : ۹۰-۹۳)

انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اُس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے تو چشمہ نہ بہا دے یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو، جس میں نہریں جاری کر دی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہے ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہ گرا دے یا خدا اور فرشتوں کو پَرا بنا کر نہ لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر

پر نہ چڑھ جائے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (الفرقان، ۷-۸)

انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھانا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اُترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا، یا اس کے لئے خاص کوئی باغ نہ ہوا، جس سے یہ کھاتا۔

پیغمبر کے لئے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو۔ اُس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائداد ہو۔ میووں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں۔ چنانچہ گذشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اسی لئے مکہ اور طائف کے جو روساء دولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (الزخرف : ۳۱)

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُترا۔

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی، جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اُتر آئے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ

کافروں نے کہا اس پر قرآن یکبارگی

عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ

(الفرقان : ۳۲)

کیوں نہیں اُترا۔

وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ

(بنی اسرائیل : ۹۳)

اور (کافروں نے کہا) ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اُتار لائے۔ جس کو ہم لے کر پڑھنے لگیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

(الانعام : ۷)

اور اگر کاغذوں میں لکھی ہوئی کوئی کتاب ہم آسمان سے تم پر اُتارتے جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے۔ اُلوہیت اور صفاتِ الٰہی کے اسرار، نبوّت کے خصائص، نزولِ کتاب کی حقیقت، ہر چیز اُن کے لئے حیرت و استعجاب کا سرمایہ تھی:

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ○ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ○

(المؤمنون : ۶۸-۶۹)

کیا انہوں نے بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا تو اس کے منکر ہیں۔

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے۔ لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے۔ ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سرتاپا لبیک تھے۔ حصہ اوّل میں گذر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہلِ کتاب یا حنفاء کے آغوش پروردہ تھے۔ اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا۔ مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموزِ نبوت کے دانا چشم پرنم اور دلِ پرکیف سے:

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِن كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ۝

(بنی اسرائیل: ۱۰۷ – ۱۰۹)

جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب اُن کو قرآن کی آیتیں سُنائی جاتی ہیں تو مُنہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار ہم سے (ایک پیغمبر آخرالزماں کے بھیجنے کا) جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا۔ رو کر وہ مُنہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ اُن کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ

اُن میں سے سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ تکبّر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے

تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○

(المائدۃ : ۸۲-۸۳)

ہیں جو پیغمبر پر اُترتا ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے ہم کو بھی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصّب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے وہ بھی چشم دل کو بینشِ حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

(البقرۃ : ۱۴۶)

جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ

(البقرۃ : ۸۹)

اور جب خدا کے پاس پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے، تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اُسی کے نام سے دباتے تھے اب حق پہچان کر اُس کا انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے، اگر واقعات پر غور کیا جائے۔ تب بھی یہ حقیقت

منکشف ہو جائے گی۔ مجرد دعوتِ حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا اُن کے حالات پیشِ نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہ کا جویاں تھا۔ حضرت سعید بن زیدؓ، عثمان بن مظعونؓ، صہیب رومیؓ، ابو ذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقینِ اسلام ہیں، اسی قسم کے لوگ تھے۔ ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ، قریش کے مشرکین و کفار خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ورقہ مکہ کا قریش عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموسِ اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے۔ مکہ کے مشرک ترپن برس تک آپؐ کے چہرہ پُرنور کو دیکھتے رہے لیکن نورِ الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلامؓ یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمالِ پُرانوار کو دیکھا اور پکار اُٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے۔ روسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزولِ وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے اور نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں۔ قریش کے گھر یہ دولت خود اُترتی ہے اور وہ اُس کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جوان کی زبان سے آخری نبی کی بشارت سن چکے تھے، اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اس دولتِ ابدی کو اپنے گھر اُٹھا لے جاتے ہیں۔ طائف کے سنگدل جاہل نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں۔ لیکن چہرہ پر پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے رازِ نبوت کے نامحرم دعوت حق کا جواب اکیس برس تک تیغ و سنان سے دیتے ہیں، لیکن یثرب، ہجر، یمن، عمان اور بحرین کے بڑے بڑے اور عظیم الشان قبائل جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کسی قدر آگاہ ہو چکے تھے۔ اور وہ آوازِ حق پہنچنے

کے ساتھ دفعتاً مسلمان تھے۔

آبائی دین و رسوم کی پابندی ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے، وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے۔ انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں۔ دوست و آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع، وطن سے دوری، ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے۔ ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے۔ عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ، عرب کی قوم قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقاء اور استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی۔ پرانی سامی نسل کی بد دیانہ خصوصیتیں جو ہم توراۃ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں۔ دینِ ابراہیمؑ کے چند اصول حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے۔ اُن کے شعر و شاعری اور فخر و مباہات کا سب سے پُرجوش مضمون آباء و اجداد اور نام و نسب پر فخر و غرور تھا۔ جس کو چھوڑنا اُن کے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرتؐ نے جب مکہ میں دینِ حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بناء پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی دینِ آبائی کے ترک کا مسئلہ تھا۔ اور یہی دینِ جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل اُن کے پاس تھی چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا
عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ
لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

(البقرۃ : ۱۷۰)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے
جو اُتارا ہے، اس کی پیروی کرو، کہتے
ہیں (نہیں) بلکہ ہم اُس کی پیروی کریں گے
جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا۔
کیا اگرچہ اُن کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں
اور نہ راہ راست پر ہوں (تب بھی)

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى
اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ○
وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ
فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ
مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا
عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ
مُّقْتَدُوْنَ ○ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ
بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ
اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ
بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○

(الزخرف : ۲۲-۲۴)

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں
کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی
کے نقشِ قدم پر چل کر رہنمائی پائیں گے۔
اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے
پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا
لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا
کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش
پر پایا ہے اور ہم اُن ہی کے نقشِ قدم
کے پیرو ہیں۔ کہا ان کے پیغمبر نے کیا اگر چہ میں
اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں
کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے
پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم اُن ہی کی
پیروی کرو گے۔ انہوں نے کہا ہم تو جو دیکر

بھیجے گئے ہو اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

(الاعراف : ۲۸)

اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے۔ کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

(المائدۃ : ۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اُتارا ہے اس کے پاس اور رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں، ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے وہی ہم کو کافی ہے۔ کیا اُن کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر ہوں (تب بھی وہ انہی کی پیروی کریں گے)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ

کچھ لوگ ایسے ہیں، جو علم و ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اُتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں، بلکہ ہم اسی کی پیروی

اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ	کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں
اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ○	کو پایا۔ کیا اگرچہ ان کو شیطان دوزخ
(لقمٰن : ۲۰-۲۱)	کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے
	(تو وہ اُسی کی پیروی کریں گے)

کفّار کے یہ سوال وجواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کو اپنے آبائی رسوم کا چھوڑنا کس درجہ محالِ نظر آتا تھا۔ آپؐ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمّت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپؐ پر سب سے بڑا جُرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر، بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم ورواج کی مذمّت کرتے ہیں۔ مکّہ میں جب آپؐ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے دعوت پر لبیک کہا تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابو طالب کے پاس جاکر آپؐ کے خلاف جو الزامات قائم کیئے، وہ یہ تھے "اے ابو طالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو بُرا کہتا ہے۔ ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے۔ ہم کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے۔ تو یا تو تم اس کو روکو یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔"

یہ اُن کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا۔ ابو طالب نے ان کو سمجھا بُجھا کر واپس کیا، تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا۔ "اے ابو طالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا۔ اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی بُرائی اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ۔" اس اعلانِ جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابو طالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں "اے ابو طالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوش رُو جوان ہے۔ تم اس کو متبنّیٰ بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لئے ہمارے

حوالہ کردو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے۔ تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے اور ان کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے۔" سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرتؐ سے مل کر گفتگو کی اور کہا کہ اے محمدؐ! تمہارے سوا کسی قوم میں ایسا آدمی نہیں ملا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو جو تم لائے ہو۔ تم نے باپ دادوں کو بُرا کہا۔ ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی۔ ہم کو بے وقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا۔ غرض کوئی بُرائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔[1]

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو۔ معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا، ان پر کتنا بار تھا؟ اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے موسم حج میں آنحضرتؐ جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سُناتے تھے تو ابولہب آپؐ کے اثر کو باطل کرنے کے لئے آپؐ کی تقریر کے بعد آپؐ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا، "لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔"[2]

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرتؐ کی حمایت کی تھی اور وہ آپؐ کو اپنے جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، وہ بھی آپؐ کی دعوتِ حق کو اپنے دینِ آبائی کے مقابلہ میں پذیرائی کے قابل نہ سمجھے۔ بھتیجے نے بار بار کہا "چچا جان! کلمۂ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجیے کہ قیامت میں آپؐ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے۔" ابوطالب نے جواب دیا۔ "جانِ پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔" عین اُس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی، آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور

---

[1] یہ تمام واقعات ابنِ اسحٰق اور بیہقی کی تمام کتابوں میں بتفصیل مذکور ہیں [2] مستدرک حاکم جلد اوّل۔ کتاب الایمان۔

فرمایا کہ "چچا جان اب تو لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں"
ابو جہل اور عبداللہ بن اُمیہ نے جو اُن کے پاس بیٹھے تھے کہا "ابو طالب کیا تم (اپنے باپ)
عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے"۔ آپؐ بار بار لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے
تھے اور یہ دونوں اُن کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے۔ بالآخر
ابو طالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پہ مرتا ہوں"۔ اور لا الٰہ الا اللہ نہیں
کہا۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے[1] صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابو طالب نے کہا کہ "بھتیجے!
جو فقرہ تم کہتے ہو میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔ لیکن قریش کہیں گے کہ ابو طالب موت
سے ڈر گیا"[2] ابنِ اسحٰق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ آہستہ وہ فقرہ کہہ دیا[3] بہر حال اس واقعہ
سے جو دکھانا ہے، وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس اسلام سے باز رکھنے کے
لئے اس سے زیادہ پُر زور اور پُر اثر دلیل نہ تھی کہ ابو طالب کیا آبائی مذہب کو چھوڑ دو گے؟ اس
سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیّل کتنا بڑا پتھر تھا۔

توہّم پرستی عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہّم پرستی تھی
ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان
سے نکلا تو فوراً بلائیں آکر ہم کو لپٹ جائیں گی۔ عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور بیسیوں صنم خانے
تھے۔ دنیا کے تمام کام ان ہی اصنام اور بتوں سے متعلّق سمجھے جاتے تھے۔ مدتوں سے یہ خیال
راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گذاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا
بند ہو جائے گا، فرزند نرینہ پیدا نہ ہوگا۔ باغوں میں پھل نہ آئیں گے۔ اسی بناء پر اسلام کے نام سے

---

[1] کتاب الجنائز باب اذا قال المشرک عند الموت لا الٰہ الا اللہ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب نہم [3] ابن ہشام، وفاتِ ابی طالب۔

ان کو لرزہ آتا تھا اور یہ تخیّل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدّت سے عرب میں چلا آتا تھا۔ حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا:

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ	ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے
اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ[1]	کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو ستایا

(ھود: ۵۴) ہے۔

ابتداءً جب آنحضرتؐ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا[2] جاہلیّت کے زمانہ کے بعض کافر اجاب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے[3] ضمام بن ثعلبہؓ ایک صحابی تھے۔ وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات وعزّیٰ کی مذمّت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ضمام ان کو برا نہ کہو۔ دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے[4] حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں۔ کفّار نے کہنا شروع کیا کہ لات وعزیٰ ان کو اندھا کر دیا ہے[5] حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا دیکھو ذوالشری (بت) کہیں برباد نہ کر دے[6]۔"

فتح مکّہ کے بعد جب کہ دیوتاؤں سے زور وقوّت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم لات، عزّیٰ، منات، ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے۔ خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے۔ جنہوں نے اس فرض

---

[1] ابن کثیر، زمخشری، ابن حبان، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے [2] دیکھو تفسیر آیہ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وَنیز بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ [3] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ [4] مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ [5] اسد الغابہ ترجمہ حضرت زنیرہؓ و سیرۃ ابن ہشام ذکر مستضعفین مسلمین [6] اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمرو دوسیؓ۔

کو انجام دیا۔ پوجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا۔ وہ خود تباہ و برباد ہو جائے گا۔[1]

تو ہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہدِ عقلی نہیں بلکہ دُنیا کے ظاہری مادّی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے۔ لیکن قوانین گاہِ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے، جس طرح ایک غیر مسلمان۔ عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معًا یہ توقع بھی کر لیتے ہیں کہ اب وہ ہر قسم کے آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں۔ اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعتہً وہ متزلزل ہو جاتے تھے۔ صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ہے:[2]

کان الرجل یقدم المدینۃ فان ولدت امراتہ غلاما و نتجت خیلہ قال ھذا دین صالح و ان لم تلد امراتہ ولم تنتج خیلہ، قال ھذا دین سوء	باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچّہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کہتا کہ یہ نہایت بُرا مذہب ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے:[3]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ	اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے)، اگر ان کو فائدہ پہنچا تو ان کو اطمینان

---

[1] ابنِ سعد و طبری ذکر ہم اصنام [2] تفسیر سورۂ حج، جلد دوم [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج۔

عَلٰی وَجْهِهٖ ۚ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر مبتلائے مصیبت

(الحج : ۱۱) ہوئے تو فوراً اُلٹے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے اور اتّفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بد دعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے[۱] سوءِ اتّفاق یہ کہ اوّل اوّل جو لوگ مدینہ میں آتے تھے ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی۔ ابتدائے ہجرت میں جب حضرت ابو بکرؓ و حضرت بلالؓ آئے تو سخت بیمار ہو گئے[۲]۔ حضرت طفیل بن عمر دوسیؓ نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی[۳] اگرچہ مخلصین اور ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرتِ ثانیہ ہو گئی تھی، وہ اس قسم کے اتّفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آکر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرتؐ نے تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے اُن کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا، تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے[۴]۔ اسی طرح ایک بدّو نے آکر آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ لیکن سوءِ اتّفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا۔ تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپؐ نے تین بار منع فرمایا۔ لیکن اس کے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی اور فرمایا[۵]

---

[۱] مستدرک حاکم جلد سوم و اصابہ ذکر عبداللہ بن زبیرؓ [۲] صحیح بخاری کتاب المرضی و باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینہ۔ [۳] صحیح مسلم کتاب الایمان [۴] صحیح بخاری کتاب المحاربین [۵] بخاری جلد اوّل کتاب الحج فضائل مدینہ و باب اعتصام السنۃ۔

المدینۃ کالکیر تنفی خبثھا و	مدینہ کی آگ بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا
تنصع طیبھا	ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے۔

ان ہی اسباب کی بناء پر آنحضرتؐ نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی:

اللّٰھم حبب الینا المدینۃ کحبنا	خداوندا! مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ
مکۃ او اشد، اللّٰھم وصححھا و	ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنا دے۔
بارک لنا فی مدھا وصاعھا و	اس کو امراض سے صحیح کر دے۔ اس کے
انقل حماھا فاجعلھا بالجحفۃ[1]	پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو
	جحفہ میں منتقل کر دے۔

قبائل کی خانہ جنگیاں | اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصرِ اعظم بن گئی تھیں۔ یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں۔ اور اُن کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا مٹنا قریباً محال تھا۔ ان ہی لڑائیوں نے ثار (انتقامِ خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لئے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا۔ ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چلے آتے تھے، جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے۔ اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے۔ جو بچہ پیدا ہوتا تھا، وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ثار کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے۔ اس لئے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینہ۔

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا معاً اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لئے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا۔ بنی اُمیہ کی مخالفت اس کے لئے لامحالہ ہونی تھی۔

مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے۔ اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے۔ اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا۔ تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے۔ انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بُلوایا گیا تھا۔ کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا[1]

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی۔ مدینہ آنے کے بعد آنحضرتؐ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی۔ خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو، انصار اسلام لاکر ہمہ تن نیکوکاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے لیکن ثار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعۃً مشتعل ہو جاتے تھے۔ ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگِ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا تو انصار کے دونوں قبیلوں اوس خزرج کی تلواریں میان سے نکل آئیں[2]۔ اور بڑی مشکل سے آنحضرتؐ نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

---

[1] ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ [2] اصابہ جلد اوّل، معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے و معجم عبداللہ

حضرت عائشہ رضؓ کے واقعہ افک میں جب آنحضرتؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا "یا رسول اللہ اگر وہ (تہمت لگانے والا) ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں اور اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپؐ حکم دیں۔ میں بجا لاؤں گا۔" اس پر سعد بن عبادہؓ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے، دفعتاً کھڑے ہو گئے اور کہا:

کذبت لعمر اللہ لا تقتلہ ولا	خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو اس کو قتل
تقدر علی قتلہ ولو کان من	نہ کرے گا، نہ کر سکتا ہے۔ اور وہ شخص
رھطک ما احببت ان یقتل۔[1]	اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو اس کا قتل کیا جانا
	پسند نہ کرتا۔

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے:

فثار الحیان الاوس والخزرج	پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل
حتی ھموا ان یقتتلوا ورسول	ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کُشت و خون
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائم	پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرتؐ اس وقت
علی المنبر	منبر پر کھڑے تھے۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہدِ اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ آنحضرتؐ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی بات بڑھائی اور سخت شور و شغب ہوا تو آپؐ نے عیینہ سے فرمایا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک۔

"دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے"۔ اس نے کہا "خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستا لوں، جس قدر اُس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے"۔ اس پر اور شور و غل ہوا۔ آپؐ نے پھر یہی الفاظ فرمائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا۔ چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا، جو آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش ہوا تھا۔ اس لئے قبیلہ بنو لیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا، کہا کہ "ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصّہ کو تیر مارا گیا تو دوسرا بدک کے بھاگ گیا"۔ یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا۔ لیکن آنحضرتؐ چونکہ سفر میں تھے، اس لئے دیت میں پچاس اونٹ اسی وقت دیئے اور مدینہ پہنچ کر پچاس اونٹ کا وعدہ فرمایا۔

اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپؐ نے فتحِ مکہ میں امنِ عام کی منادی کر دی اور تلواروں کے میان میں کر لینے کا حکم دے دیا، تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلۂ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرتؐ کی خدمت میں جا رہا تھا۔ اس نے زمانۂ جاہلیّت میں قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا اور وہ لوگ انتقام کے لئے اس کو ڈھونڈھ رہے تھے۔ سوءِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور اُن لوگوں نے اِس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہِ نبوّت میں پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ آپؐ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے۔ اُن لوگوں نے حضرت عمر، حضرت ابو بکر، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے سفارش کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا۔ جس کے الفاظ یہ تھے:۔

لہ ابوداؤد جلد دوم، کتاب الدیات۔

"خدا نے مکہ کو دار الحرام بنایا ہے آدمیوں نے نہیں بنایا ہے۔ خدا نے کل چند گھنٹوں کے لئے اس کو میرے لئے حلال کر دیا تھا، لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں۔ ایک وہ جس نے حدودِ حرم میں کسی کو قتل کیا۔ دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا۔ تیسرا وہ جس نے زمانۂ جاہلیت کا انتقام لیا۔ تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے۔ میں اس کی دیت دوں گا۔

چنانچہ آپؐ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔[1]

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس و خزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ بنو ثعلبہ اسلام لا کر جب مدینہ آئے تو آنحضرتؐ خطبہ دے رہے تھے۔ ایک انصاری بے اختیار چلّا اُٹھے کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہمارے مجرم ہیں۔ ان سے قصاص دلوایئے۔ آنحضرتؐ نے ہاتھ اُٹھا کر فرمایا۔ الا لا یجنی والد علیٰ ولدہٖ[2] (یعنی لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔)

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔ اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب و حریفِ مقابل تھے دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا۔ تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا۔

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل جلد چہارم [2] دار قطنی جلد دوم۔

انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) پکارا۔ مہاجرین نے بھی یا للمہاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا۔ آنحضرتؐ کو خبر ہوئی، آپؐ نے نکل کر فرمایا کہ یہ کیا جہالت کی پکار ہے:

مابال دعوی الجاهلية[1] یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا سخت دشمن ہے۔ اس لئے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا۔ عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے۔ وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اور اس کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح آمادہ تھے۔ لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا، یعنی ثار۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام لاکر اس خاندانی قرض ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی۔ ابنِ مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

وكان له ثار في الجاهلية و كره ان يسلم حتى ياخذه[2] ان کا انتقام زمانۂ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا۔ جب تک وہ نہ لے لیں انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔

اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ جب آنحضرتؐ کی خدمت میں اسلام لاکر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا بنو عقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے، وہ لے لیں تو اسلام لائیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی وقت بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔[3]

سیاسی مشکلات | جہالت، وحشت، پابندی، رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع

---

[1] صحیح بخاری جلد اول ذکر نہی دعوتِ جاہلیہ۔ [2] اسد الغابہ جلد چہارم [3] معابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالکؓ۔

اصلاح نہ ہوتی، تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائلِ عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔ مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے۔ اُمیہ اور ہاشم اور آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے اُمیہ کا پلّہ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ نے جب نبوّت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے اُمیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتحِ مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علمبردار تھا۔ بنو اُمیہ کے بعد اور دوسرے جو خاندان بھی تھے اور جو حرم کے مناصب دوگانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، اُن میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد اور اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے۔ ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ "محمدؐ کی دعوتِ اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے"؟ تو اس نے صاف کہا کہ "میں کیا کہوں، محمدؐ کے خاندان نے عزّت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا ہے اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں۔ اس کے جواب میں ہم نے اسی شان کی دعوتیں دیں۔ انہوں نے خون بہا دیئے۔ ہم نے بھی دیئے۔ انہوں نے زرپاشیاں کیں، ہم نے بھی کیں۔ ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعتہً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوّت اور آسمان سے وحی بھی آگئی۔ اب ہم کہاں تک برداشت کریں۔ خدا کی قسم ہم کبھی محمدؐ پر ایمان نہیں لا سکتے"[1]۔ یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھ کو کاشت کاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا[2]۔

خوب غور سے دیکھو بدر، اُحد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کر رہا تھا۔ قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے مثل غطفان اور اسد

---

[1] ابنِ ہشام حصہ اوّل۔ [2] صحیح بخاری واقعۂ بدر۔

وغیرہ وہ یا اہل مکہ کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف و ہم عہد تھے۔ خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے۔ لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر ان ہی یہودیوں کے زیر بار تھے۔ انہی سے قرض دام لیتے تھے۔ انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے[1]۔ خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے باہم حلیف تھے۔ اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلۂ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا۔ ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لئے آتا تھا اور آستانۂ کعبہ پر سر جھکاتا تھا۔ کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے۔ بلکہ خیمہ و خرگاہ، تیغ و سپر، جاہ و چشم غرض ریاست و امارت کے تمام سروسامان رکھتے تھے۔ اس لئے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی۔ یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہوا، اسلام کو چین نصیب نہ ہو سکی۔ لیکن اسلام کی مخالفت صرف قریش کی متابعت تک محدود نہ تھی، بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا، براہ راست وہی تمام روسائے قبائل کو پہنچتا تھا۔ عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیسِ اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا۔ اور مالِ غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا، جس کو مرباع کہتے تھے۔ اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آئی تھی، اس کو چھانٹ لیتا تھا۔ اس کا نام صفی تھا۔ یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا۔ قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے۔ یہ روسائے

---

[1] طبری واقعہ خیبر۔

عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔

قبائل میں یہی امتیازِ مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے۔ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لئے ایک کے بدلہ میں دو کو قتل کرتے تھے۔ یہ امتیاز اور فرقِ مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوۂ بدر میں قریش کی فوج میں سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بناء پر اُن کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندانِ غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا۔ اور مکہ میں آیا۔ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آ گئی۔ جبلہ نے اس کے گال پر تھپڑ کھینچ مارا۔ اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے واقعہ سُن کر کہا۔اس کا کیا قصور ہے۔تم نے جو کیا، اس کی جزا پائی۔ جبلہ نے کہا میرا یہ رُتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اُٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا۔حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں زمانۂ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا۔لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ جبلہ نے کہا جو مذہب شرفا کو ذلیل کر دیتا ہے میں اس سے باز آتا ہوں۔ یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔

عرب کا ہر رئیسِ قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا۔ اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا۔اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا۔اس کے دربار میں شاہ و گدا رئیس و عامی، شریف و حقیر کا ایک درجہ تھا۔اس لئے عرب میں تمام رؤسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا اُن کے ہر قسم کے فخر و امتیاز

کا مٹ جانا تھا۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی۔ جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے۔ فنِ جنگ سے واقف تھے۔ سامان واسلحہ وافر رکھتے تھے۔ دولت کی بہتات تھی۔ باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا۔ عرب کے تمام مادّی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے۔ پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک بُرائی کو طشت ازبام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا۔ اس لئے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی۔ چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیماء، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح اُبھرنے نہ دیں۔ اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دینِ توحید کے مقابلہ میں انہوں نے اہلِ شرک کا ساتھ دے کر، خندق واحزاب وغطفان کے معرکے پیش کئے۔ عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں۔ عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کی شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا۔ عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہی دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے۔ اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں۔ اس لئے اس ملک میں ایک اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہیں آسکتا تھا۔ اسی لئے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی داروگیر کرنی چاہی۔ کسریٰ ایران نے یمن کے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدّعی

پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلّم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی، جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرتؐ کے بعد مسلمانوں کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعۂ معاش اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعۂ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلبِ اموال اور رہزنی تھا۔ اوپر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعۂ معاش غارت گری تھا اور چونکہ حج کے چار مہینوں میں جنگ و غارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے۔ اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔

اندرونی عرب تمام دشت و صحرا اور بالکل ویرانہ ہے۔ زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں۔ اس لئے ان کو غارت گری کرنی پڑی اور امتدادِ زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا۔ یہاں تک بڑے بڑے نامور شعرا، چور اور راہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لئے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلّہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ آنحضرتؐ نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا، اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا۔ دومۃ الجندل مدینہ منوّرہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے۔ تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپؐ کو خبر ہو گئی اور حفظِ ماتقدم کے لئے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے اِن اطراف کا بندوبست کیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال

چھین لیا تھا۔ چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا :

اما الاسلام فاقبل واما المال	اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے
فلست منه فی شیٔ	مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔

(صحیح بخاری کتاب الشروط، ذکر صلح حدیبیۃ)

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے۔ حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرتؐ اکثر بیعتِ اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے اُن میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ چوری نہ کریں گے۔ اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا ورنہ آج اگر شرفاء سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجّب ہو گا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا۔ اس لئے عربوں کو اسلام قبول کرنے کے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائعِ معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں یعنی وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے، کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے تو اب ان کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے۔ وہ شہر کی متمدّن زندگی بسر کرتے تھے تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبولِ اسلام کا اثر ان کے وسائلِ معاش پر بھی پڑ سکتا تھا۔ قریش کا ذریعۂ معاش صرف ان تجارتی تعلّقات تک محدود تھا جو انھوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر رکھّے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریفِ مقابل تھے۔ اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ

کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعۃً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے ہیں :

قال الشافعی کانت قریش	امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام
تنتاب الشام انتیابا کثیرا و	میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے
کان کثیر من معائشها منه	اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا
وتاتی العراق فیقال لما دخلت	اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے
فی الاسلام ذکرت للنبی صلی	تھے۔ تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام
الله علیه وسلم خوفها من	لائے تو آنحضرتؐ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو
انقطاع معائشها بالتجارة	جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں
من الشام والعراق اذا فارقت	کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو اُن کو اہل اسلام کے
الکفر ودخلت فی الاسلام و	ساتھ تھی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ جب کسریٰ
خلاف ملك الشام والعراق	ہلاک ہو جائے گا تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ
لاهل الاسلام فقال النبی صلی	ہوگا۔ چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ
الله علیه وسلم اذا اهلك کسری	ہو گیا۔ اور آپؐ نے فرمایا کہ جب قیصر ہلاک ہو جائے گا
فلا کسری بعده فلم یبق بارض	تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا چنانچہ ارضِ شام
العراق کسری یثبت له امر بعده	میں پھر کوئی قیصر نہیں ہوا جس کی وہاں
وقال اذا اهلك قیصر فلا قیصر	حکومت ہو۔ اس لحاظ سے آنحضرتؐ نے
بعده فلم یکن بارض الشام	یہ جواب ان کے بیان کے موافق

قیصر فاجابھم علی ما قالوا۔ دیا ہے۔

رفعِ شک اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورا کرنے کا سامان موجود تھا۔ عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شایق تھے اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا۔ عرب سخت نفس پرست تھے اسلام نے چار بیویاں اور غیر محدود لونڈیوں کی اجازت دے دی۔ اہلِ عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی۔ اب کیا چیز تھی جو اہلِ عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال تمامتر غلط ہے۔ جہاد اور تعدّدِ ازواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصّوں میں آئے گی۔ یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعدّدِ ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا۔ جہاد صرف کافروں سے جائز تھا۔ فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرّض نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتّحاد مذہب کوئی روک نہ تھی۔ تمام قبائل بت پرستی میں متّحد تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے۔ جہاد کے لئے اور بہت سی پابندیاں تھیں جو پہلے بالکل نہ تھیں۔ جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے۔ دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھیں اُن سے اُس وقت تمتّع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدّت گذر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچّہ پیدا ہو چکے۔ لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرّف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ پہلے نکاح کے لئے تعداد کی کوئی قید نہ تھی۔ ایک ساتھ

آٹھ آٹھ دس دس شادیاں کرتے تھے۔ اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا تمامتر غلط ہے۔ برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز، روایاتِ قدیمہ، جہالت، عادات، رسوم، نفس پرستی ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمراں ہوتی ہے وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں۔ آج یورپ علوم و فنون اور آزادیٔ خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے لیکن جو بیہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں اب بھی قائم ہیں تعوّد کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادیٔ خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں اور جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں اسلام ایک ایک کا دشمن تھا۔ ثار یعنی انتقامِ خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا۔ اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا۔ خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی کی روح تھی جو فنا کر دی گئی۔ ابوسفیان رئیس العرب کو بلالؓ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زیدؓ و سالمؓ وغیرہ) کے گھروں میں آگئیں۔ عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال بھر کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے سب سرد پڑ گئے۔

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریح طبع کا کوئی سامان نہ تھا۔ اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ ۔ اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں

(البقرۃ: ۴۵) پر یقیناً گراں ہے۔

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ زکوٰۃ ایسا سخت ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا نہ کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہوگئی صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا لیکن اب حج وہ جاہلیت کا حج نہیں رہا تھا۔ طوافِ عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی۔ بڑی دل چسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیئے گئے۔ مقام منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا۔ یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا۔ اسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالمگیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی۔ زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس و حریر حرام، چنگ و عود حرام، تصویر حرام۔ پھر زندہ دلی اور لطف زندگی کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو۔ تمام دیگر مذاہب نے عبادتوں میں بھی دل چسپی کا سامان رکھا ہے عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے۔ پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے۔ ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دل فریب بت ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دل فریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورۂ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمامتر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔

پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

تبلیغِ نبویؐ

اُس کے اُصول اور اُس کی کامیابی کے اسباب

تمام گذشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں۔ اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرتؐ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا۔ اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے لیکن کارلائل[1] کے بقول نہتے اور یکہ و تنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضۂ تبلیغ "تبلیغ" کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں۔ اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ اِنْذَار ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں۔ دوسرا لفظ دَعْوَۃ ہے جس کے معنی بُلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تَذْکِیر

---

[1] ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (محمدؐ)

ہے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں۔ بعثت نبویؐ کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے۔ دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بودھ مت باقی زیادہ تر ایسے تھے جو تبلیغی نہیں تھے جیسے یہودیت، مجوسیت اور ہندوئیت۔ جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیروؤں کا عمل ہے۔ کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعمیمِ دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگیوں میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں۔ تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیئے اور اس کے داعی و حامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصل وجہیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس کے حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس و کمتر ہیں، ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے۔ یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے ایک دفعہ جب ایک کنعانی[1] یا یونانی[2] عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا "میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"[3] پھر فرمایا "مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں"[4] پھر فرمایا "غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی

---

[1] متی ۱۵۔ [2] مرقس ۷۔ [3] متی ۱۵: ۲۵۔ [4] متی ۲۷۔

ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو[1]" پھر ارشاد فرمایا "وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو[2]"

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا، اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت آنحضرتؐ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا۔ اس لئے اپنی تبلیغ کے لئے قریش و غیر قریش، حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا۔ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ[3] (اے چادر پوش! اُٹھ کھڑا ہو اور ہشیار و آگاہ کر)۔ پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ[4] (جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا)۔ فَادْعُ[5] وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا)۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى[6] (لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو)۔ وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ[7] (اور نصیحت کر کہ نصیحت اہلِ ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے)۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ[8] (قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو)۔ اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی۔ حضرت علیؓ سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "اے علیؓ! تمہاری کوشش سے ایک آدمی

---

[1] متی ۱۰: ۶۔ [2] متی ۷: ۶۔ [3] المدثر: ۱، ۲۔ [4] المائدہ: ۶۷۔
[5] الشوریٰ: ۱۵۔ [6] الاعلیٰ: ۹۔ [7] الذاریات: ۵۵۔ [8] ق: ۴۵۔

کا بھی دینِ حق کو قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے[1]"

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

آنحضرتؐ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیامِ الٰہی لوگوں تک پہنچائیے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالتؐ کا فرض انجام نہیں دیا:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ	اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے
مِنْ رَّبِّكَ ط وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا	پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف
بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ط وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ	اُترا ہے اس کو پہنچا دے اگر تو نے ایسا
مِنَ النَّاسِ ط	نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا
(المائدۃ : ۶۷)	اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچائے گا۔

اس کی وسعت اس کے بعد اس فریضۂ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے۔ پیغامِ الٰہی سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا:

---

[1] صحیح مسلم باب خیبر۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ (الشعراء : ۲۱۴)

اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ و ہشیار کر۔

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکّہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے:

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الشوریٰ : ۷)

تاکہ تو مکّہ اور جو اس کے آس پاس (کے بدوی) ہیں ان کو آگاہ و ہشیار کرے۔

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ احساس و عقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہو جاتی ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (یٰسٓ : ۶۹ — ۷۰)

یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تاکہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔

پھر جس حد تک بھی اس کی آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے:

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (الانعام : ۱۹)

تاکہ میں اس سے تمہیں آگاہ و ہشیار کروں اور ان کو جن تک (میری یہ آگاہ و ہشیار کرنے والی آواز پہنچے)

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہوتی ہے:

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (ابراھیم : ۵۲)

یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے۔

آنحضرتؐ کو خطاب ہوا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (السبا: ۲۸)	اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا۔

آپؐ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف: ۱۵۸)	اے لوگوں میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔

اس سے زیادہ یہ کہ تمام کائنات آپؐ کی دعوت و تبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے۔ فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الفرقان: ۱-۲)	برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمدؐ) پر نازل کی تاکہ وہ دنیا جہاں کے لئے ہشیار و آگاہ کرنے والا ہو۔ وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری عین اس وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ	یہ قرآن تو دنیا کے لئے نصیحت ہے اور

لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ○ (صٓ : ۸۷ — ۸۸)

تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔

انبیاءؑ اور بانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں۔ خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سُنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا۔ نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلّغ بھیجا۔ حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرتؐ نے مکّہ میں رہ کر مکّہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا۔ حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جاکر حق کا پیغام پہنچایا اور اُسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپؐ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاشِ حق کے لئے آپؐ کے پاس آئے۔ مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدّ راہ بنے رہے پھر بھی مبلّغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی گئی اور پھر بالآخر قریش کے خلاف اس لئے تلوار اُٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پُرامن آزادی ملے۔ چھ برس کے جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی۔ قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو فتحِ مبین قرار دیا اور اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا[1] نازل ہوئی۔ اس کے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے واعظ، قاصد اور مبلّغ بھیجے گئے اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوتِ

---

[1] صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ

اسلام کے خطوط لکھے گئے۔ اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، حبش اور روم کے طالبینِ اسلام آئے اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے۔ مشرکینِ عرب، یہود، عیسائی اور پارسی سب نے آپؐ کے زمانہ ہی میں آپؐ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

لیکن نفسِ تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیئے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لئے تبلیغ کے اہم اصولوں کی تشریح کی ہے۔ لیکن صحیفۂ محمدیؐ نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بُلا
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط	اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریقے
(النحل : ۱۲۵)	سے کر۔

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے۔ عقل و حکمت، موعظۂ حسنہ، اور مناظرہ بطریقِ احسن۔ مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول ہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیت جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں۔ دوسرے خطابیات جن میں مؤثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اور

فریقین کے مسلّم مقدّمات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت، دوسرے کو موعظتِ حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدّعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کر کے اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں۔ یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دلنشیں دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور مؤثّر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں۔ پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا نام موعظۂ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریقِ احسن ہے۔ تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

قولِ لین | حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدّت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور کیسی ہی اچھی اور سچّی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سُننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغامِ ربّانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ یہ ارشاد بھی ہوتا ہے:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○ (طٰہٰ: ۴۳-۴۴)

اس نے سرکشی کی ہے۔ تو اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (خدا سے) ڈرے۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمّل کی اس سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہوسکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہوسکتا ہے، پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعیوں، مبلّغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں، مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا زیادہ رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔

اعراض اور قولِ بلیغ آنحضرتؐ کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپؐ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے، یہ حکم ہوتا ہے:

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ○ (النسآء: ۶۳)

تو ان سے درگزر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں، اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالف کی بدسلیقگی، بدتہذیبی اور درشتی سے درگزر اور اُن کو برداشت کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیئے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ مؤثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیئے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر ان ہی ربّانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرتؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے متعیّن فرمایا تو رخصت کرتے وقت

یہ نصیحت فرمائی، یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا[1] (دین الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری دلانا نفرت نہ دلانا) یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلّغ کی کامیابی کی جان ہیں، آنحضرتؐ نے صحابہؓ کے سامنے اور صحابہؓ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دینِ الٰہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبولِ عام کی راہ ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پُرامید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوفزدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرتؐ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے، بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کئے جائیں، پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھر اہم کے اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، پھر زکوٰۃ ہے، پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپؐ نے فرمایا: "تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کا رسول ہے، جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے، یہ صدقہ ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دے دیا جائے، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو

---

[1] صحیح بخاری بعث معاذؓ الی الیمن جلد دوم۔

صدقہ میں چُن چُن کر ان کے بڑھیا مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں[1]۔"

تالیفِ قلب تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جس کو تالیفِ قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ[2] اس کے لفظی معنی ہیں "دلوں کو ملانا" اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو، لطف و محبت، امداد و اعانت اور غمخواری و ہمدردی کرنا ہے۔ کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے اور یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ آنحضرتؐ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے۔ آنحضرتؐ نے حُنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی میں تقسیم کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں۔ صفوانؓ جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرتؐ سے نہایت بغض رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "مجھ کو آنحضرتؐ نے دیا جتنا دیا۔ اور مجھے اُن سے سخت بغض تھا۔ لیکن آپؐ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں[3]۔" ایک دفعہ ایک بدو نے آکر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھ کو عنایت کیجئے۔ آپؐ نے اس کو وہ سب دے دیئے۔ یہ فیاضی دیکھ کر ایسا اُس پر اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ سے جا کر کہا "بھائیو! اسلام قبول کرو، محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ اُن کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا[4]۔"

---

[1] صحیح بخاری باب بعث معاذؓ الی الیمن، جلد دوم۔ [2] التوبہ: ۶۰۔

[3] صحیح مسلم باب جودہ صلی اللہ علیہ وسلم جلد دوم۔ [4] صحیح مسلم باب جودہ صلی اللہ علیہ وسلم جلد دوم۔

ایک یہودی کا لڑکا آنحضرتؐ کی خدمت کرتا تھا۔ وہ بیمار پڑا تو آنحضرتؐ اس کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے اور جاکر اس کے سرہانے بیٹھے۔ پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کرلے۔ اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا ابوالقاسم (آپؐ کی کنیت) کی بات مان لے۔ چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا اور جب آنحضرتؐ وہاں سے اُٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچا لیا۔[1]

دعوتِ عقل اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کہ بغیر اس کے حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بنیادیں قائم نہیں رہ سکتیں۔ اس بنا پر مذاہبِ عالم کی تاریخ میں نبوتِ محمدیؐ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف لفظوں کے اُلٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقلِ انسانی کو مخاطب کیا۔ غور و فکر کی دعوت دی۔ فہم و تدبر کا مطالبہ کیا۔ اس نے اپنی ہر تعلیم کے ساتھ اپنی تعلیم کی خوبی، مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت کی۔ فرمایا:

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ	کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی
فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا	(یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے
الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝	لئے ظاہر کرو۔ تم تو گمان ہی کے پیچھے
قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ	چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو۔
(الانعام: ۱۴۸ — ۱۴۹)	کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز۔

نیز ارشاد ہوا :-

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

(الانفال: ۴۲)

تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جیے۔ اور اللہ ہی ہے سننے والا اور جاننے والا۔

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا :

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○

(یوسف : ۱۰۵)

اور آسمانوں میں اور زمین میں (خدا کی توحید کی) کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔

غور و فکر کرنے والے اہلِ ایمان کی تعریف میں فرمایا :

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۙ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج

(آل عمران : ۱۹۰-۱۹۱)

بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں۔ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے (یہ عالم) بیکار نہیں بنایا۔

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی۔ مگر بہرحال یہ خارجی استدلال تھا اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی۔ فرمایا:

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○	اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں
(الذّٰریٰت : ۲۱)	تم دیکھتے نہیں۔

صحیفۂ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

تَبْصِرَۃً وَّ ذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ○	یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع
(قٓ : ۸)	ہونے والے بندہ کے لئے۔
هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ	یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے
(الاعراف : ۲۰۳)	بصیرتیں ہیں۔
هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ	یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں۔
(الجاثیۃ : ۲۰)	
اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط	کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔
(النسآء : ۸۲)	
اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ○	کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے ہیں۔
(محمد : ۲۴)	
وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۙ○	حکمت والے قرآن کی قسم۔
(یٰسٓ : ۲)	
تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ ○	یہ حکمت والی کتاب کی

(یونس : ۱ ، لقمٰن : ۲) آیتیں ہیں۔

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا و سزا، عبادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اُس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں۔ آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں | یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو، جس نے اس کے اصول بتائے ہوں، جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استعداد اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں۔ اسلام میں مذہب کا اوّلین جزو ایمان ہے۔ ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرّہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔ فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ

دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی۔

(البقرۃ : ۲۵۶)

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذریعہ سے ہوئی، دوسری جگہ فرمایا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف : ۲۹)

اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے، عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے۔ اسی لئے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے زبردستی منوانا نہیں،

اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ (المائدہ : ۹۲)

ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔

آنحضرتؐ کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے بدرجہ غمگین تھے تسکین دی گئی،

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ط (الشوریٰ : ۴۸)

اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ ط لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○ (الغاشیہ : ۲۱-۲۲)

اے پیغمبر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔ تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ط اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ط (الشوریٰ : ۴۸)

پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے پیغمبر ہم نے تجھ کو ان پر نگاشتہ بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے۔ فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی	اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ (لوگوں کو زبردستی
الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ	مومن بنا دے) تو زمین کے سب لوگ
تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝	ایمان لے آتے۔ تو کیا اے پیغمبر تو لوگوں
(یونس: ۹۹)	پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے لڑنا جائز ہے اور آنحضرتؐ کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا۔ اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لڑائی صرف اس لئے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے۔ حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو اور نہ آنحضرتؐ کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو۔ بلکہ اگر ہے تو یہ ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ	اور اگر لڑائی میں کوئی مشرک تجھ سے
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ	پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے
كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ	یہاں تک کہ وہ خدا کا پیغام سن لے۔
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝	پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بے خوف
(التوبۃ: ۶)	ہو کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے اور اس کو کلام الٰہی سنایا جائے تاکہ اس کو غور و فکر کا موقع ملے۔ ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا اس کے تبدیلِ مذہب کا محرک تلوار

کے بجائے کوئی اور چیز (پیامِ حق) ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہوئی تھی جیسا کہ اس کا مفصّل بیان کتاب میں کہیں آئے گا۔ قرآن کی اس آیت میں:

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ	اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ
وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ	فتنہ نہ رہے اور دین پورا اللہ کے لئے
(الانفال: ۳۹)	ہو جائے۔

"فتنہ" سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ صحابہؓ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے۔ ایک شخص نے ان سے آکر کہا کہ کیا خدا نے فتنہ مٹانے کے لئے لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اوپر کی آیت پیش کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ہم یہ فرض آنحضرتؐ کے زمانہ میں ادا کر چکے ہیں۔ جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ اس کو لوگ یا مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔"[1]

میدانِ جنگ میں تبلیغ ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی بھی غلط تعبیر کی ہے۔ اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدانِ جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں۔ اوّل یہ کہ تم کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اُٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ۔ اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزّت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم تفسیر انفال۔

اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو۔ اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی۔ اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خونریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گیا ہے۔

یہ قانون جو سرتا پا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی۔ آنحضرتؐ کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے:

"جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے۔ اُن میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رُک جا۔ اس کو اسلام کی دعوت دے۔ اگر وہ قبول کر لے تو پھر اس سے رُک جا۔ اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے۔ اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی۔ قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فئی میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ۔ اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رُک جا۔ اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے۔"[1]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

یہ وہ اصول جنگ ہے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی، نہ یہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزور شمشیر مسلمان بنا لینا۔ صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدانِ جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی۔ حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ "میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیرِ فرمان ہیں اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم ہو کر رہو گے"[1] اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیلِ مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہ بن آثالؓ قبیلۂ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرتؐ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا۔ ثمامہؓ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبویؐ کے کھمبے میں باندھ دیئے گئے۔ آنحضرتؐ نماز کے لئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے۔ جواب دیا، محمدؐ میری رائے اچھی ہے۔ اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے، اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہو گا، اور اگر زرِ فدیہ چاہتے ہو تو مانگو۔ جو مانگو گے دیا جائے گا۔ آنحضرتؐ نے کچھ نہیں فرمایا۔ پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا۔ پھر تیسرے دن ہوا۔ تیسرے دن آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو۔ لوگوں نے کھول دیا۔ وہ رسّی سے کھُل کر آزاد ہو گئے مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی۔ مسجدِ نبویؐ کے قریب ایک نخلستان میں جا کر غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمۂ شہادت[2] پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ کیا کسی کو زبردستی

---

[1] جامع ترمذی ابواب السیر۔ [2] صحیح بخاری و سنن ترمذی ربط الاسیر۔

مسلمان بنانے کے لئے اس سے بہتر موقع مل سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام۔ اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا۔ قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً[1] لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو) یہ ارشاد نہ ہوا کہ "تلوار یا اسلام"۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ بالآخر شیرِ خدا علی مرتضیٰؓ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جائیں۔ وہ پوچھتے ہیں "یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟" فرمایا "آہستگی سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ۔ اور اس میں ان کا جو حق ہو گا وہ ان کو بتاؤ۔ خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں"[2] لیکن خیبر کے یہود نے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے۔ کفار کو مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل معلوم تھا۔ اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لئے کلمۂ توحید پڑھ دیتا تھا اور ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصّہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے "میں مسلمان ہوتا ہوں" تو اے

---

[1] محمد: ۴۔

[2] صحیح بخاری غزوہ خیبر۔

خدا کے رسولؐ میں کیا کروں۔ اس کو قتل کر دوں ؟ فرمایا "نہیں اس کا قتل جائز نہیں"۔ عرض کی یا رسولؐ اللہ! میرا ہاتھ اس نے کاٹ ڈالا۔ فرمایا "پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اِس اقرارِ توحید سے پہلے تھا"[1]

حضرت اسامہ بن زیدؓ آپؐ کے بڑے چہیتے خادم تھے وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا۔ انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پکار اٹھا۔ ایک انصاریؓ جو پہلے اس پر جھپٹے تھے وہ تو رُک گئے مگر اسامہؓ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا۔ آنحضرتؐ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اسامہؓ سے سخت آزردہ ہوئے۔ اسامہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا۔ "اے اسامہؓ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا"۔ پھر برابر یہ فرماتے رہے "اے اسامہ تم قیامت میں اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے"۔ اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت تھی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا[2]

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے۔ واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آور انہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے بموجب قتل نہیں کرتے جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لئے فوراً کلمۂ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان۔ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ کیا یہ صداقت ہے ؟

اسی طرح آنحضرتؐ کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا امرت ان اقاتل الناس حتی یقول لا الہ الا اللہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں اور جب وہ اقرار کرلیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچالیا اور ان کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے۔ اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت تک جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے۔ اور جب اس نے یہ کرلیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں۔ خواہ وہ حملہ کے ڈر سے کلمہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو۔ اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا انسان کا فرض نہیں خدا کا ہے۔ یہ ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لئے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کردیں گے۔ غور کرو اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار توحید کئے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے ؟ اور ہاری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کردیا جاتا۔ اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا — اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لئے جھکے

(الانفال : ۶۱) — تو تو بھی جھک جا۔

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ — اور اگر (لڑائی کے میدان میں) مشرکوں

اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ	میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو
كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ	اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○	کا کلام سن لے، پھر اس کو اس کے
(التوبہ : ۶)	امن کی جگہ پہنچا دے، یہ اس لئے کہ یہ
	بے علم لوگ ہیں۔

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلامِ الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو، مگر ایسا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ پلٹ کر بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ اسلام نے اُن مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے :

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ	تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں، پھر نہ
وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا	لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ○	ڈالیں تو اللہ نے تم کو اُن پر حملہ کرنے
(النسآء : ۹۰)	کی راہ نہیں دی۔

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ "یا تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی، اس صلح جوئی اور اس ترکِ جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی۔

مسلح تبلیغی جماعتیں | غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں، لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ

عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منتظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمّہ داری ہو۔ ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار تھا۔ راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا جن سے اِکّے دُکّے آدمی کا صحیح وسالم بچنا ناممکن تھا۔ اسی لئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لئے مسلح جاتی تھی۔ اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلّح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لئے کافی نہیں ہوسکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوّت شمار ہونے لگا تو آنحضرتؐ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمان کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لئے اِدھر اُدھر بھیجا۔ تب بھی وہ اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں۔ واقعۂ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا، واقعۂ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریۂ ابن ابی العوجا میں پچاس مسلمانوں کی شہادت، واقعہ ذاتِ اطلاح میں چودہ داعی مسلمان کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ و دعوت کی تنظیم آنحضرتؐ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے بنفس نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے۔ شہر سے نکل کر مکّہ کے آس پاس جاتے اور آنے جانے والوں کو بشارت سُناتے۔ مکّہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔ یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکّہ معظمہ کو قرار دیا جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے خود یہاں آتے

تھے۔ آپؐ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے۔ اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرتؐ کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس سفر کی مصلحت بھی عجیب وغریب تھی۔ ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گزرے اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوئی۔

مکہ میں آنحضرتؐ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعیٔ حق حضرت ابوبکرؓ تھے۔ مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان ان ہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیرؓ ہیں۔ جن کے مؤثر وعظوں کو سن کر آنحضرتؐ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ آکر اسلام نے امن واطمینان کی سانس لی تو آنحضرتؐ نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لئے جو اطرافِ ملک سے دارالاسلام میں آتے تھے، نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحابِ صُفّہ (چبوترے والے) مشہور ہے۔ اس میں بعض اوقات سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں۔ یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے۔ بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے تھے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ اکابر صحابہؓ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے، احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس صحابیوں کے نام جمع کئے ہیں جنھوں نے از خود آنحضرتؐ کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا۔ ان کے نام یہ ہیں: ابوذر غفاریؓ، طفیل بن عمرو دوسیؓ، جعفر طیارؓ، عمرو بن عبسہ سلمیؓ، ضماد بن ثعلبہؓ، خالد بن ولیدؓ، علی بن ابی طالبؓ، مہاجر بن ابی امیہؓ، زیاد بن لبیدؓ، خالد بن سعیدؓ، عدی بن حاتمؓ، علاء بن حضرمیؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، معاذ بن جبلؓ جریر بن عبداللہ بجلیؓ دحیہ کلبیؓ، عمرو بن امیہ ضمریؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، عمرو بن العاصؓ، وبر بن نخیسؓ، عروہ بن مسعود ثقفیؓ، عامر بن شہرؓ، منقذ بن حبانؓ، ثمامہ بن آثالؓ، محیصہ بن مسعودؓ، احنفؓ، ابوزید انصاریؓ، عمر بن مرہؓ، عیاش بن ربیع مخزومیؓ، واثلہ بن اسقعؓ، عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ، حاطب بن ابی بلتعہؓ، سلیط بن عمرو بن عبد شمسؓ، شجاع بن وہب اسدیؓ۔ ان ہی مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت سیرۃ کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے۔ سلسلہ بیان کے لئے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں۔ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ کے شب و روز کے ارشادات سُننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن قرآنِ پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے۔ اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے۔ خود آنحضرتؐ اور دوسرے مبلغ صحابہؓ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف

قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں اُن کو اِس کا موقع مل جاتا وہاں اِس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی۔ اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا۔ اس کی تبلیغ کے لئے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے ممکن نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا۔ فرمایا:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ○ (الفرقان : ۵۲)

تو اے پیغمبر منکروں کا کہا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور سے جہاد کر۔

اس پیغامِ الٰہی کے زمین میں اُترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے۔ فرمایا:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ○ (قٓ : ۴۵)

تو اے پیغمبر اُن کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعہ سے یاد دلا۔

قرآن رحمتِ عالم کا پیام عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے۔ فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ○ (الفرقان : ۱)

برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندوں پر اس لئے اتاری تاکہ وہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کرے۔

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب عرب میں صرف تین قومیں تھیں جن کا اسلام [illegible] گویا تمام

جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ۔ مشرکینِ عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے۔ یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا۔ نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔

اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار کو پہلے دعوتِ توحید دی جاتی۔ پھر یہود کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا جاتا۔ اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بناء پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے۔ تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفارِ مکہ تھے اسی لئے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائبِ قدرت کا بیان، عذابِ الٰہی سے تخویف اور صنادیدِ قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آنحضرتؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا۔ اور اب قرآن مجید کا طرزِ خطاب بدل گیا۔ چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات، ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصصِ بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں۔ سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتحِ مکہ کے بعد قبائلِ عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا۔ اسی زمانہ میں سورۂ آلِ عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے۔ بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے اور وہ بھی ایرانی النسل تھے۔ خالص عرب نہ تھے۔ اس لئے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان سے خطاب نہیں کیا ہے۔ البتہ جابجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اور ان کے عقائد کی تردید کی اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کے لئے کیا چیز درکار تھی ؟

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا لیکن ابتداء میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام قبول کیا ان کے اوصاف کے پیشِ نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل کا جویاں تھا۔ اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طائرِ قدس اپنے پَر ڈال دیتا تھا۔ چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا وہ وہی تھے جو نیک طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جُو تھے۔ اور جو نبوّت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے۔ گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدّن سے بہرہ ور تھے۔ اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام قبول کرنے میں پیش قدمی کی وہ بھی وہی تھیں جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ عرب کے دو مختلف حصّوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصّہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصّہ میں سے مدینہ منوّرہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدّنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدّن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثّر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا۔ اہلِ مدینہ بھی یہودیوں کے تمدّن و معاشرت، روایات اور رسم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے[1]

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں۔ لیکن مسلمانوں کی کوئی جرّار فوج مدینہ، یمن، عمان، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی۔ انصارِ مدینہ نے خود مکّہ میں آکر اسلام کو لبیک کہا۔ اطرافِ مدینہ کے قبائل میں غفّار نے خود مکّہ آکر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا۔ یمن سے دوس کے قبیلوں کے آدمیوں

---

[1] مستدرک حاکم جلد دوم (صحیح علی شرط مسلم)۔

نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لئے پیش کیا۔ اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا۔ ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہوگیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا۔ وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا۔ ایک بار آپؐ نے عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک آدمی بھیجا۔ وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زدوکوب کیا۔ اس نے آکر آپؐ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر اہلِ عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے۔[1]

یمامہ کے رئیس ثمامہؓ قید ہو کر مدینہ آئے۔ یہاں آزاد کر دیئے گئے۔ مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی۔ خود بخود مسلمان ہوگئے اور اپنے قبیلہ میں جاکر اسلام کے داعی بن گئے اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریۂ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافاتِ بحرین میں تھا۔ اسی قریۂ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ چنانچہ مسجد نبویؐ کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا۔[2] بارگاہِ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائلی عرب پر پیش دستی کی۔ چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلۂ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت پذیر تھا۔

اہلِ یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اوّلین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرتؐ کی ہجرت کا

---

[1] صحیح مسلم فضائل اہل عمان۔ [2] صحیح بخاری، باب الجمعہ فی القریٰ والمدن۔

حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے باون آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے۔ بحری سفر تھا۔ وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو بادِ مخالف کے جھونکوں نے اس کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرت تھا۔ وہاں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آنحضرتؐ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے، تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتبِ آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی۔ خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا	دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب
وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ	سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے
اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ	اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝	خدا نے اپنے رسول پر اتارے ہیں، اور
(التوبہ: ۹۷)	اللہ جانتا اور حکمت والا ہے۔

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں۔ جو لوگ بادیہ سے آکر اسلام لاتے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام بیعتِ اعرابی تھا جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی۔ اس بناء پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہؓ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ

---

[1] صحیح مسلم فضائلِ جعفر بن ابی طالبؓ و اسماء بنت عمیسؓ۔

بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔[1]

اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع گزشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کُھل جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے دینِ حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپؐ کو کیونکر کامیابی ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبولِ اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے تو حسبِ ذیل اسباب سامنے آئیں گے:۔

۱۔ اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا۔ قرآن مجید جس مؤثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے، عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع جن کا ذکر اوپر ہو چکا، فنا ہو جاتے تھے۔ جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہرِ قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرامِ فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ	تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالانکہ
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ	تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○	زندگی بخشی، پھر ایک دن تم کو مُردہ بنا
(البقرۃ: ۲۸)	دے گا، پھر زندہ کرے گا اور پھر اسی کے
	پاس واپس کئے جاؤ گے۔
اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان و زمین کی پیدائش میں، شب و
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	روز کے اختلاف میں، ان کشتیوں
الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ	میں جو سمندر میں انسانوں کے لئے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الامارۃ اور سنن نسائی کتاب البیعۃ۔

النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا
مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّ تَصْرِيْفِ
الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

(البقرۃ : ۱۶۴)

سودمند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برسانے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کے پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے میں اور ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں دانش مندوں کے لئے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ
يُرْجَعُوْنَ ○

(اٰل عمرٰن : ۸۳)

آسمان و زمین میں جو بھی ہے، برضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گزار ہے، اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ
لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۙ○ الَّذِيْنَ
يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا
وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا
مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ

آسمان و زمین کی خلقت اور شب و روز کے الٹ پھیر میں ان اربابِ عقل کے لئے بے شبہہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا

(آل عمران : ۱۵۰-۱۹۱)

نہیں کیا۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ
الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ
وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ
فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ
وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ
وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا
اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ

(یونس : ۲۲)

وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں
سفر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی
میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی
والوں کے لئے جاری ہے اور لوگ
خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعتہً) زور کا
جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آ
گئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب
وہ گھر گئے۔ اس وقت وہ خدا کو مخلص
ہو کر پکارنے لگتے ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ
اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا
وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝
وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ
وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ
لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ
بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے
کہ تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے
بنائے کہ تم کو ان سے تسلّی ہو اور تم
میں باہمی محبّت اور ہمدردی پیدا کی۔
اس بات میں سوچنے والوں کے لئے
نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں
سے آسمان و زمین کا پیدا کرنا ہے اور
تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف
ہونا ہے۔ اس بات میں جاننے والوں کے

مِّنْ فَضْلِهٖ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ○

(الروم : ۲۱-۲۳)

لئے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے۔ اس میں سننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

خدا یا ایک قوّتِ اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے۔ لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مُردہ اور بے حس ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا تھا:

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط

(ابراهیم : ۱۰)

کیا خدا میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ج ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

(البقرة : ۲۸)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی دی پھر وہ تم کو موت دے گا پھر وہ تم کو زندہ کرے گا پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

عرب میں ملحد کم تھے۔ زیادہ تر بلکہ قریبًا تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظام عالم اُن ہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہ راست اس کو کام پڑتا ہے اُس کو زیادہ مانتا ہے، اُسی سے زیادہ محبّت کرتا، اُسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے۔ چونکہ

مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلّہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی سب اجرامِ فلکی یا اصنام کا کام ہے اس لئے ان کو عبدیت کا جو کچھ تعلّق تھا اُن ہی معبودوں سے تھا۔ وہ اُن ہی کی عبادت کرتے تھے، اُن ہی سے محبّت رکھتے تھے، اُن ہی پر نذر چڑھاتے تھے، اُن ہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے اور معرکوں میں اُن ہی کی جے پکارتے تھے۔ اِس بناء پر آنحضرتؐ کا اصلی کام اِسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصل وجودِ باری کے متعلّق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت مؤثر پیرایوں میں شرکت کی لغویت کا اظہار کرتا تھا:

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ	کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور
جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا	اس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور اس
رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ	کے لئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور
حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ	دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھی، کیا
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَّنْ	خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے؟
يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ	بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ
يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ	جانتے نہیں، کیا وہ جو پریشان خاطروں
خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ	کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتے
قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ	ہیں اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا
يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	کا حکمراں بناتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی
وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ	اور بھی خدا ہے؟ تم بہت کم سوچتے ہو۔
يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ	کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں

تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○
اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ
الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ
هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ○

(النمل: ۶۱ — ۶۴)

میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت
(بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے۔
کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے؟
مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا
ان سے برتر ہے۔ آیا کون ہے جو آفرینش
کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو لوٹاتا ہے اور
وہ کون ہے جو تم کو آسمان و زمین سے
روزی دیتا ہے؟ کیا خدا کے سوا کوئی اور
ہے؟ تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ

کفّار اور مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ[1] (یعنی جب ہڈیاں سڑ گل چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا) قرآن مجید اُن سے خطاب کرتا تھا:

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۙ ○
ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۙ ○
فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ
وَالْاُنْثٰى ○ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ
عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ○

(القیٰمۃ: ۳۷ — ۴۰)

کیا انسان پہلے منی نہیں تھا پھر گوشت
کا لوتھڑا بنا پھر خدا نے اس کو ٹھیک
کیا۔ اور اس سے دو جوڑ مرد اور
عورت بنائے کیا وہ اس پر قادر نہیں
کہ وہ مُردے کو پھر سے زندہ
کر دے۔

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال ہر چیز کو قرآن اس مؤثر اور دلنشین طریقہ سے ادا

---

[1] یٰسٓ: ۷۸

کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا۔ اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا۔ حقیقی جحود اور انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہؓ، بڑے بڑے روسائے قبائل، بڑے بڑے شعراء اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان لائے۔ حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا۔ عتبہ جو رئیسِ قریش اور علومِ عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر کہا کہ تم نبوّت کی دعوت سے باز آؤ ہم تمہارے لئے سب کچھ مہیّا کر دیتے ہیں، آپؐ نے حٰمٓ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں۔ جب یہ آیت آئی:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ	تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں
صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ○	تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں
(حٰمٓ السجدہ: ۱۳)	جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح

ہے،

تو عتبہ نے بے تاب ہو کر آنحضرتؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "خدا کے لئے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں"، پھر واپس جا کر قریش سے کہہ دیا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ تو شعر ہے نہ جادو ہے اور نہ کہانت[1] ہے (بلکہ کوئی اور چیز ہے)۔ حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیسؓ کو جو شعرائے عرب میں تھے، آنحضرتؐ کی خدمت میں تحقیقِ حال کے لئے بھیجا تھا وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور

---

[1] علامہ ابنِ تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد چہارم میں مسند ابو یعلیٰ وغیرہ سے روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔

شاعر کہتے ہیں لیکن میں کاہنوں اور شاعروں دونوں کے کلام سے واقف ہوں۔ ان کا کلام دونوں سے الگ ہے۔ انیسؓ کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔[1]

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا جب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ نے یہ آیتیں پڑھیں:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں
وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ	کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ	سے، بُری بات سے اور ظلم سے منع
يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝	کرتا ہے۔ وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید
(النحل: ۹۰)	تم سمجھ جاؤ۔

ولید نے کہا پھر پڑھنا۔ آپؐ نے دوبارہ پڑھا۔ واپس گیا اور قریش سے جاکر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔[2]

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقینِ اسلام میں ہیں۔ یہی آیتیں ہیں جن کو سُن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا۔ وہ خانۂ کعبہ میں جا رہے تھے کہ آنحضرتؐ نے راستہ میں اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اُترا ہے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں۔ عثمانؓ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔[3]

جبیر بن مطعمؓ نے کفر کے زمانہ میں آنحضرتؐ کو سورۂ طور پڑھتے سُنا۔ جب اس آیت

---

[1] صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ۔ [2] الجواب الصحیح جلد چہارم بحوالہ عبدالرزاق۔

[3] مسند ابن حنبل جلد اوّل و ادب المفرد امام بخاری باب البغی۔

پر پہنچے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ	کیا لوگ از خود پیدا ہو گئے یا یہ خود
الْخَالِقُوْنَ ○ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ	خالق ہیں؟ کیا آسمان اور زمین کو ان ہی
وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ○	لوگوں نے پیدا کیا؟ بلکہ (واقعہ یہ ہے)
اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ	کہ ان میں ایمان نہیں۔ کیا ان کے پاس
هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ○	خدا کے خزانے ہیں؟ کیا یہی لوگ سربراہ کار
(الطور: ۳۵ - ۳۷)	ہیں؟

تو خود جبیرؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔[1]

طفیل بن عمرو الدوسیؓ مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے۔ ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے۔ لوگوں کو اُن کے آنے کی خبر ہوئی تو اُن کے پاس گئے اور آنحضرتؐ کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا۔ وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں۔ لیکن جب حرم میں اتفاقیہ آنحضرتؐ کی زبان سے قرآن سُنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔[2]

ہجرت سے پہلے آنحضرتؐ نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ اُدھر سے اس کا جواب ڈھیلا اور پتھر تھا تاہم خالد العدوانیؓ نے جو طائف کے رہنے والے تھے، آپؐ کو

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ ○	قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے
(الطارق: ۱)	والے ستارے کی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ طور۔ [2] ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاد) نے بہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحٰق کے حوالہ سے لکھا ہے۔

پڑھتے سنا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالتِ کفر میں پوری سورہ یاد کرلی[1] اور آخر اسلام لائے۔

حضرت ابوبکرؓ کو قیامِ مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ لیکن نماز بلند آواز سے پڑھتے تھے جس کو سُن کر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھچتا۔ چنانچہ اسی بناء پر کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو۔ اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوتی جاتی ہیں[2] انصار اول اول جب مقامِ عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر اسلام لائے تھے۔ جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلۂ تسخیر لے کر جاتے۔ نجاشی کے دربار میں کفارِ قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں[3]

حبش میں جب آپؐ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے، تحقیق حال کے لئے مکہ میں آئے اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے۔ آنحضرتؐ کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا۔ انہوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے[4] لَكُمْ دِينُكُمْ وَلَنَا دِينُنَا۔

---

[1] مسند ابنِ حنبل جلد چہارم۔ [2] بخاری شریف ذکرِ ہجرت۔ [3] مسند ابنِ حنبل جلد پنجم۔
[4] ابنِ ہشام جلد اول ذکرِ ہجرتِ حبش۔

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا۔ چنانچہ اہلِ ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی صدہا کافر مسلمان تھے۔[1]

ایک ضروری نکتہ عام خیال ہے کہ اہلِ عرب جو قرآن مجید سُن کر اسلام قبول کر لیتے تھے وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لئے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشا میں ہے اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجزہ ہوتا ہے جیسا اب ہے۔

موانع کا ازالہ عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام اور اعتقاداتِ باطلہ تھے جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں۔ مقدّم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجازِ نبویؐ نے استیصال کر دیا۔ عرب میں جو لوگ صاحبِ فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے، یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعتہً فنا نہ ہو جاتے۔ یہ اربابِ اثر جب خود متاثّر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ہر معزز رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجّہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے انہوں نے بار بار دارالنبوّۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں لیکن نصرتِ ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی۔ اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی۔ اسلام سے اگر ایک رئیس کی شانِ ریاست و خودسری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے۔ غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے۔ صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی [illegible]

نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے اگر کوئی خود غرضی بھی کرنا چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سوداگران نہیں پڑتا تھا۔ مولفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریحی نظیر تھا۔

اب صرف معاشی ضرورت سدّ راہ ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذریعۂ معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

نبوّت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا۔ بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیّل ایک انسان کے ذہن میں آسکتا تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی۔ ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعیٔ نبوّت بظاہر جامۂ بشریت میں ہے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق، اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت، اپنے ربّانی کرشموں کی بناء پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے۔ مَاهٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ[1] قرآن مجید نے آنحضرتؐ کے صدقِ نبوّت پر اسی مقدّس اور معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○	(اے قریش) نبوّت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدّت دراز تک زندگی بسر کی ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟
(یونس: ۱۶)	

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس سے ظہورِ نبوّت سے پہلے ہی امین کا خطاب آپؐ نے حاصل کر لیا تھا۔ بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ نبوّتِ محمدیؐ کا معتقدِ اوّلین دنیا میں کون تھا؟ امّ المومنین خدیجہ بنت خویلدؓ لیکن ان کی اس

---

[1] یوسف: ۳۱۔

زود اعتقادی کا راز کیا تھا؟ چالیس برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ! وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں، "محمدؐ! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو۔ ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو۔ محتاجوں کی خبر لیتے ہو۔ مہمانوں کے ساتھ بہ مدارات پیش آتے ہو۔ جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔"[1]

سُن چکے ہو کہ عرب میں آپؐ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابو ذر غفاریؓ نے انیسؓ اپنے بھائی کو تحقیقِ حال کے لئے بھیجا۔ انہوں نے واپس آکر پیکرِ نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا "میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔"[2]

نبوت کے بعد قریش نے ذاتِ نبویؐ کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی آپؐ کی طرف منسوب نہ کر سکے۔ اسلام کے سب سے اوّلین اعلانِ دعوت کے موقع پر جب آپؐ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو مخاطب کیا اور پوچھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا سچ مانو گے؟ سب نے بیک آواز کہا "محمدؐ! تیری بات آج تک ہم نے جھوٹ نہ پائی"[3] ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۶ھ میں ہرقل قیصرِ روم کے دربار میں کفارِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اوصاف کے متعلق اپنی شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک

---

[1] صحیح بخاری، بدء الوحی۔ [2] صحیح بخاری جلد اوّل قصۂ اسلام ابی ذرؓ۔ [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت و صحیح مسلم کتاب الایمان، باب وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔

حرف بھی صداقت کے خلاف پیش نہ کر سکے۔ انہوں نے شہادت دی کہ "محمدؐ کبھی جھوٹ نہیں بولے، انہوں نے کبھی بد عہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت، صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں"۔ ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں۔ یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرتؐ کی کامیابی کا یقین کیا۔[1]

کتاب کی دوسری جلد میں آپؐ کے تمام محاسنِ اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، حُسنِ معاملت، جود و سخا، عدم تشدد، عفو و درگزر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرتؐ کا ایک معجزہ تھا، اور یہ معجزہ تسخیرِ قلوب ہی کے لئے عطا ہوا تھا۔ قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے:

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا	اور محمدؐ اگر تم درشت خو اور
انْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ص	سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے
(آل عمران : ۱۵۹)	پاس سے چل دیتے۔

آپؐ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کے دائرۂ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپؐ سے بہت سی بکریاں مانگیں۔ آپؐ نے دے دیں، اس پر آپؐ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے کہا "لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمدؐ اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا"۔[2]

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرتؐ نے اس کو تین سو اونٹ دے

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی۔ [2] صحیح مسلم جلد دوم باب ماسئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئا قط فقال لا۔ صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء

دیئے۔ خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ نے مجھ کو اس قدر دیا کہ آپؐ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے[1] ہند خاندانِ نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی۔ جنگِ اُحد میں قوتِ بازوئے اسلام حضرت حمزہؓ کے شکم کو اُسی نے چاک کیا تھا۔ اُسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی اور پھر اُگل دیا تھا اور اُسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا۔ وہ فتحِ مکہ میں بھیس بدل کر آپؐ کی خدمت میں اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئی اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی۔ لیکن دربارِ رسالت میں پہنچ کر آپؐ کے حسنِ خُلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی "یارسولؐ اللہ! سطحِ زمین پر آپؐ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانہ مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپؐ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے۔ آپؐ نے یہ سُن کر فرمایا خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا۔[2]

آپؐ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا۔ اُس نے تقاضا کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اِس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ "میں تو لے ہی کے ٹلوں گا"۔ آپؐ نے کہا "تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں"۔ چنانچہ آپؐ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اُس کے ساتھ بیٹھے رہے۔ صحابہؓ نے اُس کی اِس گستاخی پر ناراضی ظاہر کی اور خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یارسولؐ اللہ! آپؐ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں! لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمّی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں"۔ دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ "میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے۔ میں نے یہ گستاخی صرف اس لئے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف

---

[1] صحیح مسلم باب ماسئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئا قط فقال لا۔

[2] مسلم جلد دوم باب قضیۂ ہند۔

مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں"[1]

ثمامہ بن آثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا صحابہؓ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا۔ گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجدِ نبویؐ کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا۔ آنحضرتؐ نماز کے لئے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ اس نے کہا کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپؐ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا۔ اگر مال کی خواہش ہے تو فرمائیے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سُن کر آپؐ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا۔ تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی۔ آنحضرتؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کی بند گرہ کھول دی اور رہا کر دیا۔ اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا۔ غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر آنحضرتؐ کی طرف مخاطب ہوا "محمدؐ! زمین پر آپؐ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے مجھ کو آپؐ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن وہ آج میرے لئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے۔ مجھے آپؐ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن آج وہ تمام شہروں سے زیادہ خوشنما نظر آتا ہے"[2]

ایک بار آپؐ کسی سفر میں تھے اور پانی ساتھ نہ تھا صحابہؓ نے پیاس کی شکایت کی آپؐ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا۔ راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھری ہوئی لئے جا رہی تھی۔ دونوں صاحب اس کو آنحضرتؐ کی خدمت

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الفتن فی اخلاقہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ [2] صحیح مسلم جلد دوم کتاب الجہاد والسیر۔

میں لے آئے۔ آپؐ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیئے۔ صحابہؓ نے باری باری سے پانی پینا شروع کر دیا۔ وہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی۔ فراغت کے بعد اس کی محنت کے صلہ میں آنحضرتؐ نے کھجور کا آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا جمع کر کے ایک کپڑے میں بندھوا کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا۔ وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بددین کہا کرتے ہیں۔ خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے اور یا واقعی خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگانِ نبوّت کے فیضِ اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا[1]

نبی کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اس کا اخلاق ہی نہیں اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی معصوم شکل و صورت اور اس کی ایک ایک ادا اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے۔

ع روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است (رومی)

آپؐ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوّت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا۔ حضرت عبداللہؓ بن سلامؓ جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے۔ آمد آمد کی خبر ان کے کان میں پہنچی تو فوراً آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ فرما رہے تھے:

افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام[2]

---

[1] بخاری جلد اول کتاب التیمم۔ [2] مسند ابنِ حنبل جلد پنجم۔

واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرتؐ اٹھ کر حضرت ایوب انصاریؓ کے مکان میں جونہی پہنچے حضرت عبداللہ بن سلامؓ بھی آئے اور کہا کہ میں آپؐ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپؐ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں[1]۔

ضماد ایک شخص تھے جن کے ساتھ زمانۂ جاہلیت میں آپؐ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے۔ وہ جنون کا علاج کرتے تھے۔ اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپؐ (نعوذ باللہ) مجنون ہو گئے ہیں۔ وہ آپؐ کے پاس آئے اور کہا "محمدؐ! میں جنون کا علاج کرتا ہوں"۔ اس کے جواب میں آپؐ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ	تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں میں اس کی
من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و	حمد کرتا ہوں اور اس سے مدد چاہتا ہوں
من یضللہ فلا ھادی لہ و	خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص
اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ	گمراہ نہیں کر سکتا۔ جس کو گمراہ کرتا ہے اس
لا شریک لہ و اشھد ان محمدا	کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا۔ میں گواہی
عبدہ ورسولہ۔	دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔
	وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں
	ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کا
	بندہ اور رسول ہے۔

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے۔ آپؐ نے تین بار ان کلمات کا اعادہ فرمایا۔ انہوں نے کہا میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے

---

[1] بخاری جلد اول۔ باب ہجرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہؓ الی المدینہ۔

لیکن آپؐ کے اس کلام کی طرح مؤثر کلام کبھی نہیں سُنا۔ وہ سمندر تک پہنچ جائے گا۔ ہاتھ لائیے میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں[1]

حضرت حلیمہؓ کے شوہر حارث یعنی آپؐ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مرکر پھر زندہ ہوں گے۔ انہوں نے آپؐ سے کہا" بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟"۔

آپؐ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا" ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہوگئے اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا[2]

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے آپؐ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی۔ آپؐ کی شکل نہایت پُرجلال تھی، چہرہ پُرنور تھا، آواز مؤثر اور پُررعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا حضرت عبداللہ بن سلامؓ نومسلم یہودی عالم آپؐ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر اسی اثر سے متاثر ہوئے اور بے اختیار بول اُٹھے تھے،

وجهه ليس بوجه كذاب	جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہوسکتا۔
(ترمذی)	

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوا تھا،

هٰذا وجه مبارك	یہ مبارک چہرہ ہے۔
(ابوداؤد حج جلد اول)	

---

[1] مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ۔ [2] اصابہ جلد اول تذکرۂ حارث۔

بارگاہِ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا۔ ابورافع نامی ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپؐ کی خدمت میں آئے تھے جونہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ بہزار جان شیدا تھے۔ اسلام قبول کیا[1] اور آپؐ کی غلامی کو فخر سمجھا[2]

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب یستجن بالامام فی العہود۔ [2] اصابہ واستیعاب۔

اِسلام

یا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ کام

تعلیماتِ نبویؐ کی ہمہ گیری آنحضرتؐ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُراثر دعوت، اعجازِ معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو برتو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ تیئیس برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی، اخلاص، ایثار، تدین، تقویٰ، ایمان داری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا اور گویا یہی حقیقت تھی جس کی طرف آپؐ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا۔

الا ان الزمان قد استدار	ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اس
کھیئۃ یوم خلق اللہ السمٰوٰت	حالت پر آگیا جس حالت پر

والارض — اُس دن تھا جس دن خدا نے آسمان

(صحیح بخاری) — وزمین کو پیدا کیا۔

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپؐ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پُرورو داعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے[1]:۔

قد ترکتم علی البیضاء لیلھا کنھارھا۔ — میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔

اور آخری حجۃ الوداع کے مجمعِ عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ — آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔

(المآئدہ، ۳)

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے لکھتے ہیں:

"محمدؐ کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا۔ آپؐ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپؐ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپؐ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔"[2]

ایک دُور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس کا علم عرب اور اسلام کے متعلق

---

[1] سنن ابنِ ماجہ ابواب سنت و بدعت و مستدرک حاکم جلد اوّل و مسند ابنِ حنبل جلد چہارم [2] لائف آف محمدؐ مارگولیوتھ۔

صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہلِ قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے۔ بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاعص) نے لکھا،

"دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس[1] کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی، لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ امّی اور ناخواندہ تھا۔ وہ کون؟ محمدؐ بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبرؐ۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا، ترقّی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے۔ اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آسکتی ہے۔ حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تاکہ اقوامِ اسلامی میں اہلِ استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی۔ قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے۔ قوم کے ہر فرد کو ترقّی کا موقع اسطرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر

---

[1] مدینہ منورہ میں آپؐ دس برس زندہ رہے تھے۔

بزرگی حاصل ہے۔ اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا۔ یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کر دیا۔ نامسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ "تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے"۔ خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں۔ اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کئے۔ عورت کا مرتبہ بلند کیا۔ نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے۔ بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا۔ علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی۔ اس نے حکمت کو ایک مومن کا گمشدہ مال قرار دیا اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا۔ کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا"۔

انگلستان کے مشہور انشا پرداز کارلائل نے اپنے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے وجودِ گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپؐ کو نبوت کا ہیرو قرار دے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "محمدؐ" آپؐ کی نسبت کہتا ہے۔

"قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا"[1]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون "قرآن" جلد پانزدہم۔

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاءؑ میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کئے اور اصلاحاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو۔ اور یہ اس لئے کہ تمام انبیاءؑ میں خاتم نبوت، مکمّلِ دین اور آخری معلّم کی حیثیت آپؐ ہی کو عطا ہوئی تھی۔ اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپؐ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپؐ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی حالانکہ آپؐ نے فرمادیا کہ "میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں"[1] صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپؐ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے۔ جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا۔ بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا تھا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیئے۔ حضرت سلمانؓ نے کہا "ہاں یہ سچ ہے۔ آپؐ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں، نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، ان میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو"[2] نبوتِ محمدیؐ کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدّن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدّن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے۔ عرب کے بدوؤں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے آپؐ کی بعثت تھی۔ اس لئے آپؐ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایات ہیں۔ آج

---

[1] صحیح بخاری جلد اوّل باب خاتم النبیین و جامع ترمذی کتاب الامثال، [2] جامع ترمذی و سنن ابنِ ماجہ کتاب الطہارت۔

یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے اور اُن کو متمدّن اور مہذب بنانے کے لئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر کہ جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے، دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدّن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آداب تمدّن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار، انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

اسلام کے چار حصے آپؐ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ چار ابواب پر منقسم ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپؐ نے بتایا ہے کہ ہر انسان کا ایک تعلّق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ۔ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اُس کا ایک تعلّق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت۔ اس کو ایک لگاؤ تو عالمِ غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے۔ پہلے کے ساتھ اس کا تعلّق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلّق برادری اور بھائی چارے کا ہے۔ خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلّق اگر صرف ہمارے ذہنی قومی اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے۔ اور اگر اُن قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے۔ باہم

انسانوں اور انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر اُن کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے۔ اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اُس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلّقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجاآوری کا نام عملِ صالح ہے۔ اور ان ہی دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے۔ عملِ صالح کی تین قسمیں ہیں۔ خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اُس کے احکام کی تعمیل۔ بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانونِ الٰہی کی پابندی اور اُن کے ساتھ محبّت، الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ۔ اور گو اس لحاظ سے کہ اُن میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے۔ الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق۔ ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لئے آپؐ کی بعثت ہوئی اور یہی آپؐ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں۔ یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں۔ ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں۔ اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں۔ عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں۔ اسلام کے معلّم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا۔

الا و ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا و ھی القلب

(صحیح بخاری کتاب الایمان)

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے قَلْبٌ سَلِیْمٌ

(سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے۔ دوسرا اس کے مقابل قَلْبٌ اَثِیْمٌ[1] (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اور تیسرا قَلْبٌ مُنِیْبٌ (رجوع ہونے والا دل)۔ یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے۔ ہمارے تمام اعمال کا محرّک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے۔ اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے۔ اسی لئے آپؐ نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات	تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔
(صحیح بخاری آغاز کتاب)	

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپؐ نے یوں ادا فرمایا:

انما لامرئ ما نوی فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او الی امرأة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه۔	ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)۔

آج کل علمِ نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز

---

[1] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (بقرہ: ۲۸۳)

حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ اب صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدّمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصولِ موضوعہ ہم پہلے نہ تسلیم کریں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں۔ وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس لئے اس پابزنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات، اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔ اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ "عملِ صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اُس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حُسنِ عمل کا دار و مدار ہے۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے۔ مگر بانیہمہ مشرک تھا۔ اُس کی نسبت آنحضرتؐ سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ "یارسول اللہؐ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے کیا اُن کا ثواب اس کو ملے گا"؟ فرمایا "نہیں اے عائشہؓ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بارِالٰہا میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے"۔[1]

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ غزوات۔ نسخہ قلمی دارالمصنفین و ابن حنبل جلد ششم۔

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ "اے محمدؐ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے"۔ فرمایا "کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو"؟ اس نے جواب دیا "نہیں"۔ فرمایا "واپس جاؤ کہ میں اہلِ شرک سے مدد کا خواستگار نہیں"۔ دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی۔ مسلمانوں کو اُس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرتؐ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ "کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول پر ایمان ہے"؟ اس نے پھر نفی میں جواب دیا۔ آنحضرتؐ نے پھر وہی فرمایا کہ "میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا"۔ غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اُس کی بہادری کے باوجود اس سے آپؐ کی بے نیازی کی کیفیت نے اُس کے دل پر اثر کیا۔ تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپؐ نے دریافت فرمایا کہ "تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے"؟ تو اُس نے اثبات میں جواب دیا اور نورِ اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔[1]

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اُس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اُڑا اُڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور اُن کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اُس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے، بے بنیاد اور بے اصل ہیں:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ	جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا
كَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ	ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے جس پر
يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا	آندھی والے دن زور سے ہوا چلی۔ وہ

---

[1] صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم۔

كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ○

(ابراھیم: ۱۸)

اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

سورہ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اُس کے وجود کی حقیقت فریبِ نظر سے زیادہ نہیں:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا

(النور: ۳۹)

اور جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

اُس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش و حواس اور اعضا کی سلامتی کے باوجود اُن سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ○

(النور: ۴۰)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو۔ اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج ہو اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو۔ اندھیرے میں ایک کے اوپر ایک کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سُجھائی نہ دے۔ جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لئے نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی اسی لئے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی۔ وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا اُن سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے تو اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے اس بنا پر آنحضرتؐ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ○

(البقرۃ : ۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور ایذا دے کر اس طرح نہ برباد کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو۔ ذرا اس پر پانی برسا اور مٹی دُھل کر پتھر رہ گیا، جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اُگے گا نہیں اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے۔ وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ خدا کے وجود کا اقرار اور اُس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و

غایت ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے دل کا نور ہے۔ یہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دُنی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے۔ انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لئے نہیں بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لئے اور خوارقِ عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لئے۔[1] اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی، مراقبہ، تصوّر، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ عیسائیوں، زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے جس سے تصوریّت عملیت پر غالب آگئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے علم و عمل، تصوّر اور فعل، عقلیت اور عملیّت میں لزوم ثابت کیا۔ مگر اصلی زور انسان کی عملیّت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے۔ عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصوّرات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا۔ چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں،

---

[1] متی ۱۷-۲۰۔

ان کا نام عقیدہ اور اُن پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا۔ آپؐ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کئے۔ خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلۂ مقصود قرار پا سکے۔ اور اُسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو۔ اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اُس کی مرضی ہے۔ اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرّا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو۔ اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے اِن احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم اُن ہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے۔ اگر ان کی صداقت، سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغامِ ربّانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے۔ پھر اچھے اور بُرے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے، کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے

نہیں ہوگی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں۔ مادّیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں۔ مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں۔ اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ لکھتے جاتے ہیں تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا بُرا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں۔ اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضرور ہے۔ ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جوابدہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے۔ اس لئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی اصلاح و فلاح ناممکن ہے اور اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ یا تین اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ پر اُس کے تمام رسولوں پر اُس کی کتابوں پر، اُس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا۔ یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر

سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ	جو لوگ غیب (خدا، خدا کی صفات اور ملائکہ)
(البقرۃ : ۳)	پر ایمان رکھتے ہیں۔
وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ	اور جو کچھ تم پر (اے محمدؐ) اترا اور تم سے پہلے
اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ	(پیغمبروں پر) اترا اس پر یقین رکھتے ہیں
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝	(یعنی انبیاءؑ اور ان کی کتابوں پر اور آخرت
(البقرۃ : ۴)	(روزِ جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ	اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر،
الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ	آخری دن پر، فرشتوں پر اور کتاب
وَالنَّبِیّٖنَ ۚ	پر اور سب نبیوں پر ایمان
(البقرۃ : ۱۷۷)	لائے۔

سورہ کے آخر میں ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ	پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ
مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ	خود اور تمام مومن ایمان لائے سب
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ	خدا پر اس کے فرشتوں پر اس کی
وَرُسُلِهٖ ۫ قف	کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر
(البقرۃ : ۲۸۵)	ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ
نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ
اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ
بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا
بَعِيْدًا ○

(النسآء : ۱۳۶)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ
خدا پر اور اُس کے رسول پر اور اُس کتاب
پر جو اُس نے اپنے رسول پر اتاری اور
اُس کتاب پر جو اِس سے پہلے اتاری
اور جو شخص خدا کا، اُس کے فرشتوں کا،
اُس کی کتابوں کا، اُس کے پیغمبروں کا اور
روزِ آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت
گمراہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اٰمن باللہ

ایک قادر مطلق اور مہیمہ صفت موصوف ہستی پر یقین اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدیؐ کی پہلی ابجد ہے۔ اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے۔ آنحضرتؐ کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصابِ درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف و حقائقِ جسمانی اور اعمال و اخلاق کا سرِ بنیاد قرار دیا۔ خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ	یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا
وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ	اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے
(النسآء : ۱۱۶)	معاف کر دے۔

پھر اسی کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسماء و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل تعلیم محمدیؐ کی امتیازی شان ہے۔ معلوم ہو چکا ہے کہ نبوت

محمدیہ کی غرض و غایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا بلکہ ایک زندہ قوم، جدّوجہد اور عمل والی قوم، اخلاص و ایثار اور نیکی و تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا اور اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لئے نمونۂ عمل بنانا تھا۔ اس لئے سب سے پہلے اہلِ عرب کو جو اس کے مخاطب اوّل تھے، رموز و اسرارِ توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاحِ عقائد معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت غلطیاں داخل ہو گئی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا اس لئے سب سے پہلے آنحضرتؐ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و مؤثرات کا وجود ہے۔ خدا نے عالم میں ایک سلسلۂ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی۔ شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے۔ اجرامِ فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پُرزور طلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں۔ وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے۔ اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور

تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظروں سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود تھیں اور جس طرح آنحضرتؐ نے ان کا استیصال کیا۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

تعددِ خدا کا ابطال | دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے۔ ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے۔ ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا۔ مثلاً صفتِ خلق اور احیاء و اماتہ برہما، بشن، مہیش کے نام سے موسوم ہیں۔ مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیاء اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں۔ نور و ظلمت، پستی و بلندی، یمین و شمال، نرم و سخت، رات دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فسق و صلاح کوئی چیز مقابلہ اور تضاد سے خالی نہیں۔ اس لئے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کئے اور ان کا نام یزدان اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں یہاں تک کہ تیرہ برس کی وسیع مدت تک روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوا تھا۔ لیکن شرک کا استیصالِ کلّی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں۔ تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعالِ خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے۔ آنحضرتؐ نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ باقی یہ مسئلہ کہ بُری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا تو اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے۔ ایک صنّاع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمالِ مصوری پر اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود بُرا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتِ خود خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں۔ آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر۔ اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور بُرا لیا جائے تو شر ہے۔ زہر نہ اچھا ہے نہ برا۔ اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور اگر کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے۔ اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں۔ نہ کوئی شئے دنیا میں خیرِ مطلق ہے نہ کوئی شرِّ محض۔ اسی لئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے:

اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ	آیا اہلِ زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا
اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝	ہے یا اُن کے پروردگار نے ان کو راہ پہ لانا
(الجن : ۱۰)	چاہا ہے۔
مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ	تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف
اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ	سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود

فَمِنْ نَّفْسِكَ ط — تیری طرف سے ہے۔

(النسآء : ۷۹)

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ط قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

(اٰل عمرٰن : ۱۶۵)

کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی تم اُن کو پہنچا چکے ہو تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی ؟ کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے۔ خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔

الغرض کسی شئے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں شر نہیں ہے۔ اُن میں اُس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے۔ ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لئے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں۔ البتہ جب کوئی شریر ان دواؤں سے ان امراض کے ازالہ کی بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے۔ حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لئے الگ اور بری چیزوں کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں ہیں :

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ ○ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(النحل : ۵۱-۵۲)

اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ ایک ہی خدا ہے، تو مجھی سے ڈرو اور اسی کے لئے ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا ۲۔ شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص، کسی خاص شئے

کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رامچندر، کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا۔ اس بنا پر قرآن مجید میں نہایت پُرزور اور پُررعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی:

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ط اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

(النسآء : ۱۷۱)

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے۔ مسیح یعنی عیسیٰ بن مریمؑ صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ○

(النسآء : ۱۷۲)

مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے)۔ اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ط

وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریمؑ خدا ہیں۔ کہدو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح بن مریمؑ کو، اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

(المائدہ : ۱۷)

لے اور خدا ہی کے لیے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں سب کی حکومت ہے۔ وہ جو چاہے کرے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۭ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ

(المائدۃ : ۱۱۶ — ۱۱۷)

اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰؑ! تم نے لوگوں سے کہدیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو۔ عیسیٰؑ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ! میری یہ مجال ہے کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے کہا ہوگا تو تو جانتا ہوگا اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا تو بڑا غیب داں ہے۔ میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت کرو جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔

آنحضرتؐ باوجود اس کے کہ حاملِ کون و مکان تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ

(الکہف : ۱۱۰)

کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے، جس قدر جلیل القدر انبیاءؑ گزرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ تھے، حضرتؑ ابراہیمؑ خلیل اللہ تھے اور حضرت عیسیٰؑ روح اللہ تھے۔ لیکن آنحضرتؐ باوجود اس کے کہ اشرف انبیاء تھے آپؐ کا کیا لقب تھا؟ اور کلمۂ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرتؐ کے اسمِ گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت کا:

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ	میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندہ
رَسُوْلُهٗ	اور رسول ہیں۔

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے۔ آنحضرتؐ نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی۔ اس پر یہ آیت اتری[1]:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ	تم کو کچھ اختیار نہیں ہے۔ خدا
يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ	چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا
ظٰلِمُوْنَ ○	یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ
(آل عمران : ۱۲۸)	ظالم ہیں۔

آنحضرتؐ بعض کفار کے ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ	تم جس کو چاہتے ہو ہدایت نہیں
(القصص : ۵۶)	کر سکتے۔

---

[1] صحیح بخاری غزوہ اُحد۔ یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔

آنحضرتؐ نے عبداللہ بن اُبیّ کے لئے دعائے مغفرت کی۔ اس پر قرآن مجید میں آیا[1]

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط	تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔
اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً	اگر تم ان کے لئے ستّر دفعہ بھی
فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط	مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت
(التوبہ: ۸۰)	نہ کرے گا۔

آنحضرتؐ ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپؐ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے۔ بار بار فرماتے تھے:

لاتطرونی کما اطری الیھود	میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو
والنصاریٰ[2]	جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں
	کی شان میں کیا۔

ایک دفعہ آپؐ راستہ میں جا رہے تھے۔ ایک شخص نے دفعتہً آپؐ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا "ڈرو نہیں۔ میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی"[3]

بنو عامر کا وفد جب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے عرض کی کہ آپؐ ہمارے سیّد (آقا) ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "سیّد خدا ہے"۔ لوگوں نے عرض کی کہ آپؐ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "اچھا یہ کہو لیکن دیکھو کہیں تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے"[4]

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ توبہ۔ [2] صحیح بخاری جلد اول کتاب الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم۔ [3] شمائل ترمذی و مستدرک جلد سوم علی شرط الشیخین واقعہ فتح مکہ۔ [4] ادب المفرد امام بخاری باب ہل یقول سیدی و ابو داؤد کتاب الادب باب کراہۃ التمادح۔

اصلی الفاظ یہ ہیں: قولوا بقولکم ولا یستجرینکم الشیطان۔

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپؐ کو مخاطب کیا: "اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند"۔ آپؐ نے فرمایا "لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو۔ شیطان تمہیں گمراہ نہ دے۔ میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں۔ خدا اور اس کا رسول ہوں۔ مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ"[1]

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد ۳۔ شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز، جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا درکار ہے اس کا رخ دوسری جانب بدل جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں اُن ہی دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں۔ ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے اُن ہی کا نام لیتے ہیں، اُن ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ غرض براہِ راست اُن کو جو تعلق ہوتا ہے اُن ہی معبودوں سے ہوتا ہے۔ خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرزِ عمل انبیاءؑ و صلحا بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔ اُس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے۔ بلکہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلبِ مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا:

---

[1] مسند ابن حنبل جلد سوم

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ	میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست
لَكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْءٍ ط	ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے
(الممتحنہ: ۴)	آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت مانگی تھی، وہ نہیں ملی۔ البتہ یہ درخواست قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کرلوں[1]

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[2] تو آپؐ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کرکے فرمایا "اے قریشیو! اے اولادِ عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہؓ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا"[3]

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو ان کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ	کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے
دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ	ہو وہ تمہاری مصیبت کے ہٹانے یا
عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ	بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ جن کو یہ لوگ
الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى	پکارتے ہیں وہ بھی زیادہ قرب حاصل کرنے
رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ	کے لئے خود خدا ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز [2] الشعراء: ۲۱۴

[3] یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ○

(بنی اسرائیل، ۵۶-۵۷)

ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

۵۔ شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارقِ عادات کی نسبت غلط فہمی ہے۔ جن اشخاص سے خوارقِ عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہیں۔ یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوتا کہ انبیاءؑ سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائصِ نبوت میں ہے تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق حسبِ ذیل امور بیان کئے گئے ہیں:-

معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(الانعام: ۳۷)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا۔ کہدو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۔ باوجود اس کے کفّار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوّت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں:

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ○

(الرّعد: ۷)

اور کفّار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اُترا۔ تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ○ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ○ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ○ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۖ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ○

اور کفّار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہریں جاری کر دو یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو جیسا کہ تمہارا گمان تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اُتارو جس کو ہم خود پڑھیں کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف بشر

(بنی اسرائیل : ۹۰-۹۳) ہوں اور رسول ہوں۔

۳۔ جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کئے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں۔ تاہم خدا نے آنحضرتؐ کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں۔ دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ	اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر ان
مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ	کے خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے۔
اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝	کہدو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو
اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ	صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں کیا
الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	ان (کفار) کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ
لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ	ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری
يُّؤْمِنُوْنَ ۝	جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔ اس میں
(العنکبوت : ۵۰-۵۱)	بے شبہ ایمان لانے والوں کے لئے رحمت
	اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔

اسی لئے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ بِاِذْنِ اللّٰهِ (خدا کی اجازت سے) کے الفاظ استعمال ہوئے۔

حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے

۴۔ شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیاءؑ یا پیشوایانِ مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں۔ قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	ان لوگوں نے اپنے علماء

اَرْبَابًا	اور درویشوں کو رب بنا
(التوبہ : ۳۱)	لیا ہے۔

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، آنحضرتؐ سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں"۔ عرض کی کہ "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا "یہی رب بنانا ہے"۔[1] عموماً اہلِ مذاہب پیغمبروں کو شارعِ مستقل سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے۔ شریعت کی تاسیس، حلال و حرام کی تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پیغمبر تو صرف مبلّغ اور پیغام رساں اور تعلیمِ الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں ذاتِ نبویؐ کی صفتِ رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ	محمدؐ تو صرف ایک
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ	رسول ہے اس سے پہلے اور
(اٰل عمران : ۱۴۴)	رسول گزر چکے ہیں۔
اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ	مریم کا بیٹا عیسیٰ اللہ کا صرف
رَسُوْلُ اللّٰهِ	رسول تھا۔

(النسآء : ۱۷۱)

اس حصر سے مقصود یہ ہے کہ انبیاءؑ میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان

---

[1] جامع ترمذی و ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

میں ہے وہ رسالت اور نبوت کے اوصاف ہیں۔

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے۔ یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے۔ سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایانِ دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین اور امراء کو تو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا۔ آنحضرتؐ نے نہایت سختی سے اس کو روکا۔ بنو اسرائیل میں سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ محبت جائز تھا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا، سجدۂ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ خدمتِ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہلِ عجم کو دیکھا ہے وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ آپؐ اجازت دیں تو ہم آپؐ کو سجدہ کریں۔ آپؐ نے فرمایا "تو کیا میری قبر پر گزرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟" عرض کی "نہیں" فرمایا تو اب بھی نہ کرو۔ اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[1] اسی طرح ایک اور صحابیؓ ملک شام سے آئے تو آپؐ کو سجدہ کیا۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپؐ کو سجدہ کروں۔ فرمایا "ایسا نہ کرو۔ اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[2]

---

[1] ابو داؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المراۃ۔

[2] ابنِ ماجہ باب حق الزوج علی المراۃ۔

صفات الٰہی کی توحید | ۸۔ شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کئے جائیں۔ جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکتِ وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں۔ ان میں سے ایک وصف علمِ غیب ہے۔ اکثر اہلِ مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاءؑ اور اولیاء کو علمِ غیب ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے۔ عرب میں بھی کاہن یہی پیشہ کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئیاں کرتے تھے۔ کبھی فال سے کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے کہ ان کو جنّات غیب کا حال بتا جاتے ہیں۔

آنحضرتؐ نے نہایت تاکید اور استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علمِ غیب کی تمام صورتیں باطل کیں۔ خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلّق آیتیں نازل ہوئیں:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ (الانعام: ۵۹)	اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

آنحضرتؐ نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ مفاتیحِ غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا:[1]

۱۔ حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی۔

۲۔ کل کیا ہوگا۔

۳۔ بارش کب ہوگی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرّد علی الجہمیہ میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

۴۔ کس جگہ موت آئے گی۔

۵۔ قیامت[1] کب آئے گی۔

اگرچہ علمِ غیب کی اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدّعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی۔ ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرتؐ تشریف فرما تھے۔ انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں۔ گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا ؎

وفینا رسول یعلم ما فی غد	اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

آنحضرتؐ نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو۔ وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں[2] اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (الانعام: ۵۰)	کہدو اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل، ۶۵)	کہہ دے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرّد علی الجہمیہ میں تفصیل مذکور ہے۔ [2] صحیح بخاری کتاب النکاح۔

غیب دانی کے مدّعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی۔ بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے۔ صحابہؓ نے آکر پوچھا کہ "یا رسول اللہؐ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے"۔ فرمایا "اب نہ جایا کرو"۔ عرض کی "ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے"۔ فرمایا "یہ تمہارا وہم تھا۔ اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ آیا کرو"۔ بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہؐ ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں۔ فرمایا "شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قر قر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو باتیں جھوٹ ملا دیتا ہے"۔ کبھی فرمایا کہ فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں۔ جاہلوں میں کچھ ایسے مکّار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ عرب ان کو عرّاف کہتے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی عرّاف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔ علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدّعی بنتے تھے، آپؐ نے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا ہے اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمدؐ پر جو کچھ اترا ہے اس سے انکار کرتا ہے۔

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لئے

لہ مشکوٰۃ باب الکہانۃ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں۔ علم نجوم کی حرمت والی حدیث ابوداؤد ابن ماجہ اور احمد سے لی۔

خاتمہ کر دیا۔ کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی۔ فال، شگونِ بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدّاعانہ طریقے مٹ گئے، پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

مخفی قوتوں کا ابطال | کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم، جنّات و شیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوّتوں کی غیبی قدرت و تصرّف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی آنحضرتؐ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام مزخرفات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوّتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا اور دعا و کلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پائے۔ اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لئے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○	(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے
(الفاتحہ: ۴)	سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلّق ارشاد خداوندی ہوا:

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ	یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا	نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے۔
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ	اور یہ یہود وہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں
عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى	جو ان کو نقصان رسان ہیں نفع بخش نہیں۔
الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ	اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو حاصل کرتا

(البقرۃ ، ۱۰۲) ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیّل سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِھِمْ	مصری جادوگروں کے جادو سے یہ
اَنَّھَا تَسْعٰی ۝	اس کو خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ
(طٰہٰ : ۶۶)	رہے ہیں۔

بلکہ بعض صحابہؓ نے ان مکّار جادوگروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا[1] تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو۔ اور اُن کے اِس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہوا کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں وہ بالکل بے بس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ "یا رسول اللہؐ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے اب آپؐ کیا فرماتے ہیں؟" ارشاد فرمایا کہ تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو۔ اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک اور صحابیؓ نے ایک بیمار پاگل پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کی۔ وہ اچھا ہو گیا۔ اس نے ان کو انعام دیا۔ انہوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ عرض کیا۔ فرمایا کہ "میری عمر کی قسم، ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچی جھاڑ سے روزی کھائی۔" ایک اور صحابیؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

ان الرقی والتمائم والتولۃ شرک	بے شک جھاڑ پھونک، گنڈے اور
(ابوداود وابن ماجۃ)	میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ
	شرک ہیں۔

---

[1] جامع ترمذی باب ماجاء فی حد الساحر و ابوداؤد باب اخذ الجزیہ من المجوس۔

ان ہی صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی۔ گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا۔ ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا۔ وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا۔ پھر فرمایا کہ "عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے۔ میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتا سنا ہے کہ جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کو چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں"۔ ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا۔ جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا۔ انہوں نے جواب دیا "یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں "اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ ہو"[1]

اوہام و خرافات کا ابطال ۱۰۔ وہ تمام اوہام و خرافات جن سے شرک پرست اہلِ عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے، آنحضرتؐ نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمایا کہ ان کی کوئی اصل نہیں۔ فرمایا:

لاعدوی ولا طیرۃ ولا صفر ولا ھامۃ	نہ چھوت ہے، نہ بدفالی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے، نہ مُردہ کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔
(ابوداؤد و ابن ماجۃ)	

اور ایک صحابیؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

العیافۃ والطیرۃ والطرق من الجبت	پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اُڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر

---

[1] یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم باب التمائم و باب ما جاء فی الرقی اور ابن ماجہ باب تعلیق التمائم میں ہیں۔

(ابوداؤد وابن ماجة) یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔

ایک اور صحابیؓ آپؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "فال نکالنا شرک ہے"۔ پھر ان صحابیؓ نے کہا کہ "ہم صحابہؓ میں کوئی نہیں جو اس کو برا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے"[1] یہ بھی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "نچھتر (نوء) کچھ نہیں"[2] یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح غولِ بیابانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے ان کو آپؐ نے ایک لفظ سے باطل فرما دیا۔ فرمایا:

لاغول	غول بیابانی
(ابوداود باب فی الطیرۃ)	کچھ نہیں۔

بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالاتِ فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا۔ سورہ انعام میں ان کے اِن مشرکانہ عقائد اور اعمال کی تصریح تردید کی گئی اور سورہ مائدہ میں فرمایا گیا:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا	خدا نے بحیرہ اور سائبہ
سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ	اور وصیلہ اور حام نہیں
(المائدۃ: ۱۰۳)	ٹھہرایا۔

بحیرہ: اس بچہ کو کہتے ہیں جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ: اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ: بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہوا تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے۔ پھر اگر نر و مادہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ

---

[1] ابوداود وابن ماجہ ذکر فال۔ [2] ابوداؤد وابن ماجہ۔

لیتے تھے۔ یہ وصیلہ تھا۔

حام : وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چکتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرتؐ نے ان کا استیصال فرمایا۔ یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے۔ یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک تک منجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریقِ عمل سے روک دیتے ہیں، مثلاً بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بناء پر ٹونے ٹوٹکے کو دافعِ مرض سمجھتے ہیں اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے آنحضرتؐ نے ان سب کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً

(۱) عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند اور سورج میں گرہن لگتا ہے، آپؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب انتقال کیا تو سورج گرہن لگا ہوا تھا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرتؐ نے سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں، کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔[1]

(۲) یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک

---

[1] صحیح بخاری باب صلوٰۃ الکسوف۔

کرتا ہے۔

(۳) ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک ستارہ ٹوٹا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے؟ لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے[۱]

(۴) شیر خوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیتے تھے کہ ان کو جنات نہ ستانے پائیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرتؐ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے[۲]

نظر بد سے بچنے کے لئے اونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے[۳]

الغرض توحیدِ کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام وخرافات کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ اسلام کی اس اصلاحی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات وحکایات سے کرو جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیوؤں، بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

۱۱۔ شرک کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے۔ عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا

---

[۱] مسند ابن حنبل جلد اول۔ [۲] ادب المفرد باب الطیرۃ من الجن۔

[۳] موطا امام مالک باب ماجاء فی نزع التطیق والجرس من العین۔

جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا۔ وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے۔ چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے:

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط (یونس: ۱۸)

یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

آنحضرتؐ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط (الزمر: ۳)

ہم ان کو اسی لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اسی لئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے۔ اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں، وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط

ہم خدا کی اولاد اور اس کے

(المائدۃ : ۱۸) پیارے ہیں۔

قرآن نے کہا:

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

(المائدۃ : ۱۸)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو۔ یہ اسی کو اختیار ہے جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔

اور اسی بناء پر ان کا دعویٰ تھا:

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ

(اٰل عمرٰن : ۲۴)

ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔

قرآن نے کہا:

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

(اٰل عمرٰن : ۲۴)

اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی اور طبعی طور سے گنہگار ہیں، اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک صاف ہو گئے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمانوں پر کھولا جائے گا۔ اسی لئے پوپوں کے سامنے اعترافِ گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف

کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغام محمدیؐ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ص (التوبہ ، ۳۱)	انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ق (آل عمران ، ۱۳۵)	اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر خلق کا عدل و انصاف کرے گا۔ قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں ان کی تردید کی ہے۔ قیامت کے دن خدا حضرت عیسٰی علیہ السلام سے پوچھے گا:

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط (المائدہ ، ۱۱۶)	اے عیسٰیؑ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔

وہ کہیں گے بار الٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا جو تو نے کہا تھا، میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی۔ میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو۔ اب

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ط وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○	اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور

(المائدۃ : ۱۱۸) حکمت والا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختارِ کل ہیں۔ وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اُس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا۔ اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے۔ قرآن مجید نے کفّارہ، غیر خدا کے اختیارِ مغفرت اور بت پرستانہ طریقۂ شفاعت کے عقائدِ باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○	یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔
(الزخرف : ۸۶)	
لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ○	یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔
(مریم : ۸۷)	
ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا	کیا خدائے برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں۔ اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت

يُنْقِذُوْنِ ○ (یٰسٓ : ۲۳)

مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ○ (النجم : ۲۶)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لئے چاہے اور پسند کرے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ○ (الزمر : ۴۳)

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کوئی شفیع بنایا ہے۔ کہہ دے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ (شفیع بننے کے قابل ہیں؟)

خدا قیامت میں ان سے کہے گا:

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ (الانعام : ۹۴)

اور ہم دیکھتے نہیں تمہارے ساتھ تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ

اور جب قیامت قائم ہو گی تو مشرکین ناامید ہوں گے کہ جس کو

مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا	وہ خدا کا شریک کار بناتے تھے ان
(الرّوم: ۱۲-۱۳)	میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ----------	اے فرزندانِ اسرائیل .....
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ	اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی
عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا	دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ
شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ	اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی
وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○	جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں
(البقرۃ: ۴۸)	لیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچائی
	جائے گی۔

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ----------	اے فرزندانِ اسرائیل .....
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ	اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے
عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا	ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی
عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا	بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ
(البقرۃ: ۱۲۳)	دے گی۔

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں شفاعت کے بھروسے نہ رہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا	اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ	رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا

لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ (البقرۃ: ۲۵۴)

کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے۔

غرض آپؐ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدۂ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے:

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ○ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۖ لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ (الزمر: ۴۳-۴۴)

کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ کہدے کہ اگر ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو سمجھ ہو تو بھی؟ کہدے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے۔ اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی اور دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○ (الزخرف: ۸۶)

اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے:

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ○

(مریم، ۸۷)

یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے

لیکن اس شہادتِ حق اور عہدِ الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لئے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے:

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ

(یونس: ۳)

(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ

(البقرۃ، ۲۵۵)

وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اس کی اجازت سے۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ○

(النجم، ۲۶)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آ سکتی البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ○

(النبا: ۳۸)

یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ

انبیاءؑ اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا۔ فرمایا:

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ (سبا ۲۳)	اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی لیکن اس کے لئے جس کے لئے وہ شفاعت کی اجازت دے۔
يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ○ (طٰہٰ : ۱۰۹)	اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لئے خدا اجازت دے اور اس کے لئے بات کرنا پسند کرے۔

بلکہ خود انبیاءؑ بھی سفارش انہی کی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا۔ فرمایا:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ○ (الانبیآء : ۲۸)	اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے۔

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لئے ازل ہی سے یہ اعلانِ عام ہو چکا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم ہو گئے:

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ○ (المدثر : ۴۸)	تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نہ دے گی۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا	ظالموں (مشرکوں[1]) کا نہ کوئی دوست
شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ○	(اس دن) ہوگا اور نہ کوئی شفیع
(المؤمن : ۱۸)	جس کی بات مانی جائے۔

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا مشرکین ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ	اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ
بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ	کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں
لِمَنْ يَّشَآءُ ط	بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ
(النسآء : ۴۸)	جس کو چاہے بخش دے۔

لیکن اب ایسی حالت میں جبکہ وہی شفاعت کر سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی ان ہی کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا یا صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفتِ کریمی و رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی۔ اسی لئے ارشاد ہوا :

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ	اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبرؐ)
اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ	ان لوگوں کو ہشیار کر دے جو اس سے
لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ	ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے
لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○	جائیں گے، ان کے لئے ان کے رب کے سوا

---

[1] اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ (بیشک شرک بڑا ظلم ہے) لقمان ۱۳ صحیح بخاری ذکر لقمان جلد اوّل۔

(الانعام : ۵۱) کوئی حمایتی اور شفیع نہیں، شاید وہ بچتے رہیں

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ○ — خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں؟

(السجدۃ : ۴)

خدا کی اس صفتِ کریمی و رحیمی کے مظہر اُس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اِس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرامؑ ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اُس کو اِس دنیا اور دنیا والوں کے ساتھ ہے، ان انبیاءؑ کی بعثت ہوئی۔ اور وہ اپنی اپنی امّت پر شاہد قرار پائے۔ اس طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضلِ عمیم کے مظہر قرار پائیں گے۔ نیز رحمت کے فرشتے اور امّت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الٰہی نے چُنا ہو اس منصب پر ممتاز ہو سکیں گے۔ خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو اس دنیا میں رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور خدا کی صفتِ رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

اجرامِ سماوی کی قدرت کا انکار ۱۲۔ بظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلافِ موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں۔ اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے۔ یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا۔ وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے۔ اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ — سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

(حٰمٓ السجدۃ : ۳۷)

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے:

وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔

(الجاثیہ: ۲۴)

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں "فلکِ کج رفتار" اور "دہرِ ناہنجار" کی شکایت اب تک چلی جاتی ہے۔ عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے۔ ان کو جب کوئی خلافِ توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے اور اس کو بُرا کہتے تھے۔[۱] آنحضرتؐ نے اِس سے منع کیا اور فرمایا کہ "زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے"[۲] اور فرمایا کہ "خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے۔ وہ زمانہ کو بُرا کہتا ہے۔ زمانہ میں ہوں۔ میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں۔ میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں"[۳] یعنی زمانہ کو جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ بُرا کہتے ہیں حقیقت میں اُن کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے۔ اس لئے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہلِ عرب بارش کو نچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں نچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا۔ حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی۔ صبح کو نماز کے بعد آپؐ صحابہؓ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا "جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا"۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ "خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے"۔ ارشاد ہوا "اس نے فرمایا آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے اور کچھ کافر ہو کر۔ جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں نچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے

---

[۱] فتح الباری شرح بخاری جلد ہشتم و کتاب الاسماء والصفات بیہقی۔ [۲] صحیح مسلم الفاظ الادب۔

[۳] صحیح بخاری تفسیر سورہ جاثیہ و کتاب الرد علی الجہمیہ جلد دوم۔

انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں[1]۔

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے۔ کم وبیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ وغضب کے مظہر یقین کئے جاتے تھے۔ ۹ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وفات پائی۔ صحابہؓ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موت ہے۔ آنحضرتؐ نے جب یہ سُنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں اس خیال کی تردید کی۔ فرمایا کسوف و خسوف (گرہن) کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے[2]۔

غیر خدا کی قسم سے روکنا ۱۳۔ شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں۔ جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے۔ عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا۔ قریش اپنے دیوتا لات اور عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اس سے منع فرمایا[3]۔ لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الٰہ الا اللہ کہہ لے"۔ یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے۔ قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا۔ اس سے بھی آپؐ نے منع فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ

---

[1] صحیح بخاری باب الاستسقاء و باب الذکر بعد الصلوٰۃ و صحیح مسلم کتاب الایمان۔ [2] صحیح بخاری صلوٰۃ الکسوف۔

[3] سنن نسائی کتاب الایمان والنذور۔

کو آپؐ نے باپ کی قسم کھاتے سُنا تو آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو۔ جس کو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے"۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی[1] ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے۔ اس سے بھی آپؐ نے منع فرمایا۔ اسی طرح کعبہ کی بھی لوگ قسم کھایا کرتے تھے۔ اس پر ایک یہودی نے آکر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو۔ کعبہ کی قسم کھاتے ہو۔ آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو[2] ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سُنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ "غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے۔ میں نے رسولِ خداؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا"[3] دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے[4]

خدا کی مشیئت میں کوئی شریک نہیں

۱۴۔ اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیئت عین خدا کی ہے۔ اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہلِ توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیئت صرف خدا کی ہے۔ اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے۔ تمام مشیئتیں اور خواہشیں اسی کی مشیئت اور خواہش کے ماتحت ہیں۔ اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیئت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں۔ لیکن لوگوں نے خدا کی مشیئت کے ساتھ اوروں کی مشیئت کو بھی شریک کر لیا تھا۔ توحید کامل کے معلمؐ نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور قرآن مجید نے جابجا اس حقیقت

---

[1] یہ تمام واقعات صحیح بخاری صحیح مسلم اور نسائی کتاب الایمان میں مذکور ہیں۔ [2] نسائی کتاب الایمان والنذور
[3] جامع ترمذی ابواب النذور والایمان و مستدرک حاکم جلد اول کتاب الایمان۔ [4] مستدرک حاکم جلد اول کتاب الایمان۔

کو واضح کیا کہ مشیئتِ الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیئت نہیں، تمام دیگر مشیئتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں۔ عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حُسنِ ادب سمجھتے تھے کہ "جو خدا چاہے اور جو حضورؐ چاہیں"۔ آنحضرتؐ نے اس طرزِ عمل سے منع فرمایا۔ یہاں تک کہ خدا کی مشیئت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیئت کے ذکر سے بھی صحابہؓ کو روکا۔ اس قسم کا طرزِ کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا۔ اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا کی اور غیر کی مشیئت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیئت کے بعد اوروں کی مشیئت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبویؐ میں مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ شرک کرتے ہو۔ کہتے ہو کہ "جو خدا چاہے اور جو محمدؐ چاہیں"۔ آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا یوں کہو کہ "وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپؐ چاہیں"[1]۔ یہی واقعہ ابنِ ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابیؓ نے خواب میں دیکھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے۔ تم کہا کرتے ہو کہ "خدا جو چاہے اور محمدؐ جو چاہیں"۔ ان صحابیؓ نے خدمتِ اقدس میں آکر اپنا یہ خواب بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا۔ یوں کہو کہ "جو خدا چاہے پھر جو محمدؐ چاہیں"[2]۔ ابوداؤد میں یہی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے۔ بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے"۔ لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیئت کا

---

[1] نسائی کتاب الایمان والنذور۔ [2] ابن ماجہ کتاب النذور۔

نام بھی نہ لینا چاہیئے۔ ایک شخص نے خدمتِ والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ "جو خدا چاہے اور جو آپؐ چاہیں"، ارشاد ہوا کہ "تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا، جو خدا تنہا چاہے، مَاشَآءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ۔"[1]

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدِّ نظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھر کر ایک فعل لایا جائے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے۔ ایک دفعہ آپؐ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا "جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی" یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپؐ نے اس کو روک دیا اور فرمایا "اُٹھ جاؤ تم بُرے خطیب ہو"[2] آپؐ نے آزردگی کا اظہار اس لئے فرمایا کہ ان دونوں کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے۔ اس لئے خطیب کو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ "اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ....." جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں بھی منقول ہے۔

مشتبہات شرک کی ممانعت جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا ہے ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً عبد الشمس عبد المناف۔ ان ناموں سے سخت منع فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں[3] اہلِ عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے، چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے[4]۔ دوسری روایت

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب لاتقولوا خبثت نفسی۔ [2] ادب المفرد امام بخاری کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی۔

[3] ابو داؤد کتاب الادب باب تغیر الاسماء [4] ابو داؤد کتاب الادب۔

میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا۔ خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں[1]

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے حالانکہ رب خدا ہے۔ اس بناء پر آنحضرتؐ نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے۔ بلکہ یوں کہے کہ میرا بچہ یا بچی اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں۔ مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب اللہ ہے[2] ہانیؓ ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی۔ وہ جب خدمت اقدسؐ میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپؐ نے فرمایا کہ حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے۔ تم کو لوگ ابوالحکم کیوں کہتے ہیں؟ عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں؟ بولے شریح، مسلم، عبداللہ۔ آپؐ نے پوچھا سب میں بڑا کون ہے؟ عرض کی "شریح"۔ فرمایا تو "تمہاری کنیت ابوشریح ہے"[3]

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی۔ ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرتؐ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے۔ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ انہوں نے کہا شیطان کا برا ہو۔ آپؐ نے فرمایا یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے اور پھول جائے گا اور کہے گا "میری قوت سے یہ ہوا۔ خدا کا نام لو تو شیطان دبک کر مکھی کے برابر ہو جائے گا"[4]

---

[1] مستدرک حاکم جلد چہارم۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب الکرم وحفظ المنطق۔

[3] ابوداؤد کتاب الادب باب تغییر الاسم القبیح۔ [4] ابوداؤد کتاب الادب لایقول خبثت نفسی۔

تصویر بنانے سے سخت منع کیا۔ اس کی یہی وجہ تھی کہ اوّل اوّل لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبّت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان ہی تصویروں کی پرستش ہونے لگتی تھی۔ چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھلک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا۔ اس بناء پر آنحضرتؐ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

قبر پرستی سے روکنا ۱۲۔ شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے۔ قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں۔ سالانہ مجمع کرتے ہیں۔ دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں۔ قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، منّتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے ان تمام افعال سے منع کیا۔ وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے۔ دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا[1]۔ عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر اُلٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے۔ اُن لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا ہے۔

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے ۱۳۔ یہ توحید کے متعلّق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلّق زیادہ تر اعمال اور روزمرّہ کی بول چال سے تھا۔ لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ قلب و روح کی توحید ہے۔ انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے۔ کوئی طلبِ شہرت کے لئے کام کرتا ہے۔ کوئی دنیاوی معاوضہ کے لئے کرتا ہے۔ کوئی نمائش اور دکھاوے کے لئے کرتا ہے۔ کوئی غیر کی محبّت یا عداوت میں کرتا ہے۔ ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ اسی

---

[1] صحیح مسلم کتاب المساجد۔

لئے قرآن مجید نے کہا:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ (الفرقان: ۴۳)

تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے۔

اسی لئے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بتخانے میں چھپا رکھا ہے۔ اس بت کو توڑنا توحید کی اصل تکمیل ہے۔ آپؐ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے۔ انما الاعمال بالنیات۔ اس لئے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت غرض صرف خدا ہونا چاہیئے۔ جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی اس کے ایمان و توحید کی تکمیل بھی پایۂ کمال کو پہنچتی جائے گی۔ اسی بناء پر وحی محمدیؐ نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض و غایت مَرْضَاةِ اللّٰهِ اللہ کی خوشنودی مخلصین لَهُ الدِّيْنَ خالص خدا کے لئے اور وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ذاتِ خدا کو قرار دینے کی تعلیم دی ہے۔ اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض و نیت سے کرے تو درحقیقت اس کام کے لئے اس نے ایک مؤقت خدا الگ بنالیا۔ وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں لیکن معنوی نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے۔ آپؐ نے فرمایا "جس نے خدا کے لئے دیا اور خدا ہی کے لئے روکا، خدا کے لئے چاہا اور خدا ہی کے لئے عداوت کی اور خدا ہی کے لئے بیاہ کیا اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا"[1]

---

[1] مستدرک حاکم و ترمذی آخر کتاب الزہد۔ ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں۔ ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسری میں حسن۔ اس کے ایک راوی ابوحلیم کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے۔

متعدد صحابیوںؓ[1] سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "ریا چھپا ہوا شرک ہے"۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی موجودگی کے سبب سے کرے"[2]۔ حضرت شداد بن اوسؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا"[3]۔ یہی صحابیؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہؓ کے مجمع میں آپؐ فرما رہے تھے کہ "مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے۔ ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لئے عمل نہ کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں"[4]۔ حضرت محمود بن لبید انصاریؓ آپؐ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرکِ اصغر ہے"۔ صحابہؓ نے عرض کی "یا رسول اللہؐ! شرکِ اصغر کیا ہے"؟ فرمایا "ریا۔ قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا تو خدا ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے یہاں کچھ نہیں۔ تم انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے"[5]۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم لوگ دجّال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرتؐ تشریف لے آئے اور فرمایا کہ دجّال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں۔

---

[1] حضرت ابوسعید خدریؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوہریرہؓ، شداد بن اوسؓ، محمود بن لبیدؓ، ابوسعید بن ابی فضالہؓ، ان صحابیوں کی روایتیں ابنِ حنبل، ابنِ ماجہ اور مستدرک وغیرہ میں ہیں۔ [2] مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد چہارم (صحیح)۔ [3] بحوالہ سابق مستدرک، ابنِ حنبل، مسند شداد بن اوس جلد چہارم۔ [4] سنن ابنِ ماجہ باب الریا والسمعہ۔

[5] ابنِ حنبل مسند محمود بن لبید انصاریؓ جلد پنجم و ابوداؤد مسند ابنِ حنبل۔

ہم سب نے عرض کی ہاں یارسول اللہؐ۔ فرمایا وہ شرکِ خفی ہے یعنی یہ کہ (مثلاً) کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے[1] ابوسعید بن ابی فضالہ انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا تو ایک منادی آکر پکارے گا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اسی غیر سے مانگے کہ خدا ساجھے سے بے نیاز ہے"۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ "آپؐ نے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں، تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اُس سے الگ ہوں اور وہ اُسی کا ہے جس کو اُس نے میرا شریک بنایا"[2]

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہؓ اپنے ہر عمل میں اس شرکِ خفی سے ڈرتے تھے۔ شدّاد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرتؐ کے زمانۂ حیات میں ریا کو شرکِ اصغر گنا کرتے تھے[3]۔ ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ جا رہے تھے۔ دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ صحابی آنحضرتؐ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبرِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ "ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے"[4]۔ اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شدّاد بن اوسؓ اپنی جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں۔ رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ دو ایک دن میں نے

---

[1] سنن ابنِ ماجہ باب الریا والسمعہ۔ [2] سنن ابنِ ماجہ باب الریاء وترمذی ومسند ابنِ حنبل۔

[3] ابنِ ماجہ باب الریاء۔ [4] مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد چہارم (صحیح)۔

[5] مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد چہارم۔ (صحیح)۔

رسول اللہؐ کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کی میرے ماں باپ حضورؐ پر فدا ہوں اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے"؟ ارشاد ہوا کہ "میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں"، عرض کی "یا رسول اللہؐ وہ کیا ہے؟ فرمایا "شرک اور چھپی نفسانی خواہش"، میں نے دوبارہ عرض کی "یا رسول اللہؐ! کیا آپؐ کی امت آپؐ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی"؟ فرمایا "اے شداد میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی ریا اور نمائش کرے گی"، عرض کی "یا رسول اللہؐ! کیا ریا شرک ہے"، فرمایا "ہاں"۔[1]

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے۔ وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے، انہوں نے آپؐ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کرلی۔

---

[1] مستدرک بحوالہ مذکور۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے۔ تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسند ابن حنبل (جلد چہارم) اور سنن ابن ماجہ (باب الریا) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے جن میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا اس لئے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید

اور

اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے یعنی توحید کے مخالف عقائد وخیالات کی نفی اور تردید۔ لیکن نبوّتِ محمدی کا کارنامہ اس سے اہم اور بالاتر ہے اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امورِ ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک وبت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرّف صورتیں بھی موجود تھیں مگر ایک صحیح مذہب کا تخیّل مطلق نہ تھا۔ اس بنیاد پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتّب صورت بھی ایک ذہن میں نہیں ہو سکتی تھی۔ آنحضرتؐ نے ان کے تمام پچھلے مزخرفات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دے دیا گیا تھا یک قلم محو کر دیا۔ بت پرستی، جن پرستی، فرقہ پرستی ستارہ پرستی فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتّب، متیقّن، سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے۔ دنیا میں جتنے پیغمبر آئے اُن میں سے ہر ایک نے اُس قادرِ مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت اُن کے ایک مسلّم دعویٰ کی حیثیت سے تھی۔ اُنھوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن نامحدود زمانوں میں قوموں کے لئے ان کی بعثت ہوئی ان میں دلیل

اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا۔ الحاد کا وجود نہ تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کے لئے تھی۔ اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثتِ محمدیؐ کے بعد عقلِ انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی اور قدرت کے سربمہر خزانے وقفِ عام ہوں گے۔ عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی اس لئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دلائل و براہین، ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقینؑ صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے جن میں مشرکین کا وجود تھا ملحدین کا نہ تھا۔ لیکن خاتم الانبیاءؐ کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں کے لئے ہوئی اس لئے آپؐ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپؐ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اُس کے معیار اور سطح کے مطابق اور اُس قادرِ مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں اس لئے آپؐ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، متشککون، دہریوں ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور اُن میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادرِ مطلق خالقِ عالم اور صانع کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ مصر، یونان، ہندوستان، اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔ مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے۔ اس بنا پر وحیِ محمدیؐ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحیِ محمدیؐ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ متمدّن سے متمدّن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مُردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا۔ جس میں سامانِ تمدّن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی۔ اُن کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیّل سے بہرہ ور ہیں۔ غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصّہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیّل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے۔ اسی لئے وحیِ محمدیؐ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○

(الروم: ۳۰)

اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

کل مولود یولد علی الفطرۃ[1]

ہر بچّہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ

اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے اُن کی نسل کو لیا، اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا، ہاں، ہم گواہ ہیں۔

(الاعراف : ۱۷۲)

انسان کا یہ جذبۂ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحیِ محمدیؐ نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی زیرِ خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اُس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے۔ وہ انسانوں سے پوچھتی ہے :

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

کیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟

(ابراھیم : ۱۰)

ایک اور مقام پر اس نے کہا :

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا

کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں؟ یا ان ہی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟

يُوقِنُونَ ○ (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

(الطور: ۳۵-۳۶)

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے بہرحال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی بیوقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا اور اوّلین نر و مادہ کا اور مادۂ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گوناگوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیّر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرّہ ذرّہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالقِ کُل کا پتہ دیتا ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ○

آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

(آل عمران: ۱۹۰)

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقرّرہ رفتار اور باقاعدہ طلوع

وغروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے :

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَ	اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ	اور سورج اور چاند ہیں۔

(حٰمٓ السجدۃ : ۳۷)

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے۔ دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے ہیں۔ اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں۔ جس طرح فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آرہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے۔ پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں وہ اوپر جاکر بادل بنتے اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں جہاں پیداوار اور زمین کی نشوونما کی حاجت ہے اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں :

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بے شبہہ آسمانوں کی اور زمین کی
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور
الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ	ان جہازوں میں جو انسانوں کیلئے فائدہ رساں
النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ	سامان لیکر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے
مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ	اس کے پانی برسانے میں اور پھر اسکے پانی
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ	کے ذریعہ مرے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں
وَّتَصْرِيْفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ	اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں کے پھیلانے
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	میں اور ہواؤں کے کبھی ادھر اور کبھی ادھر
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝	بہنے میں اور آسمان و زمین کے بیچ میں جو

بادل کام میں لگے ہیں ان سب میں سمجھ بوجھ والوں
کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ (البقرۃ : ۱۶۴)

آسمان وزمین کی عجیب وغریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے :

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ○ (الجاثیۃ : ۳-۴)

بیشک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا یہ کتنے تعجّب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل، پھول، میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتّی، ہر ایک کا قد وقامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں :

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اُس سے اُگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے نکالے جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے

دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ
الزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ
اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار
ہم شکل اور جدی جدی شکل کے جب وہ
پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو۔
بے شک ان میں ایمان والے لوگوں کے
لئے دلیلیں ہیں۔

(الانعام : ۹۹)

سورہ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے۔ پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں، ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اوّل تو خود انسانوں کی پیدائش پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے۔ پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو۔ ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ
ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ○
وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ
اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا
اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ
رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُسنے
تمکو مٹی سے بنایا پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے
ہو۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس
نے تمھاری جنس سے تمھارے جوڑے بنائے
کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان
پیار اور مہر رکھی اور اس میں ان لوگوں کیلئے
جو سوچتے ہیں، دلیلیں ہیں۔ اور اس کی نشانیوں

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ
اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝ وَمِنْ
اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ
وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۝
وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا
وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ
یَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ
السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ

(الروم : ۲۰ - ۲۵)

میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور
تمھاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے ۔
اس میں جاننے والوں کیلئے یقیناً دلیلیں ہیں
اور اس کی عجب قدرتوں میں سے تمھارا رات
اور دن میں سونا اور تمھارا اس کی مہربانیوں کو
تلاش کرنا ہے۔ اس میں ان کے لئے جو سنتے
ہیں دلیلیں ہیں۔ اور اُس کے عجائب قدرت میں
سے یہ ہے کہ تمھیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے
جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی (رحمت کی بارش
کی) اُمید بانھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا
ہے پھر اس سے زمین کو اسکے مرے پیچھے زندہ کرتا
ہے اس میں ان کیلئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں ہیں
اور اسکی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور
زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

اس اخیر آیت میں آسمان و زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں۔ لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے۔ سورۂ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے۔ یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوتِ کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔ اس کے بعد ایک جامد اور بے حیات مُردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی

کے نمونوں کا اُبھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے۔ یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے :

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ○ (لقمٰن : ۱۰)	اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کئے۔

سورہ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹّی سے آغاز، پھر قطرۂ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹّی کے مُردہ قالب میں دفعتہً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں روح پھُک جانا اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے :

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ○ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ	وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا۔ اور تمھارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنا دئے تم ان احسانوں

وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

(سجدہ ۸ : ۷-۹)

مُردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم وجان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے۔ لیکن کوئی صاحب نظر اِدھر نہیں دیکھتا۔ انسان کی زندگی، اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمّا ہے:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے
لِّلْمُوْقِنِيْنَ ○ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر
اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ کیا تم نظر نہیں کرتے۔

(الذّٰریٰت : ۲۰-۲۱)

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب وغریب نظام ہے وہ بھی غور کے قابل ہے۔ ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سُرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے؟

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ اور تمہارے لئے جانوروں میں عبرت
نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ ہے۔ ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر
بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سے لید اور خون کے بیچ سے
سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ○ خالص اور پینے والوں کیلئے خوشگوار

(النحل : ۶۶) دودھ پلاتے ہیں۔

ایک ہی قسم کے پھل ہیں۔ اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں

اور دوسری طرح کھاؤ تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ	اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو
تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا	دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی
حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً	بھی حاصل کرتے ہو اس میں سمجھ والوں
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝	کے لئے دلیل ہے۔

(النحل : ۶۷)

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ۔ سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے۔ پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ	بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں
بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا	میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور
وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝	چمکانے والا چاند بنایا۔

(الفرقان : ۶۱)

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانونِ فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ	اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر
(النمل : ۸۸)	شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے:

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ	تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی

تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ○ (الملك : ۳-۴)

بے برابری نظر آتی ہے؛ پھر نگاہ کر کیا کوئی قصور دکھائی پڑتا ہے؛ پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر۔ تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی۔)

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے۔ ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں :-

(۱) قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں اور پھر اُن کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

(۲) عالم کا نظم و نسق اور اس کا مترتب سلسلہ۔

(۳) کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادرِ مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے :

اہلِ فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے علل و اسباب کا سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہو گا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا اگر یہ یونہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گذر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی۔ تسلسل عقلاً بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے۔ اس بنا پر لامحالہ سلسلۂ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے۔ جس علتِ کُل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور

وجودِ کون کی اصلی علّت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ، اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے مخدوف مقدّمات پر مبنی ہے تاہم وہ انسانی عقل میں آئی ہے اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے۔ قرآنِ پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے۔ سورۂ ہود کے آخر میں ہے:

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ	اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں
وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ	اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف
وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ	ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو
(ھود: ۱۲۳)	پوج اور اس پر بھروسہ کر۔
وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۙ	اور یہ کہ تیرے رب کی طرف
(النجم ۴۲)	ہے سب کی انتہا۔

آنحضرتؐ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چند صحابیوںؓ نے آکر عرض کی "یارسول اللہؐ کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے"۔ فرمایا "کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہو گئی؟" گذارش کی "ہاں یارسول اللہؐ"۔ فرمایا "یہ تو خالص ایمان ہے"۔ مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے، یہ کیفیتِ ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپؐ نے فرمایا "لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اُس خدا کو کس نے پیدا کیا۔ آسمان کو خدا نے بنایا، زمین کو خدا نے بنایا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا "یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ (میں اللہ پر ایمان لایا)۔[1]

---

[1]: یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں اس لئے یہ وسوسہ لائقِ جواب نہیں۔ یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں تاہم دنیا میں ایسے بھی عقلمند ہیں جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصّوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ وحیِ محمدیؐ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظامِ عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے۔ دنیا میں ایک ذرّہ بھی اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراکِ عمل نہ ہو۔ ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اُگ نہیں سکتا جب تک دانہ اُگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اُگانے کی صلاحیّت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے پھر اس کے اُگنے کے مواقع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں۔ ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اُگے گا اور پھل لائے گا۔ قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ	اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے
لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ	برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے
الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝	تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے تو پاک ہے
(الانبیاء ۲۲:۲۱)	عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانینِ قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے۔ فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب

کو ادا کرو تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے۔ اس کی کوئی علّت تامّہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے ایک معلول کی دو علّتِ تامّہ نہیں ہو سکتیں کیونکہ علّتِ تامّہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو۔ اب عالم کی علّتِ تامّہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علّتِ تامّہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علّتِ تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں۔ اگر رہے گا تو پہلی شئے علّتِ تامّہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شئے علّتِ تامّہ نہ ہوگی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علّتِ تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے۔ سورج، چاند اور تاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت، گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقرّرہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں جن میں کبھی سرِ مو فرق نہیں ہوتا۔ ہر شئے ایک اصول کی پابند اور ایک عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں:

وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ (المؤمنون : ۹۱)	اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔
قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا	کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ (مشرکین) کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران خدا) سے حکومت چھیننے کا

كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

راستہ ڈھونڈتے۔ پاک اور بلند ہے (وہ خدا) اس بات سے جسکو یہ (مشرک) کہتے ہیں اس (خدائے) برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو انکے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔

(بنی اسرآئیل ۴۲-۴۴)

اسی وحدتِ نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے:

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝

تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا پھر نگاہ کر۔ کیا کوئی فتور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا تیری نظر رد ہو کر تھک کر واپس آجائے گی۔

(الملک ۳-۴)

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظمِ فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے قرآنِ پاک نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکے۔ اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل توحید خواہ کسی قدر محرّف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی مشترک اور اوّلین تعلیم ہے۔ لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتّھروں پر قائم کیا۔ یہ پتّھر کیا

ہیں؛ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین۔

خدا کی حقیقی عظمت اہلِ عرب ایک حقیقی قوّت کے نام سے واقف تھے۔ اور اس کو خالق بھی مانتے تھے مگر قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لئے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولادیں تھیں۔ عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم علیہ السلام کو دے کر خود معطّل ہو گیا تھا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا۔ اور برھما، مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لئے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصّہ نہیں۔ اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا اسا بھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرّہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج، چاند، زمین، آسمان۔ انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوّت والا ہے۔ سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے۔ سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے۔ سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے۔ سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے۔ غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اُس کا ہے اور اُس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک، ہر بُرائی سے منزّہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کی صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے متّصف ہے۔ اس کے مانند کوئی نہیں۔ اس کی شبیہ و مثال کوئی نہیں۔ وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناتے سے پاک ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج

وہ ہے اللہ تمہارا رب اس کی بادشاہی ہے۔
اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔

(الزمر : ۶)

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے

(الزمر ، ۴۴)

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

(الانعام : ۱۴)

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ط

چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

(الانعام : ۷۳)

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط لَهُ
الْحُكْمُ

اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ اسی
کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔

(القصص : ۸۸)

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ج وَهُوَ السَّمِيْعُ
الْبَصِيْرُ ○

اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا
اور دیکھنے والا ہے۔

(الشوریٰ ، ۱۱)

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

(المؤمن : ۶۵)

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا
يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ ط وَيَعْلَمُ مَا فِي

غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس
کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔ خشکی اور تری

الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ

(الانعام : ۵۹)

میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(اٰل عمران : ۲۶)

اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے۔ تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے۔ بے شک تو ہر بات پر قادر ہے۔

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

(یونس : ۱۰۷)

اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اسکا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرے تو اسکے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ

اللہ! اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں۔ وہی جیتا ہے اور سب اس کے

وَّلَا نَوْمٌ ط لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَا
الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا
بِاِذْنِهٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ
بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا
شَآءَ ج وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ج
وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○

(البقرۃ : ۲۵۵)

سہارے جیتے ہیں۔ اسکو اونگھ ہے نہ نیند،
آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون
ایسا ہے جو اسکے سامنے اسکی اجازت کے
بغیر سفارش کر سکے جو لوگوں کے روبرو ہے
اور جو اُن کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے اور
وہ اس کے علم کے حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر
جتنا وہ چاہے۔ اس کا تخت آسمانوں کو اور
زمین کو سمائے ہے۔ ان آسمانوں کی اور زمین
کی نگرانی اسکو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور
بڑا ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ
مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ
مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ط
وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ط
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط
وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○

(الحدید ۴-۵)

جو زمین میں گھستا اور جو اس سے نکلتا ہے
جو آسمان سے اُترتا اور اس میں چڑھتا ہے
وہ سب کو جانتا ہے۔ اور تم جہاں بھی ہو وہ
تمہارے ساتھ ہے اور آسمانوں اور زمین
کی بادشاہی اس کی ہے اور تمام کاموں کا
مرجع وہی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

سب تعریف اللہ کے لئے ہے

(الفاتحۃ: ۱)

جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔

وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور آسمانوں میں اور زمین جو کچھ ہے سب اسی کے زیرِ فرمان ہے۔

(آل عمران، ۸۳)

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ۝ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝

وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے۔ جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

(البروج: ۱۴-۱۶)

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں

(الجمعۃ: ۱)

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔

(بنی اسرآئیل: ۴۴)

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآنِ پاک میں ہیں۔ ان تعلیمات نے خدا کی عظمت و جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں گئی۔ بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کیلئے بجھ گیا۔ جن و انس، شجر و حجر، بحر و بر سب اس کے جلال و حیرت کے سامنے سربسجود نظر آئے۔ پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگِ وجود کے ساز سے اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں) کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ توحیدِ محمدیؐ کا دوسرا بنیادی اصول اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے۔ جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں، جنات اور ارواحِ خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں، آسمانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہیں۔ وہ دراصل اسطرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں۔ انھوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالمِ خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔ قرآن کے ابتدائی سورہ میں آدم کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اوّلین دیباچہ ہے۔ اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا۔ اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرّف میں دینا تھا۔ وہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کے فرمان کے رُو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافتِ الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے۔ کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا۔ یہ منصبِ اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو عطا ہوا۔ نہ زمین کے حصّہ میں آیا، نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے۔ صرف انسان ہی کا سینہ تھا جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا اور اسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی۔ فرمایا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو
فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ	سب نے اس بار (امانت) کے
مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ	اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے

(الاحزاب : ۷۲)　　ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

وحیِ محمدیؐ نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا۔ عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام واکرام سے معزز کیا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ
حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ
فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ
خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○
(بنی اسرآئیل : ۷۰)

ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی
اور ہم نے خشکی اور تری میں ان
کو سواری دی اور ستھری چیزوں
کی اُن کو روزی بخشی اور اپنی
بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں
پر ان کو فضیلت عطا کی۔

انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب معتدل، قوی اور بہترین اندازہ کیساتھ دنیا میں پیدا ہوئی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ
تَقْوِيْمٍ ○　　(التین : ۴)

البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ
پر پیدا کیا۔

یہاں تک کہ انسان خدائی صورت کا عکس قرار پایا۔ متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "خدا نے آدم کو اپنی صورت[1] پر پیدا کیا"۔ اسی بنا پر آپؐ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورتِ الٰہی کا عکس ہے۔ عین میدانِ جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاستیذان، ابن ابی عاصم فی السنۃ والطبرانی من حدیث ابن عمرؓ باسناد بجالہ ثقات وادب المفرد بخاری واحمد من ابی ہریرۃؓ وصحیح مسلم کتاب البر۔ تورات کی بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے "جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا خدا کی صورت پر اسے بنایا" (پیدائش ۵-۲)۔

دار نہ کرنا چاہیے[1] کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے[2]۔ غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا[3]۔ ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ[4] بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے۔ علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ صفات کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں اور چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے اس لئے آنحضرتؐ نے انسان کے اعضا میں اسی کو فیضِ رحمانی کا مورد ظاہر کیا[5]۔ اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہے، کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے؟

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ — اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔

(الانعام: ۱۶۵)

تو اب وہ عالم کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کے خاطر بنیں۔ وہ روئے زمین کی چیزوں کی خاطر نہیں بنا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا — جو کچھ زمین میں ہے خدا نے

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق و صحیح مسلم کتاب البر والصلہ۔ [2] صحیح مسلم کتاب البر۔ آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے۔ [3] ادب المفرد امام بخاری باب لا تقل قبح اللہ وجہہ۔ [4] الشوریٰ: ۱۱۔ [5] اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

(البقرۃ : ۲۹) (اے انسانو) تمہارے لئے بنایا۔

اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ زمین میں جو کچھ ہے خدا نے

(الحج : ۶۵) اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ اُن کے لئے نہیں بلکہ وہ اُن کے لئے بنے ہیں جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج اُن کے لئے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لئے بنے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لئے بنی ہے اور انسان خدا کے لئے بنا ہے۔ اس لئے جب کائنات کا ہر ذرّہ انسان کی خدمت گذاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گذاری میں مصروف رہنا چاہیے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا تو وحی محمدیؐ نے اُن سے کہا:

وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِہٖ ؕ

(النحل : ۱۲)

اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج کو تمہارے لئے کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغام محمدیؐ نے انسانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں تم اُن کے نہیں ہو۔

وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَھَا ۚ لَکُمْ فِیْھَا

اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا تمہارے

دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ

(النحل : ۵)

لئے جن میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔

انسانوں نے دریا سمندر کو دیبی اور دیوتا بنایا حالانکہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں :

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ

(النحل : ۱۴)

اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تاکہ تم اس میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو۔ اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں اور تاکہ تم خدا کے فضل وکرم (روزی) کی تلاش کرو۔

آگ بھی انسانوں کی مسجود بنی حالانکہ وہ خود ان کی محبّت میں جل رہی ہے :

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ○

(یٰسٓ : ۸۰)

جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس سے روشن کرتے ہو۔

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اسی کے لئے ہے۔ پھر انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود، اور مسجود بنائے۔ اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی

ایسا ہے جس میں کوئی سچّا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے۔

الغرض محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس کی تلقین کی وہ ان ہی دو اصولوں پر قائم ہے ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوّت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصافِ کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں جو ماورائے عرش سے زیرِ فرش تک ہر ذرّہ پر حکمراں ہے۔ اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اُسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبّت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام اُمیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف اُسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

وہ بزرگ برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیّل ہو؟ تعلیمِ محمدیؐ نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیّل

قرآنِ پاک کی آیات، جاہلیّت کے اشعارِ اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثارِ قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالا ہستی کا تخیّل ضرور موجود تھا جس کا نام اُن کے ہاں اللہ تھا۔ مگر اللہ کیا ہے؟ اللہ کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جا سکتی ہیں؟ کن کن باتوں سے وہ پاک ہے؟ اُس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیئے؟ اس سے کیا مانگنا چاہیئے؟ اور کیونکر مانگنا چاہیئے؟ اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہیئے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اس سے محبّت بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جا سکتی ہے تو کیونکر؟ اور اس سے محبّت کی کیا حقیقت ہے؟ اس کی قدرت کہاں

تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دُور ہے یا بالکل قریب۔ اس کے تقدّس بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکّل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجب الاطاعت بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرّہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے؟ اس کی مشیئت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لئے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے؟ کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جواب دِہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیّت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیّل نہ تھا۔ عرب جاہلیّت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کر لو اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیئے۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ربّانی تعلیمات سے اُن کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا۔ اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا۔ اس کی مشیئت و ارادہ اور قدرت و وُسعت سے آگاہ کیا۔ ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی اُن کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وُسعت غیر محدود ہے جس کی مشیئت کائنات کے ہر ذرّہ میں نافذ ہے۔ جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اُجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ دلوں کے اسرار زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں۔ اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمّہ دار ہے۔ اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی اُمّید ہے۔ وہ محبوبِ ازل ہے۔ اس کی محبّت کا نشہ ہمارے

دلوں کی ہوشیاری ہے۔ اس کے فضل وکرم اور لطف ومحبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں۔ اس کی قوت ہر قوت پر غالب۔ اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔ اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض، اور اس کی اطاعت ہر مکلّف پر واجب ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک ومنزّہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متّصف ہے۔ انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور اُن کے تزکیہ واصلاح کے لئے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہمکلام ہوتا رہا۔ اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی اُمید، زخمیوں کا مرہم۔ بیقراروں کی تسلّی اور بیکسوں کا سہارا ہے۔ وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے۔ ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے۔ وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے وہ جب چاہے آسمان وزمین کو فنا کر دے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے۔ اس کی محبّت دنیا کا حاصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرعد: ۲۸)

ہاں! خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا، وہ اُس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیّار ہو گئے۔ وہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست وسرشار رہتے تھے:

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران: ۱۹۱)

وہ خدا کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

اس سرمستی وسرشاری میں بھی انھوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی۔ دولتمندوں کی

بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا۔ دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جد و جہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور خدا کا حکم مان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجالائے۔ اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارِ ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا۔ خدا نے اُن کی مدح کی کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

(النور : ۳۷)

وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبّتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا۔ خدا نے اُن کی توصیف کی کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

(البقرۃ ۱۶۵)

ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

اُن کا توکّل، اُن کا صبر، اُن کا استقلال، اُن کی استقامت اُن کی بہادری، اُن کی بے خوفی، اُن کی صداقت، اُن کی راست بازی، اُن کی اطاعت غرض اُن کی ہر چیز اُن کے اِسی جذبۂ ایمانی کا پَرتو تھی۔ اور ہر وقت اُن کے پیشِ نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

(الطلاق : ۳)

جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ

(الزمر : ۳۶)

کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔

وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ

اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔

(الاحزاب : ۳۷)

اُن میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسما و صفات دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ "ہم نے آدمؑ کو سب نام سکھائے"۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچی مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے۔ یہی ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے۔ ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطقی کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے ہیں۔ لیکن ہزاروں صدیاں گذرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حدِ منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے۔ جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات، عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ جب مادیت کا یہ عالم ہے تو وراء الورا ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ تحمل کیونکر کر سکتی۔ تجلّی گاہِ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اُس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصابِ انسانی کے مطابق تعلیم دی۔ عرب کا جاہل اَللّٰہ نام ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیّل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ کے اسماء و صفات سے بھی وہ قطعاً بیگانہ تھا۔ دیوانِ عرب یعنی اُن کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا۔ قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اُتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالےٰ کے اسماء و صفات سے بھی آگاہ تھے۔ بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ "الرحمٰن" کا لفظ بھی مستعمل تھا جس کے معنی "رحم کرنے والے" کے ہیں۔ اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس ابرہہ کے نام سے سدِّ عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ رحمان

کا لفظ آیا ہے۔ عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑ ہو گئی تھی۔ اس لئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صلحِ حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرتؐ نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ "قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمٰن کیا ہے"[1]

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سُننے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لئے رحمان کا لفظ مستعمل ہونے کی وجہ سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے اُن کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے :

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو
لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ	سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہے ؟
اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ	کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں۔ رحمان
نُفُوْرًا ۝	کا نام ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

(الفرقان : ۶۰)

مشرکین کو یہ بُرا لگتا تھا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو اُن کے بُتوں اور دیوتاؤں کی مذمّت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح و ستایش کرتے ہیں :

اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ	(مشرک آپؐ کو دیکھتے تو مذاق سے کہتے
وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ	کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں

---

[1] صحیح بخاری جلد اوّل کتاب الشروط۔

كٰفِرُوْنَ ○ (الانبیآء، ۳۶)

کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔

تعلیمِ محمدیؐ نے عرب کے ناآشنایانِ حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں۔ اسکو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جاسکتا ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ (بنی اسرآئیل: ۱۱۰)

کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر۔ جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

اللہ تعالےٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کی اُن اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی اُن کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام "یہوا" تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی۔ دوسرا عام نام "اہیم" ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصافِ ذاتی اور اعمالِ ربّانی کے ترجمان ہیں تورات کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے "وہ فوجوں والا خدا" یعنی ربّ الافواج ہے جو صرف خدا کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں "باپ" کا لفظ خدا کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے اور گوشت پوست اور مادّیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے؟ اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک

غلطیاں پھیلیں؛ ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کی صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادّی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلۂ صفات کے پردہ میں چھپالیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ، باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰؑ) اور روح القدسؑ حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں۔ باپ حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے۔ اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں۔ اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسّم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالےٰ کے اسماءُ وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے لیکن ہر صفت نے اُن کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرّد رہ گیا ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسّمِ صفات کی جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ برہما، مہیش، وشنو تین صفات خالق، ممیت (مارنے والا) اور قیّوم کے مجسّمے ہیں۔ غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی ہے۔ شنکر آچاریہ نے خدا کی صرف تین اصلی صفات تسلیم کیں۔ حیات، علم اور سرور یا آنند۔ جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیّت کی صفت کے تجسّم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی۔ عام ہندوؤں میں تینتیس کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات و اسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں۔ مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دو صفتوں ہادی اور مضلّ کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے۔ اس [illegible] سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا ہے۔ ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربّانی ہدایت کے نور سے سراجِ منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن

کیا وہ نبوتِ محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں ہے۔

آپؐ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ آپؐ نے یہ دعا سکھائی "اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا اپنی کتاب میں اُتارا یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے لئے اپنے علمِ غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں"۔ حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی "خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں"[1]۔ قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ○ (الکہف : ۱۰۹)

کہہ دے (اے پیغمبر کہ) اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔

دوسری جگہ کہا گیا:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو

---

[1] یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں بسند نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابنِ حنبل میں بھی (بسند) عبداللہ بن مسعودؓ ہے۔

اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ط — جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

(لقمٰن ، ۲۷)

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لئے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ○ — نہیں کوئی معبود لیکن وہی اللہ۔ اسی کے لئے ہیں سب اچھے نام۔

(طٰہٰ: ۸)

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذاتِ بے ہمتا کے لئے ہے خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو۔ لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ج — کہہ دیجئے (اے پیغمبر) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر۔ جو چاہو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

(بنی اسرآئیل: ۱۱۰)

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اُس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اُس کو یاد نہ کرو:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ص وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ط — اور اللہ ہی کے لئے ہیں سب اچھے نام اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

(الاعراف ، ۱۸۰)

تعلیم محمدیؐ کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے۔

بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء وصفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع ہو گا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو۔ اور یہ تمام اوصاف اور نام اُس عشق و محبّت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوبِ ازل اور نورِ عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونی چاہیے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ لا يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

(النور: ۳۵)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، نہ وہ پورب ہے نہ پچھم ہے، اسکا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی۔ خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے، پہنچا دے۔ اور خدا لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ

اللہ، نہیں ہے اس کے سوا اور کوئی معبود۔ وہ ہمیشہ زندہ، تمام دنیا کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کو

مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ
یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ
یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ
مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ
كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ
وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ
الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○

(البقرۃ: ۲۵۵)

اونگھ اور نیند نہیں آتی۔ آسمانوں میں
اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔
کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے
سفارش کرنے کو کھڑا ہو۔ انسانوں کے سامنے
اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو وہ جانتا ہے اور وہ
لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن
جتنے کا وہ چاہے۔ اسکا تخت آسمانوں اور زمینوں کو سمائے
ہوئے ہے اور ان دونوں (آسمان و زمین) کی نگہبانی
اسکو تھکاتی نہیں۔ اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ
عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ
هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ هُوَ
اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ
الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ
الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ
اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ
الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ
الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ

وہی اللہ ہے جسکے سوا کوئی اللہ نہیں۔ چھپے اور کھلے
کا علم رکھنے والا وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا
ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں
سب کا بادشاہ، پاک، پوری سلامتی، امن والا،
ہر شے پر گواہ، غالب، سب پر قابو والا۔ بڑائی والا
ہر اس چیز سے پاک ہے جسکو یہ مشرک خدا کا
شریک بناتے ہیں۔ وہی اللہ پیدا کرنیوالا، بنانے
والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا۔ اسی کے لئے
سب اچھے نام ہیں۔ جو کچھ آسمانوں میں اور
زمین میں ہے، سب اس کی پاکی

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ
وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○

بیان کرتے ہیں وہی سب پر غالب اور
حکمت والا ہے۔

(الحشر : ۲۲ – ۲۴)

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ
وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ لَهٗ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ
یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ
شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ
وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ
شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ
اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ
یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ
مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ
مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ
وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَی
اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○ یُوْلِجُ

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ
سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی
غالب اور دانا ہے۔ آسمانوں کی اور زمین کی
حکومت اُسی کی ہے۔ وہی جِلاتا ہے اور مارتا
ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔ وہی پہلا اور
پچھلا ہے اور وہی کھُلا ہے اور وہی چھُپا ہے
اور ہر بات کو جانتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں
کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر تخت پر
برابر ہوا۔ وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے اور
جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اُترتا
ہے اور جو اُس میں چڑھتا ہے۔ اور جہاں بھی
تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور اللہ تمہارے
کاموں کو دیکھتا ہے۔ آسمانوں کی اور زمین کی
بادشاہی اُس کی ہے۔ اور اللہ ہی تمام
چیزوں کا مرجع ہے۔ وہ رات کو دن میں
داخل کر دیتا ہے اور دن

الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ	کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں
فِي الَّيْلِ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ	کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔
الصُّدُورِ ○	

(الحدید: ۱-۶)

خدا کے متعلق اہلِ عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو مٹا کر انکے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا اس کا اندازہ حسبِ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ آپؐ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کی آل و اولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو۔ گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اُس کے جواب میں وحیٔ محمدیؐ نے اپنے خدا کی حقیقت قرآنِ پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی:[1]

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ○ اَللّٰهُ	کہہ دے (اے پیغمبر) اللہ ایک ہے وہ تنہا
الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ ۙ	اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جائے
وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ	پناہ ہے۔ نہ اسکے کوئی اولاد ہے اور نہ اسکے ماں
لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ ○	باپ ہیں (جنھوں نے اسکو جنا ہو) اور نہ اسکا کوئی ہمسر
(الاخلاص: ۱-۴)	ہے جو اس کی بیوی ہو۔

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے جو صحابہؓ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے

---

[1] مستدرک حاکم تفسیر اخلاص (صحیح) و جامع ترمذی تفسیر سورہ مذکور و کتاب الاسماء بیہقی۔

جاتے تھے۔ وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "صمد وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو۔ کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث اور جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے۔ اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے"۔ غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے پہلے اہلِ عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیّل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو۔ اور آپؐ کی تعلیم کے بعد وہ تخیّل کتنا پاک اعلیٰ اور بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اُسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فیضِ تعلیم سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ آپؐ سے سُن کر کہتے ہیں کہ "خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جُھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی۔ اس کا جُھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا۔ حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے۔ اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اُس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں وہ ایک "صمد" ہوں جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے"[1]۔ حضرت ابوہریرہؓ یمنی عرب ہیں یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیم محمدیؐ سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منھ سے اُگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ "صمد" ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفاتِ الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے۔ "صمد" کے معنی لغت میں اُونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقہ میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جانیں بچائیں۔ پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی

---

[1] صحیح بخاری سورہ اخلاص۔

پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو۔ اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو۔ اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا ہو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے۔ اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا ہے جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے۔ صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو۔ اسی سے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو۔ اُس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو۔ اُس بہادر کو بھی کہتے جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو۔ صَمَدَۃٌ اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو۔ حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ "صمد" وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجۂ کمال پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بُردبار جس کی بُردباری بدرجۂ اتم ہو، وہ بے پرواو بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجۂ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی بہ ترتیبۂ کمال ہو یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو۔[1]

ان معنوں کے علاوہ صحابہ و تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں:۔

ابن عباسؓ: وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصریؒ: وہ حیّ و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انسؒ: جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعودؓ: جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔

بریدہؓ: جس میں جوف نہ ہو۔

---

[1] کتاب الاسماء والصفات، امام بیہقی بسند۔

عکرمہ و شعبیؓ : جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہؓ : جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہؓ : باقی، غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی[1] اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں کیونکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے اصلی معنی "چٹان" کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے۔ اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لئے چٹان کا لفظ آیا ہے۔ استثناء (۳۲-۳۰-۳۱) میں ہے:

"اگر اُن کی چٹان اُن کو بیچ نہ ڈالتی اور خداوند اُن کو اسیر نہ کروا تا کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان"

یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے۔ سموال کے پہلے صحیفہ (۲-۲) میں یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے "خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں تیرے سوا کوئی نہیں کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں"

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں: (اَحَدٌ) (ایک) اور صَمَدٌ (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں۔ اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں نہ اس کو کسی کی حاجت نہ اس کو کسی سے غرض۔ وہ یکتا و تنہا، اکیلا، بے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے۔ لیکن اسی کمالِ یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دستگیر،

---

[1] ان معانی کیلئے دیکھو کتاب الاسمائ بیہقی، مفردات القرآن راغب اصفہانی، ابن جر[illegible] ابن

سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان ہے جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلّی اور اضطرابوں میں تشفّی ہے۔:

ففرّوا الی اللہ (الذاریات: ۵۰) ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔

یہ سورہ پاک توحیدِ اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لئے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے۔ ایک صحابیؓ تھے جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرتؐ سے بیان کیا۔ آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی۔ انھوں نے کہا۔ "اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے"[1]۔ ایک اور انصاری صحابیؓ تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے۔ ان کے مقتدی صحابہؓ نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرتؐ سے کیا۔ آپؐ نے اُن سے اُس کی وجہ دریافت کی تو گذارش کی کہ "یا رسول اللہؐ! مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے"۔ ارشاد ہوا کہ "یہ محبت تم کو جنّت میں لے جائے گی"[2]۔ قتادہ بن نعمانؓ ایک صحابی تھے جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور لطف حاصل کرتے رہتے تھے۔ لوگوں نے آنحضرتؐ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ "یہ سورہ قرآن کا تہائی حصّہ ہے"[3]۔

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرتؐ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی، اُس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کے حصّہ میں آیا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید۔ [2] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ۔ [3] مسند احمد بسند ابی سعید الخدریؓ۔

قرآنِ مجید اور احادیث میں اللہ تعالےٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ تعالےٰ کے ننانوے نام ہیں۔ جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنّت میں داخل ہوگا۔[1] خدا طاق ہے۔ وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے"۔ آخری فقرہ اس علّت کو ظاہر کرتا ہے کہ ننانوے نام کیوں رکھے گئے پورے سو کیوں نہ مقرر کئے گئے۔ یہ اس لئے کہ پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا۔ اور اس سے توحید کا رمز آشکارانہ ہوتا۔ صحیح احادیث میں اسی قدر ہے۔ یعنی ان ننانوے ناموں کی تصریح نہیں ہے۔ ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی گیا ہے۔ لیکن محدّثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابنِ حجر نے بھی لکھا ہے کہ "یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں"۔ پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور اُلٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی اِن میں ہیں جو قرآنِ مجید میں مذکور نہیں۔ اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں اِن میں نہیں ہیں۔ اسی لئے علماءؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحّص سے کیا ہے۔ اسی لئے ان روایتوں سے یہ شبہہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے میں محصور ہیں۔ بلکہ بڑے بڑے آئمہ اور محدّثین مثلاً عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابنِ حجر، امام خطابی، ابنِ تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں۔ اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفاتِ الٰہی کی کوئی حدّ و پایاں نہیں ہے۔[2] اور اس پر محدّثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغازِ مضمون میں اوپر گذر چکی ہیں، استدلال کیا ہے۔

بہرحال قرآنِ پاک اور احادیثِ صحیحہ کے تتبّع سے علماء نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم کتاب الذکر و مسند احمد بسند ابی ہریرہؓ و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابوعوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ [2] تمہید ابوشکور سالمی القول الثالث فی عدد الاسمأ۔ یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ یہ تمام نام وہ ہیں جو یا بطور علَم یا بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں اور یا آنحضرتؐ نے دعاؤں میں اِن کی تعلیم کی ہے۔ ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرتؐ نے خدا کا جو تخیّل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزّہ اور پاکیزہ ہے۔ علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں۔ ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگزر یعنی صفاتِ جمالی ظاہر ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو صفاتِ جلالی کہتے ہیں۔ تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ، بلندیٔ کمالات کی جامعیّت اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامدِ عالیہ کا ثبوت مِلتا ہے اور ان کو ہم صفاتِ کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اُس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے اور یا اس کی تنزیہہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبّت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ : یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآنِ پاک میں بطورِ علَم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ

وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقلِ انسانی حیران و سرگرداں ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبّت رکھے جو ماں کو اپنے بچّوں

کے ساتھ ہوتی ہے اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ :۔ اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے۔ جس کو عَلَم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی رحم والے کے ہیں۔ یہ گذر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا۔ عام اہلِ عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا۔ قرآنِ مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے۔ بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو اجنبی ذاتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدتِ الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدّد کو حقیقت کے تعدّد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ

اللہ کہو یا رحمٰن کہو جو چاہو کہو اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں۔

(بنی اسرآئیل : ۱۱۰)

اَلرَّحِيْمُ : رحم کرنے والا۔ رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے جس سے بچّہ کی پیدائش ہوتی ہے اس لئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبّت کا جذبہ نمایاں ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ اور اَلرَّحِيْمُ خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منوّر ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا وہ اس کی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے۔ اس عالم اور اُس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور رہے اور ہوگا۔

اَلرَّبُّ : پرورش کرنے والا۔ یعنی ہستی کے اوّل نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر

لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور و ترقّی کا ذمہ دار۔

اَللَّطِیْفُ : لُطف والا مہربان۔

اَلْعَفُوُّ : معاف کرنے والا درگذر کرنے والا۔

اَلْوَدُوْدُ : محبوب۔ محبّت کرنے والا پیار کرنے والا۔

اَلسَّلَامُ : امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

اَلْمُحِبُّ : محبّت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

اَلْمُؤْمِنُ : امان دینے والا۔ امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

اَلشَّکُوْرُ : اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

اَلْغَفُوْرُ وَالْغَفَّارُ : معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگذر کرنے والا۔

اَلْحَفِیْظُ وَالْحَافِظُ : حفاظت کرنے والا، نگہبان، بچانے والا۔

اَلْوَهَّابُ : دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

اَلرَّازِقُ وَالرَّزَّاقُ : روزی دینے والا، نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

اَلْوَلِیُّ : دوست، حمایتی، طرفدار۔

اَلرَّؤُفُ : مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

اَلْمُقْسِطُ : انصاف والا، عادل۔

اَلْهَادِیْ : راہ دکھانے والا، رہنما۔

اَلْکَافِیْ : اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لئے کافی۔

اَلْمُجِیْبُ : قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

اَلْحَلِیْمُ: بُردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

اَلتَّوَّابُ وَقَابِلُ التَّوْب: توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگذر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

اَلْحَنَّانُ: ماں کی طرح بچّوں پر شفقت کرنے والا۔

اَلْمَنَّانُ: احسان کرنے والا۔

اَلنَّصِیْرُ: مدد کرنے والا۔

ذُوالطَّوْلِ: کرم والا۔

ذُوالْفَضْلِ: فضل والا۔

اَلْکَفِیْلُ: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

اَلْوَکِیْلُ: بندوں کی ضرورتوں کا ذمّہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

اَلْمُقِیْتُ: روزی پہنچانے والا۔

اَلْمُغِیْثُ: فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

اَلْمُجِیْرُ: پناہ دینے والا۔

اَلْمُغْنِیْ: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنیوالا۔

صفاتِ جلالی یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے:

اَلْمَلِکُ وَالْمَلِیْکُ: بادشاہ، فرماں روا۔

اَلْعَزِیْزُ: غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

اَلْقَاھِرُ وَالْقَھَّارُ: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جاسکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

اَلْمُنْتَقِمُ: سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

اَلْجَبَّارُ : جبروت والا، جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے، جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

اَلْمُهَيْمِنُ : سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

اَلْمُتَكَبِّرُ : اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شَدِيْدُ الْعِقَابِ : سخت سزا والا۔

شَدِيْدُ الْبَطْشِ : بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ خدا کے صفاتِ جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے۔ لیکن صحیفہ محمدیؐ میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے۔ اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○ بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں

(آل عمران : ۱۸۲)

اسی لئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عَزِيْزٌ (غالب) کے ساتھ حَكِيْمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے۔ اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے: جہاں یہ کہا گیا کہ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ[۱]۔ وہیں یہ بھی کہا گیا

---

[۱] ص : ۶۵۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ[۵۱]۔ قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمایا گیا:

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ○ اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

(المؤمن: ۳۱)

اس کی صفت ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ[۵۲]۔ (دردناک عذاب دینے والا) جہاں بیان کی گئی تو اس سے پہلے لَذُوْ مَغْفِرَةٍ (یقینی بخشش والا) بھی فرمادیا گیا۔ غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو تاکہ خوف و خشیّت کے ساتھ اس کی محبّت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی | یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی وحدانیّت سے متعلّق ہیں۔ دوسرے وہ جو وجود سے تعلّق رکھتے ہیں۔ تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے۔

صفاتِ وحدانیت | یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں:-

اَلْوَاحِدُ : ایک

اَلْاَحَدُ : ایک

اَلْوِتْرُ : طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

صفاتِ وجودی | یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقاء، دوام، ازلیّت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے:

---

[۵۱] ص: ۶۶۔ [۵۲] حٰمٓ السجدۃ: ۴۳

اَلْمَوْجُوْدُ : وجود والا، ہست۔

اَلْحَیُّ : ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

اَلْقَدِیْمُ : وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔

اَلْقَیُّوْمُ : جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اَلْبَاقِیْ : جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

اَلدَّآئِمُ : ہمیشہ رہنے والا۔

اَلْاَوَّلُ : وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

اَلْاٰخِرُ : وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

اَلْمُقَدِّمُ : جو سب کے آگے سے ہے۔

اَلْمُؤَخِّرُ : جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

اَلظَّاھِرُ : جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

اَلْبَاطِنُ : جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

علم یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں :

اَلْخَبِیْرُ : خبر رکھنے والا۔

اَلْعَلِیْمُ : جاننے والا۔

عَلَّامُ الْغُیُوْبِ : جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ : دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

اَلسَّمِیْعُ : سننے والا۔

اَلْبَصِیْرُ : دیکھنے والا۔

اَلْمُتَكَلِّمُ : بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

اَلْوَاجِدُ : پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔

اَلشَّهِيْدُ : حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں۔

اَلْحَسِيْبُ : حساب کرنے والا، یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار اُن کا بھی جاننے والا۔

اَلْمُحْصِيْ : گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد اُن کا بھی جاننے والا۔

اَلْمُدَبِّرُ : تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔

اَلْحَكِيْمُ : حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

اَلْمُرِيْدُ : ارادہ کرنے والا، مشیئت والا۔

اَلْقَرِيْبُ : نزدیک جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت | یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے :

اَلْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ : ہر مشکل کو کھولنے والا۔

اَلْقَدِيْرُ وَالْقَادِرُ : قدرت والا۔

اَلْمُقْتَدِرُ : اقتدار والا جس کے سامنے کوئی چون چرا نہیں کر سکتا۔

اَلْقَوِيُّ : زبردست جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

اَلْمَتِيْنُ : مضبوط جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

اَلْجَامِعُ : جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

اَلْبَاعِثُ : اُٹھانے والا، مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرکِ اوّل۔

مَالِكُ الْمُلْكِ : سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

اَلْبَدِیْعُ : نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔

اَلْوَاسِعُ : سمانے والا جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اَلْمُحِیْطُ : احاطہ کرنے والا جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

اَلْمُحْیِیْ وَالْمُمِیْتُ : جلانے والا اور مارنے والا۔

اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ : سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ : عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ : نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

اَلْمُعْطِیْ وَالْمَانِعُ : دینے والا اور روک لینے والا۔

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ : نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِیْدُ : جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا دی گئی اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ : اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے، جیسے اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانے والا) اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا)، اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا)، اَلْمَانِعُ (روکنے والا) وغیرہ، ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے یعنی خدا کو صرف اَلضَّارُّ، اَلْخَافِضُ، اَلْمَانِعُ اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے یعنی اَلضَّارُّ کے ساتھ اَلنَّافِعُ، اَلْخَافِضُ کے ساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کے ساتھ اَلْمُعْطِیْ اور

اَلْمُذِلُّ کے ساتھ اَلْمُعِزُّ ۔ جیساکہ اوپر لکھا گیا ہے قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک طرح کی برائی ہے۔ ہاں نقصان نفع پہنچانے والا، عزت و ذلت دینے والا، اور دینے والا اور روکنے والا دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا۔ اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے۔ اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں، یا ایسا عزت دینے والا جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور و مضطر ہوگا اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا۔ البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہہ یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب و نقصان سے اس کی براءت کو ظاہر کرتی ہیں:

اَلْعَلِیُّ : مرتبہ والا۔

اَلْعَظِیْمُ : عظمت والا

اَلْکَبِیْرُ : بڑا۔

اَلرَّفِیْعُ : بلند۔

اَلْجَلِیْلُ : بزرگ۔

اَلْکَرِیْمُ : شریف۔

اَلْغَنِیُّ : بے نیاز

اَلصَّادِقُ : سچا راست باز۔

اَلْمَاجِدُ : عزت والا۔

اَلْحَمِیْدُ : تعریف والا۔

اَلْقُدُّوْسُ : پاک۔

اَلْحَقُّ : سچا اور اصلی یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔

اَلْجَمِیْلُ : اچھا۔

اَلْبَرُّ : نیک۔

اَلْعَدْلُ : عادل۔

سُبُّوْحٌ : ہر عیب سے پاک۔

اَلصَّمَدُ : بزرگی کی ہر صفت میں کامل۔

اَلرَّشِیْدُ : سیدھی راہ چلنے والا، نہ بہکنے والا۔

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر اللہ تعالےٰ کے ان اسماء وصفات کا عقیدہ دینِ محمدیؐ میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے یعنی اس کے یہ محامد واوصاف اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں۔ ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اُس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں، بقیہ اوصاف ومحامد انسان کے لئے قابلِ نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد واوصاف سے دُور کی نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اُس کے محامد واوصاف سے نسبت پیدا کرے اور ان کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل وپیروی کی خواہش کرے۔ محامدِ الٰہی گویا استادِ اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیئے۔ اس لئے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامدِ الٰہی کی نقل اُتارنے) میں ایک نظر اُس استادِ ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے۔

گذر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ

خَلِیْفَۃً[۱]۔ آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔ خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پَرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا۔ اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کریگا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتا پا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا :

صِبْغَۃَ اللّٰہِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً

خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

(البقرۃ : ۱۳۸)

تمام اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ اس "خدائی رنگ" سے مقصود خدا کا "دینِ فطرت" ہے۔

یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ "ان اللہ خلق ادم علی صورتہ (خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا) اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گذری ہے کہ اس "صورت" سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی شکل و صورت ہے یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اور ان میں حدِ بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے۔ اور انسان کو اخلاق و صفت میں ملاءِ اعلیٰ سے تشبیہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصانِ خدا کے اس مقولہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو) کا مطلب ہے۔ حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (حُسنِ خلق خدا تعالیٰ کا خلقِ عظیم[۲] ہے)

اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں۔ جلالی، کمالی اور تنزیہی۔ صفاتِ جلالی جو کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں اللہ تعالےٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور

---

[۱] البقرہ : ۳۰۔ [۲] کنز العمال، ج دوم، بروایت حضرت عمار بن یاسرؓ۔

نہ یہ اوصاف بندگی وعبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں۔ ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کی صفات پیدا ہوں یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری۔ اسی لئے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لئے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوا۔ اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا:

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ○ (البقرۃ: ۳۴)

اس نے (آدمؑ کے سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی اور اسکا مستحق نہیں:

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الجاثیۃ: ۳۷)

اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ہے۔

صحیح مسلم میں[۵۱] ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے۔ (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت و کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا۔" دوسری جگہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "خدا کے نزدیک سب سے برا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے۔ خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں[۵۲]" اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ[۵۳] اس کی شان ہے البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور وہ ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے۔ مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سرِ نیاز اظہارِ

---

[۵۱] کتاب الادب باب الکبر جلد دوم۔ [۵۲] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب۔ [۵۳] الحشر: ۲۳۔

بندگی کے لئے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت وجلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مؤمنوں پر ہوا۔ یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ — اور عزت خدا کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنوں کے لئے ہے

(المنافقون: ۸)

حاکم میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں۔ وہ اپنی عزت وجلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے، معزز بننا چاہتا ہے تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائے گا "(اس کا) مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا" (قرآن)۔ اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا۔ اور جو کبریائی کرتا ہے تو وہ خدا کی اس چادر کو اُتارنا چاہتا ہے جو خدا ہی کے لئے تھی۔[1]

خدا کی صفاتِ کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی وابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں، بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے۔ صفاتِ تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں۔ ان کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

خدا کے صفاتِ جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لئے حسبِ استعداد کھلا ہوا ہے۔ ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو ودرگذر ہے۔ عیسائیوں کی عام دعا میں

---

[1] کنز العمال جلد دوم ومستدرک حاکم۔

ایک فقرہ ہے کہ "خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں۔" اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے۔ اس کے ہاں یہ ہے کہ "اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے۔" آنحضرتؐ نے فرمایا "جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈالے گا خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔"[۱] قرآن کہتا ہے کہ "تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے"

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ	اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی
اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ	برائی کو معاف کر دو تو (اللہ) بھی معاف کرنے
كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝	والا قدرت والا ہے۔

(النسآء: ۱۴۹)

ایک دفعہ عہدِ نبوت میں بارگاہِ عدالت قائم تھی۔ ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی، سزا کا منظر دیکھ کر حضورؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ اداشناسوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو۔ خدا معاف کرتا ہے اور عفو و درگزر کو پسند کرتا ہے تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"[۲]

آنحضرتؐ ایک دفعہ صحابہؓ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔" ایک صحابیؓ نے عرض کی "یا رسول اللہؐ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں۔ اس کا جوتا اچھا ہو۔ کیا یہ بھی غرور ہے؟" فرمایا:

انّ اللّٰہ عز وجل جمیل یحب	اللہ تعالےٰ اچھا ہے، جمال والا ہے
الجمال[۳]	اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

---

[۱] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ۔ [۲] مستدرک للحاکم جلد چہارم، کتاب الحدود۔ [۳] صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبر۔

یہ غرور نہیں۔ غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے۔" یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ "خدا جمال والا ہے۔ وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔"[۱] یہ روایت بھی ہے۔ "خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے وہ سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے۔ وہ صاف ستھرا ہے صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔"[۲] روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔ "وہ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاقِ عالیہ سے محبّت اور بد اخلاقیوں سے نفرت کرتا ہے۔"[۳] ایک موقع پر آنحضرتؐ حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں۔ "اے عائشہؓ! خدا نرمی والا ہے۔ وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔"[۴] ایک مرتبہ آپؐ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ "لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔"[۵] عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے۔ وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔"[۶]

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ "رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔"[۷] رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔ جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاؤں گا۔"[۸] ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے "میں خدا ہوں۔ میں رحمان ہوں۔ میں

---

[۱] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔ [۲] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ کامل لابن عدی۔ [۳] ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی۔ [۴] صحیح مسلم، ابو داؤد، حاکم، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی فی الآداب۔ [۵] صحیح مسلم کتاب الصدقات و ترمذی تفسیر سورہ بقرہ۔ [۶] ابو داؤد باب استحباب الوتر۔ [۷] صحیح بخاری باب صفۃ الرحم۔ [۸] صحیح مسلم: ابواب البر و الصلہ۔

نے رحم پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے۔ تو جو اس کو ملائے گا میں اُس کو ملاؤں گا۔ جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔"[1] پھر فرمایا۔ "جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔"[2] بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"[3] آپؐ نے فرمایا۔ "خدا نے رحم کے سو حصّے کئے۔ ننانوے حصّے اپنے پاس رکھے اور ایک حصّہ زمین والوں کو عنایت کیا۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچّہ کے لئے اس خوف سے پاؤں اُٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔"[4]

بخل خدا کی صفت نہیں۔ مگر آپؐ نے فرمایا۔ "تم اپنی تھیلی کے منھ نہ بند کرو ورنہ تم پر بھی تھیلی کا منھ بند کیا جائے گا۔"[5] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ "جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا۔"[6] یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ "جب تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو خدا تمہاری مدد میں ہے۔"[7]

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ "خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں۔ اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے۔"[8] اس کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "خدا بھی غیرت والا ہے اور مومن بھی غیرت والا ہے۔ اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔"[9]

اللہ تعالےٰ ظلم سے پاک ہے:

---

[1] ابواب البر والصلۃ۔ [2] ابواب البر والصلۃ۔ [3] صحیح بخاری باب رحمۃ الولد۔ [4] صحیح بخاری باب رحمۃ الولد۔ [5] صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ۔ [6] مسلم کتاب البر والصلہ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا بان یستر علیہ فی الآخرۃ۔ [7] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعونۃ للمسلم۔ [8] صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم۔ [9] جامع ترمذی باب ماجاء فی الغیرۃ من ابواب النکاح۔

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○ اور بے شک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

(اٰل عمرٰن : ۱۸۲)

اس لئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ کی زبان سے اس کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

یاعبادی انی حرمت الظلم	اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام
علی نفسی وجعلته بینکم	کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا
محرما فلا تظالموا[1]	ہے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیے۔ آپؐ نے فرمایا:

انّ اللّٰه طیب یحب الطیب	خدا پاکیزہ ہے۔ پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک
ونظیف یحب النظافة	صاف ہے۔ پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے
فتنظفوا ولا تشبهوا	تو تم پاک وصاف رہا کرو۔ یہودیوں کی
الیهود[2]	طرح گندے نہ بنو۔

یہ توحید کا ایک رخ تھا۔ اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا تھیں انھوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا۔ وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں۔ یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ ومسند ابن حنبل جلد ہشتم، ادب المفرد امام بخاری باب الظلم۔ [2] ترمذی باب فی النظافة ص ۴۵۶۔

کے سوا ہر شئے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی۔ بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ بابل و مصر، ہند و ایران کے خدا اور رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے جن کا عزل و نصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا، بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند و پست، شریف رذیل مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منھ سے کچھ کی اس کے ہاتھ سے اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساواتِ انسانی کی دولت دنیا سے گم ہو چکی تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم و جبر اور غرور و فخر کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آکر اس اونچائی نیچائی، بلندی و پستی اور نشیب و فراز کو برابر کیا۔ سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں۔

بالآخر اس اصول کی صداقت کو انھوں نے بھی تسلیم کر لیا جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لئے وہ مساواتِ انسانی کے حقیقی کوچہ سے بھی اب تک نابلد ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوتِ درجہ کا خیال ان کے دل سے دُور نہیں ہوتا۔ اور وہ دولت و فقر اور رنگ و قومیت کے امتیازات کو خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے مساوات کی نعمت اسی توحیدِ کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں۔ اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں۔ دولت و فقر، رنگ و روپ

اور نسل و قومیّت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا۔ اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط	تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہے۔
(الحجرات: ۱۳)	

خدا کا ڈر اور پیار اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبّت کرنے کا ہے عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہّار، جبار اور مہیب شہنشاہِ مطلق ہے جس کی ہیبت و جلال سے تمام بندوں کی صرف ڈرتے، کانپتے رہنا چاہیئے۔ اس کے گوشۂ چشم میں لطف و عنایت کا گذر نہیں۔ محبّت و پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبّت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبّت کا تقاضا کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ تعلیمِ محمدیؐ کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات اوپر گذر چکے ہیں ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پُر جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرتِ تامّہ اور مالکیّتِ عامّہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام نام صرف محبّت اور پیار، لطف اور کرم، رحمت اور مہر کی تجلّی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہوں سے مغالطہ ہوا:

۱۔ آنحضرتؐ نے اللہ تعالےٰ کے خوف اور خشیّت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

۲۔ دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالےٰ کے ساتھ محبّت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں آپؐ نے شدّت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبّت کے ساتھ خوف و خشیّت کی تعلیم یہ واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبّت اور پیار کے ساتھ اس کے خوف و خشیّت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو انسانوں میں تمام کاموں

کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں۔ خوف اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا الگ الگ نیچے بھی۔ ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز، تبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبۂ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد صرف خوف کے جذبہ سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل، نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور یہی نبوت محمدی کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے ان کے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی اور صراط مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سراسر خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار[۱] اور باپ کا بدلہ پشت ہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔[۲] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔[۳] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی۔ گو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے۔[۴] مگر دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دونوں متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے۔ نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ سمجھتا ہے اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے۔ بلکہ وہ خدا کی نسبت

---

[۱] یرمیاہ ۳۲، ۱۱، ۱۵ وغیرہ۔ [۲] خروج ۲۰۔ ۵، ۳۴۔ ۷ و استثناء ۴۔ ۲۴ و ۶۔ ۱۵ وغیرہ۔ [۳] خروج ۲۰۔ ۷، و ۳۴۔ ۷، و زبور ۸۶۔ ۱۵ و ۱۰۳۔ ۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے۔ [۴] لوقا کی انجیل ۱۲۔ ۵ اول پطرس ۲۔ ۱۷، دوم قرنتیون ۷۔ ۱۔ افسیون ۵۔ ۲۱۔ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی کر دی گئی۔

یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمٰن وکریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور ورحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے۔ اس سے ڈرنا بھی چاہئے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہئے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(الاعراف: ۵۵-۵۶)

(لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارا کرو۔ وہ حد سے بڑھ جانیوالوں کو پیار نہیں کرتا۔ اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل وکرم کی) لو لگاتے ہوئے پکارا کرو۔ بیشک خدا کی رحمت اچھے کام کرنیوالوں کے قریب رہتی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۚ

(الانبیآء: ۹۰)

وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے مگر اس کو جبّار وقہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ

(یٰسٓ: ۱۱)

اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ — جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا

(قٓ : ۳۳)

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے جلال کے سامنے گُنگ ہے:

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ — اور رحم والے کے ادب سے تمام

(طٰہٰ : ۱۰۸) — آوازیں پست ہوگئیں۔

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیّت کی تعلیم دیتے تھے مثلاً حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام۔ دوسرے وہ جو محبّتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بُلاتے تھے مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخِ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب دونوں کی جامع تھی یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک طرف آپؐ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں اور دوسری طرف آپؐ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپؐ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے تھے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپؐ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبانِ مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گذرتی جاتیں تو جب کوئی خوف و خشیّت کی آیت آتی آپؐ پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبّت اور رحم و بشارت کی آیت ہوتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔[۱]

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبّت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف و خشیّت اور رحم و محبّت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے۔

---

[۱] مسند ابنِ حنبل جلد ششم۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الخوف و الرجآء (ایمان کامل خوف اور اُمید کے درمیان ہے) کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم وکرم سے ناامید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ ان کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کے رُو سے برابر کا درجہ دیا۔ لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سُنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ فرمایا:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ط (الاعراف: ۱۵۶)

اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اور اس کی تفسیر خود صاحبِ قرآنؐ نے ان الفاظ میں کی:

رحمتی سبقت غضبی (صحیح بخاری)

میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو فرزندِ الٰہی کا لقب دیا۔ بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جوڑ پر حضرت عزیر علیہ السلام کو فرزندِ الٰہی کا رتبہ دیا۔ لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لاکر کھڑا کرتا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ط (المائدۃ: ۱۸)

ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۖ

(المائدۃ: ۱۸)

کہہ دو کہ اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے (اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو جن کو اس نے پیدا کیا۔

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

(الجمعۃ: ۶)

اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمتِ الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد نبویؐ میں آکر دعا کی کہ "خدایا مجھ کو اور محمدؐ کو مغفرت عطا کر"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"[۱]۔ ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ "خدایا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر"۔ آپؐ نے صحابہؓ کی طرف خطاب کرکے فرمایا "یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ"[۲]۔

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت اس مسئلہ میں تعلیم محمدیؐ کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لئے جو مادی اور

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب۔ [۲] ابو داؤد کتاب الادب۔

جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں، اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرّا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادّی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادّی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلّق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا۔ چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلّق پیدا کیا جیسا کہ عیسائیوں میں ہے۔ دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا۔ اس لئے تعلّق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیبیاں انسانوں کی ماتائیں بنیں جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیّل ہے۔ خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے۔ اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پُر اثر منظر اور ناقابلِ شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں۔ اس لئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلّق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا۔ سداسہاگ فقراً اس تخیّل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنھوں نے خدا اور بندہ کے تعلّق کو جسمانی اور مادّی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ ان کے خواص تک کو گمراہ کر دیا جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سداسہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑیاں پہن لیں اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے۔ اسی لئے اسلام نے جو توحیدِ خالص کا مبلّغ تھا اِن جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لئے اِن الفاظ کا استعمال ضلالت و گمراہی قرار دیا۔ لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کا اور اس مجاز کے پردہ میں

جو حقیقت مستور ہے، اس کا انکار نہیں کرتا بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق اور مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۗ (البقرۃ: ۲۰۰)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لئے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط و استوار ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحم و محبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے۔ اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بول میں اُتری ہیں۔ انسانوں کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادّی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں۔ اس لئے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادّی اور غیر جسمانی تصور کسی مادّی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لئے ان کی لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادّی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزّہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو۔ انسان اَن دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کر سکتا ہے اور اس طرح اِن اَن دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اُتر جاتا ہے۔

اس اَن دیکھی ہستی" کی ذات و صفات کے متعلق جس کو خدا کہتے ہو، ہر مذہب میں ایک تخیل ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد و پیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے۔ لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی

آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزّہ کر دے جہاں تک بنی نوعِ انسان کے لئے ممکن ہے۔ خدا کے متعلّق باپ، ماں اور شوہر کا تخیّل اس درجہ مادّی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیّل کے معتقد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کی صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکے۔ اسی لئے نبوّتِ محمدیؐ نے ان مادّی تعلّقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہارِ ربط و تعلّق کے باب میں یکقلم ترک کر دیا بلکہ انکا استعمال بھی شرک قرار دیا۔ تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادّی بولی میں کرنا تھا اس لئے جسمانی و مادّی رشتہ کے بجائے جسکو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا، اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلّقات باہمی کے اظہار کے لئے اسلام نے مستعار لے لیا۔ اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر اس نے ربط و تعلّق کا اظہار کیا اور استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں ان سے انسانوں کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالقِ ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیّل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے۔ اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیشِ نظر رکھ کر استعمال کئے گئے تھے۔ ہر قوم نے اس علم اور نام کیلئے اُسی وصف کو پسند کیا ہے جو اسکے نزدیک اس خالقِ ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی۔

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علَم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے۔ اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے، اس میں اہلِ لغت کا یقیناً اختلاف ہے مگر ایک گروہِ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلَاہٌ سے نکلا اور وَلَہٌ کے اصل معنی عربی میں اس "غم" اور "محبت" اور "تعلّق خاطر" کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی سے بعد میں مطلق عشق و محبّت کے معنی پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے۔ اس لئے اللہ کے معنی "محبوب اور پیارے" کے ہیں جس کے

عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے۔ اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "من موہن" یعنی "دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رحمان اور رحیم ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی "رحم والا، مہربان، لطف و کرم والا" بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (محبوب، مہربان، رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انھی صفاتِ ربانی کے بار بار دُہرانے کی تاکید کی گئی ہے۔ ہر نماز میں کئی کئی دفعہ تکرار ہوتی ہے۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل ہو سکتی ہے؟

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ رحمٰن ہے۔ جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفتِ مبالغہ کا صیغہ ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ

اس کو "محبوب" (اللہ) کہو یا "مہربان" (رحمان) کہو۔ جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

(بنی اسرآئیل: ۱۱۰)

قرآن مجید نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ترپن موقعوں پر خدا کو اس رحمٰن کے نام سے یاد کیا ہے،

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمہاری نظر سے گذر چکا ہے ان معنوں میں اللہ تعالیٰ کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں۔ استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انھی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ

کا ایک نام یا ایک وصف اَلْوَدُوْدُ[1] آیا ہے جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر و محبّت اور عشق و پیار ہے۔ اس کے سوا خدا کا ایک اور نام اَلْوَلِیُّ ہے جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں۔ خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے اَلرَّؤُفُ ہے۔ رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے۔ رافت کے معنی اس محبّت اور تعلّق خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کا ایک اور نام حَنَّانٌ ہے جو حَنَّ سے مشتق ہے۔ حنّ اور حنین اس سوزِ دل اور محبّت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلّق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں۔ دیکھو وہ ان رشتوں کے نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں کے سبب سے محبّت اور پیار کے جو خاص جذبات پیدا ہوتے ہیں ان کو خدا کے لئے بے تکلّف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادّیت اور جسمانیت کا تخیّل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ غَفَّارٌ (بخشش والا) اور غَفُوْرٌ (بخشنے والا) ہے۔ یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ وہ سَلَامٌ (امن و سلامتی) ہے یعنی اپنے بے پناہ بندوں کے لئے وہ سرتاپا امن و سلامتی ہے۔ وہ مُؤْمِنٌ (امن دینے والا) ہے۔ وہ اَلْعَدْلُ یعنی سرتاپا انصاف ہے۔ وہ اَلْغَفُوْرُ (معاف کرنے والا) ہے۔ اَلْوَهَّابُ (عطا کرنے والا) ہے۔ اَلْحَلِیْمُ (بردبار) ہے۔ اَلصَّبُوْرُ (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) ہے۔ اَلتَّوَّابُ (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) ہے۔ اَلْبِرُّ (نیک اور مجسّم خیر) ہے۔ اور اَلْمُقْسِطُ (منصف اور عادل) ہے۔ ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیّل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

توراۃ کے اسفار، انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ۔ کیا اللہ تعالیٰ

---

[1] البروج : ۱۴۔

کے لئے ایسے پُر محبّت اور سراپا مہر و کرم سے لبریز اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالےٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطفِ احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے یکسر خالی ہے جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اسلام ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ شرک و کفر کی اس ضلالت و گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیّت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معنوں کو مادّی اور مجسّم یقین کر لیتے ہیں اور اس طرح وہ توحید کی بلند ترین سطح سے بہت نیچے گر کر سررشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم متکلّم ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ آپؐ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرّا ہو۔ روحانی حقایق کی تعبیر کے لئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا، یقیناً مادّی اور جسمانی استعارات و مجازات سے چارہ نہیں۔ تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھتی۔ چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات و مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبّت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبّت کی ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں۔ با ایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں۔ وہ خدا کو اب (باپ) کے بجائے رب کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

اَب اور رَب ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیّل اسلام کے مطمحِ نظر سے کس درجہ پست ہے۔ اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص

حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص، محدود اور آنی ہوتا ہے۔ بیٹے کے وجود، قیام و بقا، ضروریاتِ زندگی، سامانِ حیات، نشو و نما اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے باپ سے الگ، مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے۔ مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے؟ کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے؟ کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے؟

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک، پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے۔ جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہو سکتا۔ جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے۔ وہ گہوارۂ عدم سے لیکر قبائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے۔ انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا، قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت ہو یا مشتِ استخواں، شکمِ مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے۔ اور اس میں اُن ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

تعلیماتِ اسلامی میں محبتِ الٰہی کے مظاہر اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بہکے ہوئے انسان کو کس کس طرح دلا رہا ہے۔ اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے۔

ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِّ الٰہی ہے اور وہ یہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی۔ زبانِ الٰہی نے شہادت دی:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرۃ: ۱۶۵)

اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

اس نشۂ محبت پر باپ، مال، اولاد، بھائی، بیوی۔ جان، مال، خاندان سب کو قربان اور نثار ہو جانا چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَ
عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ
نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ
تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ
فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى
يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ

(التوبۃ: ۲۴)

اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، ان کو پکار کر سنا دیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ

مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دینِ (اسلام)

يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ

سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

(المآئدۃ: ۵۴)

حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا: "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں۔ تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا۔ اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

(اٰل عمرٰن: ۳۱)

محبت کیونکر حاصل ہو، وحیٔ محمدیؐ نے اس رتبۂ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی، فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے رحمت والا خدا ان کے لئے محبت پیدا کرے گا۔

(مریم: ۹۶)

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں۔ ایمان اور عملِ صالح یعنی نیک کام

چنانچہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○	خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
(المائدہ : ۱۳)	
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
(البقرۃ : ۲۲۲)	
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ○	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
(آل عمران : ۱۵۹)	
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔
(المائدۃ : ۴۲ ، الحجرات : ۹)	
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ○	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔
(التوبہ : ۴، ۷)	
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ	خدا اُن کو پیار کرتا ہے جو اُس کے راستے میں لڑتے ہیں۔
(الصف : ۴)	
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ○	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
(آل عمران : ۱۴۶)	
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّہِّرِیْنَ ○	اور خدا پاک وصاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔
(التوبۃ : ۱۰۸)	

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تین

قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا۔ محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوصِ نیّت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لئے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لئے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبّت سے محروم یہ تین ہیں۔ اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔[1]

دنیا کے عیش و مسرّت میں اگر کوئی خیال کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدّر اور منغّص بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کا جہنّم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں۔ لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہوگا:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ	ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○	اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(یونس : ۶۲)

محبّت کا وہ درجہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے اس کا نام "رحم" اور "رحمت" ہے۔ سلام کا خدا تمام تر رحم ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرّہ ذرّہ سیراب ہے اس کا نام رحمٰن و رحیم ہے۔ جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے۔ وہ نہیں تو کچھ نہیں۔ اس لئے اس کی رحمت سے نا اُمیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گنہگار

---

[1] احمد بن حنبل مسند ابوذر جلد پنجم۔

سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتا ہے۔ گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے "میرے بندو!" کہہ کر ان کے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے۔ بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

(الزمر: ۵۳)

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ○

تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔

(الحجر: ۵۵)

خلیل اللہ اس زمرے سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبۂ خلت، محبت سے مافوق ہے اس لئے جواب دیا:

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ○

اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون ناامید ہوتا ہے۔

(الحجر: ۵۶)

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے، رحمان و رحیم بھی ہے اور عفو و رؤف بھی ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ — اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ (الانعام: ۵۴)

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلّی کا یہ پیام دو کہ ہمارا بابِ رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے:

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (الانعام: ۵۴)

اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان سے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے براہِ نادانی برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بیشک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرّہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ط — اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔ (الاعراف: ۱۵۶)

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو از خود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی۔ جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا: "اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا

کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنّت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنّت سے مایوس نہ ہوتا۔" یہ اسلام کے تخیّل کی صحیح تعبیر ہے۔ بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں۔ مجھے پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کر دوں خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں۔ مجھے پرواہ نہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطحِ زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطحِ زمین بھر مغفرت لے کر آؤں۔[۱]" کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبّت اور اس عفوِ عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سُنی ہے؟

حضرت ابو ایوب رضؓ صحابی کی وفات کا وقت جب آیا تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی۔ اور وہ اس کو بخشتا۔[۲] یعنی اللہ تعالےٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر محبّت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبّت ہے نیز جس کی بنا پر دنیا میں عیش و محبّت کے شاندار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہدِ حقیقی کے سرمایۂ محبّت کا کون سا حصّہ ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت کے سو حصّے کئے۔ ان میں سے ایک حصّہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں۔ باقی ننانوے حصّے

---

[۱] جامع ترمذی (ابواب الدعوات) و دیگر کتب احادیث (صحیح)۔ [۲] مسند امام ابن حنبل جلد پنجم۔

خدا کے پاس ہیں۔[۱] اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے۔ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شرابخوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش ہوا۔ صحابہؓ نے تنگ آکر کہا "خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے"۔ رحمۃ للعالمینؐ کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی۔ فرمایا "اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے"۔[۲] تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لئے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے!

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے، کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور ان کو ذاتِ الٰہی کے ساتھ وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا۔ بلالؓ کو دیکھو۔ ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر ان کو لٹایا جاتا ہے۔ ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لئے ان کو مجبور کیا جاتا ہے۔ وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں مگر زبان سے وہی احد احد (ایک ایک) کا ترانہ[۳] نکلتا ہے۔ مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے۔ ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحن مکہ میں جوشِ وحدت پرستی سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا بآوازِ بلند اعلان کرتے ہیں۔ ہر طرف سے پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے۔ بعض لوگ آکر چھڑا دیتے ہیں۔ لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر محبتِ الٰہی کے کیفیت و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔[۴]

ایک صحابیؓ جو رات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لئے متعین تھے، وہ اپنی نیند ٹالنے کے لئے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں۔ دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں

---

[۱] بخاری کتاب الادب۔ [۲] بخاری کتاب الحدود مایکرہ من لعن شارب الخمر [۳] سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین واسد الغابہ جلد اوّل۔ [۴] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاریؓ۔

پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور نماز میں محو رہتے ہیں۔ ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی؟ کہتے ہیں کہ "جو سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کئے بغیر چھوڑ دوں"[1]۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دو جانشین عین حالتِ نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں مگر مقتدیوں کی صف اس حیّ و باقی کے سامنے کھڑے ہو کر ہر فانی و میّت ہستی کی محبّت سے بے نیاز رہتی ہے اسی لئے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا اُن کا محبوب ہے یعنی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی۔ اس کا جنازہ اٹھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا اُس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے کیونکہ اس کو اللہ اور اُس کے رسول سے محبّت تھی"۔ قبر کھودی جانے لگی تو فرمایا "اس کی قبر کُشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اس کے ساتھ کُشادگی فرمائی ہے"۔ اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہؓ نے پوچھا "یا رسول اللہؐ آپؐ کو اس مرنے والے کے موت کا غم ہے؟" فرمایا "ہاں! کیونکہ اس کو خدا اور رسول پیارے[2] تھے"۔ ایک دفعہ آپؐ نے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا۔ وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر سورۃ کے آخر میں قل ھو اللہ اَحَدٌ ضرور پڑھتے۔ جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمتِ اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا "ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟" لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ "یہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورۃ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبّت ہے"۔ فرمایا کہ "ان کو بشارت دو کہ وہ رحم کرنے والا خدا بھی ان سے محبّت کرتا ہے"[3]۔ یہ بشارت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ

---

[1] صحیح بخاری و سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم۔ [2] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء حضر القبر [3] مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرہا، باب فضل قرأۃ، قل ہو اللہ احد، یہ واقعہ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بین السورتین میں دوسری طرح مروی ہے، اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔

مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے؟"

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے خدمتِ والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ "یا رسول اللہؐ! قیامت کب آئے گی؟" فرمایا "تم نے اس کے لئے کیا سامان کر رکھا ہے؟" انھوں نے نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی "یا رسول اللہؐ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے، نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا۔ جو کچھ سرمایہ ہے وہ صرف خدا اور رسول کی محبت ہے اور بس!" فرمایا "تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا۔" صحابہؓ نے اس بشارت کو سُن کر اُس دن بڑی خوشی منائی۔ [۱]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتۂ خاص جبریلؑ سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں۔ تم بھی اس کو پیار کرو۔ تو جبریلؑ بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حُسنِ قبول بخشا جاتا ہے۔" [۲]

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے۔ اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔" [۳] یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانۂ محمدیؐ کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاءؑ اور شہدا بھی

---

[۱] مسلم کتاب الادب باب المرء مع من احب۔ [۲] صحیح بخاری کتاب الادب باب ماجاء فی قول الرجل ویلک۔ [۳] مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبدا حببہ لعبادہ۔ [۴] بخاری کتاب الرقاق باب التواضع۔

رشک کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے وہ اچھی باتیں بتاتے اور بُری باتوں سے روکتے ہیں۔"[۵۱] الخ یہ قابلِ رشک رتبہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا ہے؟۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبّت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبّت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبّت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبّت میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔"[۵۲]

یہ محبتِ الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ پر نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اسی کی محبّت کے سبب سے مجھ سے محبّت کرو۔ اور میری محبّت کے سبب سے میرے اہلِ بیت سے محبّت کرو۔"[۵۳] یہ عشق و محبّت کی دعوت محبوبِ ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلامؐ کا لقب "حبیب خدا ہے"۔ دیکھو کہ حبیب اور محبوب میں خلّت و محبّت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں۔ آپؐ خشوع و خضوع کی دعاؤں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے؟ کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے؟ امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدّد صحابیوںؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی دعاؤں میں محبتِ الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے۔ انسان کو اس دنیا میں سب سے

---

[۵۱] اس کی ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں۔ دیکھو مشکوٰۃ کتاب الآداب فی حب اللہ فصل ثانی۔ [۵۲] کتاب الآداب فی حب اللہ فصل ثانی۔ [۵۳] مشکوٰۃ مناقب اہلِ بیت بروایت ترمذی۔

زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان ہے۔ لیکن محبوبِ خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں۔ دُعا فرماتے تھے "خداوندا!

اسئل حبك وحب من يحبك وحب عمل يقرب الى حبك (مسند احمد، سنن ترمذی، مستدرك حاكم)	میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہو اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کر دے۔
اللّٰهم اجعل حبك احب الى من نفسى و اهلى ومن الماء البارد. (سنن ترمذی، مستدرك حاكم)	الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل وعیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے۔ لیکن حضورؐ کی پیاس اس مادّی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی۔ وہ صرف محبتِ الٰہی کا زُلالِ خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا۔ عام انسان روٹی سے جیتے ہیں۔ مگر ایک عاشقِ الٰہی (مسیح علیہ السلام) کا قول ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا"۔ پھر وہ کون روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا؟ حضورؐ دُعا فرماتے ہیں:

اللّٰهم ارزقنى حبك وحب من ينفعنى فى حبك. (سنن ترمذی)	خداوندا! تو اپنی محبت اور اُس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہو مجھے روزی کر۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے مگر جانتے ہو کہ اس راہ میں آخری منزل کیا ہے؟ صحیحین

میں ہے:

من کان اللہ ورسولہ احب الیہ ممّا سواھما[1]	یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اُس سے اسی طرح محبّت کریں جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہیں۔ اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے، ممنوع قرار دیا ہے اس لئے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محبّتِ الٰہی کے مقدّس جذبات سے خالی ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ یہ دعویٰ سرتاپا بے بنیاد ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیمِ محمدیؐ کی بلندیٔ نظر اور محبّت کا علوئے معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں۔ ثبوت میں قرآن کی یہ آیت پاک بھی پہلے پیش کی جا چکی ہے:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (البقرۃ: ۲۰۰)	تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔

لیکن احادیث سے ہمارا دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ لڑائی کا میدان ہے۔ دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے۔ جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آ رہا ہے اپنی جان بچا رہا ہے۔ بھائی بھائی سے، ماں بچّہ سے، بچّہ ماں سے الگ ہے۔ اسی حال میں ایک عورت آتی ہے جس کا بچّہ اس میدانِ حشر میں گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچّہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے اس کو اپنے بچّہ کے جوشِ محبّت میں چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دودھ پلا دیتی ہے۔ دفعتہً رحمۃ للعالمینؐ کی نظر پڑتی ہے اور آپؐ

---

[1] مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بھن وجد حلاوۃ الایمان۔ بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔

صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچّہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟" لوگ عرض کرتے ہیں "ہرگز نہیں"۔ آپؐ فرماتے ہیں "تو جتنی محبّت ماں کو اپنے بچّہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبّت ہے"۔[۵۱]

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپؐ واپس تشریف لا رہے تھے۔ ایک عورت اپنے بچّہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے "یارسول اللہؐ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟" فرمایا "ہاں، بیشک اس سے زیادہ ہے" تو بولی کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی"۔ یہ سُن کر فرطِ اثر سے آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا۔ پھر سر اٹھا کر فرمایا "خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے"۔[۵۲]

آپؐ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں۔ ایک صحابیؓ ایک پرند کو مع اس کے بچّوں کے چادر میں باندھ کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یارسول اللہؐ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچّوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا۔ ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آ کر بچّوں پر گر پڑی"۔ ارشاد ہوا "کیا بچّوں کے ساتھ ماں کی اس محبّت پر تم کو تعجّب ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا جو محبّت اس ماں کو اپنے بچّوں کے ساتھ ہے۔ خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے"۔[۵۳]

ایک صاحب ایک چھوٹے بچّہ کو لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں۔ محبّت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے۔ آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچّہ سے محبّت ہے؟ انھوں نے کہا "ہاں!" فرمایا "تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبّت ہے جتنی تم کو اس بچّہ سے ہے۔ وہ

---

[۵۱] صحیح بخاری کتاب الادب، باب رحمۃ الولد۔ [۵۲] سنن نسائی، باب ما یرجی من الرحمۃ۔ [۵۳] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسماء باب رحمۃ اللہ وغضبہ۔

تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔"[1]

جمالِ حق کا پہلا مشتاق اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے۔ مرض کی شدّت ہے بدن بخار سے تپ رہا ہے۔ اٹھ کر چل نہیں سکتا۔ لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلانِ خاص کی طاقت پاتا ہے۔ مسجد نبوی میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں۔ سب کی نظریں حضورؐ کی طرف لگی ہیں۔ نبوّت کا آخری پیغام سُننے کی آرزو ہے۔ دفعتاً لبِ مبارک ہلتے ہیں اور یہ آواز آتی ہے "لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے۔ مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے جیسے ابراہیمؑ کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا۔"[2] یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا۔ عین حالتِ نزع میں زبانِ مبارک پر یہ کلمہ تھا۔ "خداوندا بہترین رفیق۔"

اللہ تعالےٰ کی کریمی اور حیی اُس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گنہگار بندوں پر اس کی شانِ بخشش کا ترانہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے کانوں سے سُنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر اُن کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمتہ للعالمینؐ نے یہ پیامِ ربّانی ہم کو سُنایا:

"میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی تو مجھ سے راستہ پوچھو۔ میں بتاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا لیکن جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو۔ میں تم کو کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا لیکن جس کو میں نے پلایا تو مجھ سے پانی مانگو۔ میں تم کو پلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو۔ میں تم کو پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال۔ [2] صحیح مسلم کتاب المساجد۔

تم مجھ سے معافی مانگو تم کو معاف کروں گا۔ اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں ہے اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن اور انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرّہ اضافہ نہ ہوگا۔ اور میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے گنہگاروں کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ذرّہ برابر کمی نہ ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈبو کر نکال لی جائے۔ اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔[۱]

محبّت کا یہ پُرکیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ صلے علیہ وسلم ہی کی زبانِ مبارک سے سُنا۔ تسلّی و تشفّی کا یہ روح افزا پیام آپؐ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا۔ عفو و کرم کے بحرِ بیکراں کا یہ ساحلِ اُمّید آپؐ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا اور گنہگاروں کو "میرے بندو!" کہہ کر پکارے جانے کی عزّت آپؐ ہی کے وسیلہ سے میسّر آئی۔

---

[۱] صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل جلد پنجم ادب المفرد امام بخاری باب الظلم۔ میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیئے ہیں۔ اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں (دیکھو متی ۲۵۔ ۲۵ تا ۴۵) مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیئے۔

فرشتوں پر ایمان

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے۔ اس کا واحد مَلَکٌ، مِلاَک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے۔ اس کے لغوی معنی "قاصد" اور "رسول" کے ہیں۔ اسی لئے قرآن پاک میں ملائکہ کے لئے رُسُلٌ کا لفظ بھی آیا ہے۔ جس کے معنی قاصد اور "پیام رساں" کے ہیں۔ ان سے مراد وہ غیر مادّی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں۔ اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کا انجن اور اُس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں جو خدا کے مقرّرہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں اور چلا رہے ہیں یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے۔ اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں۔ اُن کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ اُن کا کوئی ذاتی ارادہ ہے۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ گویا ان کی خلقت صرف

طاعت اور فرمانبرداری کے لئے کی گئی ہے۔ دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور خدا انبیاؑ پر اپنے جو احکام اُتارتا یا ان سے کلام کرتا ہے وہ انہی کی وساطت سے کرتا ہے۔

ملائکہ کا تخیل مذاہبِ قدیمہ میں دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ صابئی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں۔ یونانی، مصری (اسکندری) فلسفہ میں اُن کا نام "عقولِ عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں کے اندر بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کیے گئے ہیں۔ بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواحِ مجرّدہ کا پتہ لگتا ہے جن میں سب سے اہم لوگس کا تخیّل ہے جس سے مقصود وہ اوّلین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہلِ فلسفہ عقلِ اوّل سے تعبیر کرتے ہیں۔ پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام امشاسپند ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دے گئی ہے۔ یہودی ان کو "کروبیم" کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریلؑ اور میکائیلؑ وغیرہ رکھتے ہیں۔ عیسائی بھی ان کو انہی ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریلؑ و روح القدس وغیرہ الفاظ سے بعض کی تعبیر کرتے ہیں۔ ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیبیوں کے نام سے روشناس ہیں۔ جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے۔ بہرحال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں جو صانع و مصنوعات اور خالق و مخلوقات کے درمیان اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادّی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی۔ وہ کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں اور کبھی خدائی کے مرتبے تک بھی بلند کردی جاتی تھیں۔ ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیبیوں کی یہی کیفیت تھی۔ پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی رہتی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں۔ اور کبھی خود خدا اُن میں سے ایک ہوجاتا تھا۔ ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں۔ ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشاسپند چھ تھے اور اُن کے تحت میں تینتیس پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے۔ اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے اس لئے دونوں کے ماتحت اچھے اور بُرے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی۔ نیکی کے فرشتے براہِ راست نیکی کی چیزوں کو اور بُرائی کے فرشتے مصیبتوں اور ہلاکتوں اور بُرائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے ان اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے تھے۔ دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پرے لے کر باہم نبرد آزما رہتے تھے۔ یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی جو اس کی بیوی تھی۔ ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیبیوں کا تصور تھا۔ مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیتِ خاص نہ تھی۔ بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہوسکتا تھا۔ یہودیوں میں فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیس اور ثناؤ صفت خدا سے مشتبہ ہوجاتی تھی۔ نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی۔ اس کے آگے جُھکا جاتا تھا اور اس کو خداوند! کہہ کر اس طرح خطاب کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ شبہہ ہوجاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ[1]۔ وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے[2]۔

---

[1] تکوین ۱۶-۱۳ و ۱۸-۲، ۳، ۲۲۔ [2] تکوین ۶-۲۔

عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صابیوں میں ملائکہ کا تصور صابیوں میں فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی اُن کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور ان کو مظہرِ خدا تسلیم کیا جاتا تھا۔ عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے۔ وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ ان کی پرستش ہوتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے۔ یونانیوں میں عقلِ اوّل اور عقولِ عشرہ تمام عالم کی خالق، کارفرما اور مرجعِ کُل مانی گئیں اور خدا کو معطّل ٹھہرایا گیا۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت اسلام نے آکر ان تمام عقائد کو مٹا دیا۔ خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے فرشتے محروم بتلائے گئے۔ ان کی پرستش ناجائز کی گئی۔ نر و مادہ کی مادی جنسیت سے وہ پاک کیے گئے اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا۔ ان کی تعداد و شمار اور درجہ بندی کا کوئی تخیّل باقی نہیں رکھا گیا۔ اُن کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا کام شب و روز صرف آقا کا حکم بجا لانا ہے۔ عالم میں اُن کا کسی قسم کا تصرّف نہیں مانا گیا اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں۔ نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیئے گئے۔ قرآن میں ان کی ہستی صرف اس قدر تسلیم کی گئی ہے کہ وہ غیر مادّی ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثنا اور اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں۔ خدا کے حکم کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہے ہیں۔ لیکن اس چلانے میں خود اُن کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن پاک نے یہودیوں کی طرح ان کو

خداوند کا خطاب نہیں دیا۔ نہ پارسیوں کی طرح ان کو قابلِ پرستش کے لقب سے یاد کیا۔ نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا' دیبی کہا۔ بلکہ صرف "ملک" اور "رسول" کے الفاظ استعمال کیئے جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں۔ بلکہ قرآن نے آغازِ خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم اُن کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ ملائکہ کا مسجود بنے۔ چنانچہ اِس کو مرتبۂ علم میں اُن سے بالاتر ٹھہرایا گیا اور خدا کی جس تسبیح اور تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا اس کے باوجود جب انسان کا جوہرِ طبیعت انہوں نے پہچانا تو ان کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا	تو پاک ہے۔ ہم کو کوئی علم نہیں
عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ	لیکن جو تو نے ہم کو سکھایا بے شک
الْحَكِيْمُ ۝	تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

(البقرۃ: ۳۲)

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرفِ مطلق قرار دیا تھا اسلام میں اُن کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے۔ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کی مخلوق اور بندے اور یکساں عاجز درماندہ ہیں۔ انسانوں کو مادّی اشیاء پر حکومت بخشی گئی ہے کہ اپنے نفع و نقصان کے لئے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعیّن فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اور پوری مملکتِ الٰہی میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ رکھا ہے جو ہر جگہ کارفرما

نظر آتا ہے۔ لوگ انہی ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے۔ اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر اُن کا دل جھک جاتا ہے کیونکہ وہ بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمران ہے۔ یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھکتے ہیں۔ اسلام کے نظریۂ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کُل کے کُل اُسی ایک ربّ العٰلمین اور فرمانروائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں۔ اُسی کے آگے جھکنا چاہیئے اور اُسی کی بندگی کرنی چاہیئے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب اُن نصوص سے مل سکتا ہے جو اُن کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادّی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکامِ خداوندی اور پیغامِ الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور وہ اسباب و علل جن کو مادہ پرست ذاتی طور سے مؤثر جانتے اور جن کو بت پرست دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں ان کو فرشتے احکامِ الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

اس عقیدہ کی عقلی حیثیت عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں جن کی تصدیق

یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ اس لئے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جراءت نہیں کر سکتا کہ یہ خلافِ عقل ہے بلکہ جس طرح قیاسیات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے ویسا ہی یہاں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور اُن کے اسباب و علل کا مسئلہ عقلا میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معمّا آج بھی اُسی طرح لاینحل ہے جس طرح پہلے تھا۔ اس کا حل سائنس کی مادّی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سُلجھانے سے عاجز ہے۔ اس لئے اگر حکمائے ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت اربابِ مذاہب نے نکالی ہے تو وہ محلِ اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ خلافِ عقل کہی جا سکتی ہے۔ کائنات کے حوادث میں جس طرح مادّی علل و اسباب کارفرما ہیں اُسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل و اسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں اور ان دونوں قسم کے اسباب کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب و ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام بخت و اتّفاق رکھتا ہے۔ حالانکہ مسئلہ علل و اسباب کو مان لینے کے بعد بخت و اتّفاق کوئی چیز نہیں رہ جاتا یہی روحانی علل و اسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں۔ ہمارے اور دوسرے متکلّمین اور حکما کے اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب و علل کے "قوائے طبعی" سے کرتے ہیں اور ہم قوائے روحانی سے۔

اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص و طبائع اور اس مادّہ کی ملکیت

ہیں مقرّرہ طبعی اصول و قوانین موجود نہیں ہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص و طبائع اور اصول و قوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو ان ہی اصول و طبائع مقرّرہ کے مطابق چلاتے رہیں۔

سمجھنے کے لئے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے۔ مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح۔ ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال و حرکات اس کی روح کی ارادی قوّت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ و ریشہ پر حکمران اور مسلّط ہے۔ باایں ہمہ وہ روح اصول مقرّرہ کے تحت ہی اعضا سے کام لیتی ہے اور اُن اصُول سے باہر نہیں جاتی۔ اسی طرح غیر ذی روح اشیا میں ابر و باد سے لے کر دریا، پہاڑ، چاند اور سورج تک پر ارواح مقرّر ہیں جو ان اشیا سے خدا کے اصولِ مقرّرہ کے مطابق یکساں افعال و حرکات کا صدور کراتی ہیں جس طرح ہماری روح اپنے اعضا اور اعضا کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ اشیاء کے مقررہ خواص و طبائع کے سہارے پر کرتی ہے۔ اسی طرح ملائکہ بھی انہی مقرّرہ خواص و طبائع کے ذریعہ اپنے مفروضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح و نفوس واسطہ ہیں اسی طرح تمام عالم مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوسِ مجرّدہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومتِ علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا اُسی طرح اِن ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت

میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا۔ یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں مگر ہمارے اور عالمِ کائنات کے جو نوعی افعال ہیں ان میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی، ہمرنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان نے ارادہ پاکر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعالِ اختیاری کی ذمہ داری، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیاں کرکے عتاب کا مستحق ہوجاتا ہے۔ مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواحِ مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمامتر محروم ہوکر صرف اطاعت، فرمانبرداری اور انقیاد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس لئے ان میں عصیان، تمرّد، سرکشی اور حکمِ الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال و حرکات اور خصائص میں یکسانی، ہمرنگی، اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورتوں میں ہمارے لئے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

آیات و احادیث میں ملائکہ کا ذکر

۱۔ اب ہم کو تعلیمات نبویؐ یعنی آیات و احادیث سے ملائکہ کی حیثیت کو روشن کرنا چاہیئے۔ ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور اس کام میں اُن کا بے اختیار ہونا ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ	خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں
رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب
سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ	کرتا ہے، بے شک خدا سننے والا

اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○	اور دیکھنے والا ہے ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔
(الحج : ۷۵-۷۶)	

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا اُن کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور اور انتظامات کا مرجعِ کُل ہے۔ دوسری جگہ ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا یُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○	حمد ہو اُس خدا کی جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو دو دو تین تین چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے۔ وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ لوگوں کے لئے جو رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہی غالب دانا ہے۔
(فاطر: ۱-۲)	

ملائکہ کے فرائض اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا

اور بند کرنے والا صرف خدا ہے۔ یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے یا اُن میں اُلوہیت یا ربوبیت کا کوئی شائبہ ہے یا وہ پرستش کے قابل ہیں یا اُن کی دہائی بھی پکارنی چاہیے۔

۲۔ ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ (الانفال : ۱۲)	(یاد کر) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔
تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۙ (القدر : ۴)	اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں۔

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں اُسی طرح دربارِ الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ (المعارج : ۴)	فرشتے اور روح اُس تک چڑھتے ہیں۔

موت کے وقت روح کا قبض کرنا انہی سے متعلق ہے:

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ	کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے وہ تم پر موت طاری

(السجدۃ : ۱۱)

کرے گا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ

اور اگر دیکھو تم جب گنہگار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلاتے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔

(الانعام : ۹۳)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ

اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔

(الانفال : ۵۰)

اسی کے ہم معنی اور بھی کئی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حکمِ الٰہی کے مطابق موت وفنا کی تدبیر علل واسباب کی انہی روحانی قوتوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لئے کسی ایک علت وسبب کا وجود کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اُس کے متعلقہ علل واسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں۔ یہ متعلقہ علل واسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے جو بحکمِ الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے۔[1] اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (وہ کام کی تدبیر کرتا ہے) اور کبھی ملائکہ کی طرف:

---

[1] صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکۃ میں ہے کہ رحمِ نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝ وَّ
النّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝ وَّالسّٰبِحٰتِ
سَبْحًا ۝ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝

النازعات ۱-۵

ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے۔ (رگوں کی) گرہوں کے کھولنے والوں کی قسم ہے۔ (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی پھر دوڑ کر (مادی) اسباب وعلل پر سے، آگے بڑھ جانے والوں کی، پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی قسم ہے۔

۳۔ یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان بھی سفیر ہیں:

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ
مَا يَشَآءُ ؕ

(الشوریٰ: ۵۱)

یا خدا (آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ) اپنا ایک ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے وہی کرتا ہے

دوسری جگہ ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ
مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖٓ

النحل

خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔

خاص آنحضرتؐ کے متعلق ہے:

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ
بِاِذْنِ اللّٰهِ

بس اس (جبریلؑ فرشتہ) نے قرآن کو خدا کے حکم سے تمہارے

(البقرہ : ۹۷)　　دل پر اتارا۔

۴۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں :

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى　　ہمارے سفیر ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر اترے۔

(ھود : ۶۹)

اسی طرح حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السّلام کو انہوں نے بشارت دی :

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ○　　میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔

(مریم : ۱۹)

حضرت لوط علیہ السّلام کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لئے آئے اور

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ　　کہا اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے

ھود. ۸۱　　بھیجے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السّلام کی قوم پر کوہِ آتش فشاں کا مُنہ کھول دیتے ہیں اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے۔ یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا مگر اللہ تعالےٰ نے اس کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا :

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ○　　تو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے کر دیا (یعنی زمین اُلٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی

(ھود : ۸۲) بارش کی۔

۵۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں اور اُن کے ثواب و گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝

(الانفطار: ۱۰-۱۲)

بے شک تم پر نگہبان ہیں جو بزرگ ہیں، لکھنے والے ہیں، جو تم کچھ کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝

(ق : ۱۸)

کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ

(الرعد : ۱۰-۱۱)

تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے، خدا کے تعاقب کرنے والے اُس کے سامنے سے اور اُس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اُس کی نگرانی کرتے ہیں۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا

اور وہ (خدا) تم پر نگراں بھیجتا ہے یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس

يُفَرِّطُونَ ○ (الانعام : ۶۱)

کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے۔

۶۔ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق اُن پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں:

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ط هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ○ (الانبیآء ، ۱۰۳)

نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے اُن کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ○ نَحْنُ أَوْلِيَآؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ج (حٰمٓ السجدۃ : ۳۰-۳۱)

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اُس دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهُ (الاحزاب : ۴۳)

وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ط (الاحزاب : ۵۶)

اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ط

(الشوریٰ : ٥)

اور جو زمین میں ہیں اُن کے لئے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں :

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۙ○

(اٰل عمران : ٨٧)

ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۙ○

(البقرۃ : ١٦١)

جو کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

٧۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا :

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ط حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ

(الزمر : ٧١)

اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائے جائینگے، یہانتک کہ جب اُس کے پاس پہنچیں گے تو اُس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اُس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں کے پیغمبر نہیں آئے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ط حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○

(الزمر: ۷۳)

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے، وہ گروہ در گروہ جنّت میں لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اُس کے پاس پہنچیں گے اور اُس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اُس کے پاسبان کہیں گے تم پر سلامتی ہو، خوش خوش جنّت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ○ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ○

(الرعد: ۲۳ — ۲۴)

اور ان (جنّتیوں) پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو یہ تمہارے صبر کا بدلہ ہے۔ یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ

(التحریم: ۶)

اس (دوزخ) پر سخت دل طاقت ور فرشتے مقرّر ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ص

(المدثر: ۳۱)

اور ہم نے دوزخ کا اہلکار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کے حاضر باش ہیں:

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ج

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے ارد گرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں

(الزمر : ۷۵)

مصروف ہوں گے۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى

اعلیٰ اہلِ دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سُن سکتے۔

(الصّٰفّٰت : ۸)

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○

مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔

(ص: ۶۹)

قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے جو ہر وقت اُس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیئے تیار رہیں گے:

وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ○

اور فرشتے اس کے کنارے پر ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔

(الحاقۃ : ۱۷)

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ○ وَّجَاۗءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ○

ہرگز نہیں۔ جب زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔

(الفجر : ۲۱-۲۲)

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ صَفًّا ۭ

جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔

(النبأ : ۳۸)

۹۔ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس

اور حمد وثنا میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے جلال و حیرت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور اُس کے حضور میں اہلِ زمین کے لئے عموماً اور نیکوکاروں کے لئے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الشوریٰ : ۵)	اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشایش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ فرشتوں کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے۔ اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دستِ اختیار میں ہے:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ (المؤمن : ۷)	جو فرشتے، عرش کو اٹھائے ہیں اور اس کے پاس ہیں وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشائش کی دعا کرتے ہیں۔
وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝	آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی ہے اسی کا ہے اور جو اُس کے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اُس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ○

(الانبیآء : ۱۹ - ۲۰)

سے غرور نہیں کرتے اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں، وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سست نہیں پڑتے۔

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ○ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ○ ---------- وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ○

(الانبیآء : ۲۶ - ۲۸)

بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں..... .....اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○

(التحریم : ۶)

خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ

(الرعد : ۱۳)

اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو چارپائے اور فرشتے ہیں وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ اپنے مالک سے جو اُن کے اوپر ہے، ڈرتے رہتے

مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ (النحل : ۴۹ - ۵۰)

فلسفۂ و مذاہب کی ملائکہ کے متعلق بے اعتدالی گزر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے۔ لیکن اُن کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحیدِ کامل کے منافی تھیں۔ اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفہ کے رُو سے عقلِ اوّل کی اضطراری پیدائش کے بعد خدا کو معطّل ہو جانا پڑا اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا۔ عراق کے صابئی اجرامِ سماوی کی شکل میں اُن کی پرستش کرتے تھے اور اُن ہی کو عالم کا فرمانروا مانتے تھے۔ یہود بھی ان کو کسی قدر صاحبِ اختیار تصوّر کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے جیسا کہ توراۃ و صحیفہ تکوین (۱۶ - ۱۳ و ۱۸ - ۲، ۳، ۲۲) کے قصّوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ان کو وہ "خدا کے بیٹوں" کے "خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے (تکوین ۶ - ۲)۔ ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیبی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوّث تھے اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے "چھوٹے خداؤں کے" مرتبہ پر بھی فائز تھے۔ عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جزو تسلیم کرتے تھے اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا۔ عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے وہ ان کی پوجا کرتے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے۔

تعلیمِ محمدیؐ نے ان تمام عقائدِ باطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے اُن میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق

ہیں۔ ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ وہ صرف خدا کی اطاعت، عبادت اور اس کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں۔ اُن میں سے جس کے جو کام سپرد ہے وہ اُسی کو انجام دیتا ہے۔ وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں۔ وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں، نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ یہودی اُن کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ قرآن نے دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں۔ وہ نہ مرد ہیں نہ عورت ہیں۔ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي

مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں۔ جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ خدا اُس سے جو اُن کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے۔ وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اسی کی جس کے لئے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو

الظّٰلِمِیْنَ ○

(الانبیآء : ۲۶ – ۲۹)

اس کو بھی اسی طرح ہم جہنّم کی سزا دیں گے۔ ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ م لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ○ لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا ○

خدا تو ایک ہی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو۔ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اور خدا کا وکیل ہونا کافی ہے۔ مسیحؑ کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ مقرّب فرشتوں کو (اس سے عار ہے) اور جو لوگ اُس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو وہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

(النسآء : ۱۷۱–۱۷۲)

وَلَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا ط اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○

خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔

(اٰل عمرٰن : ۸۰)

وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ

اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ مشرکین

كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ○

تمہیں کو پوجتے تھے؟ وہ کہیں گے پاک ہے تو۔ تو ہمارا والی ہے۔ وہ وہ نہیں ہیں بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے۔ وہ اکثر ان ہی جنوں پر ایمان لائے ہیں۔

(سبا : ۴۰-۴۱)

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ○

جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے تو کچھ بول نہ سکیں گے لیکن وہ جس کو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔

(النبا : ۳۸)

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ○

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو چاہے اجازت دے اور پسند کرے۔

(النجم : ۲۶)

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۭ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ○

کیا تمہارے لئے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لئے پسند کیں۔ تم یقیناً

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ
لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ
اِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ
اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا
اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝
سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ
السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ
وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ

(بنی اسرآئیل : ۴۰-۴۴)

بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو۔ اور
ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کو
باتیں بیان کی ہیں لیکن یہ ان کی نفرت
کو اور بڑھاتا ہے۔ کہدو اے پیغمبر کہ اگر اس
ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند
خدا ہوتے تو اس تخت والے خدا کی
طرف راستہ ڈھونڈھتے اکہ اس کے ہاتھ
سے حکومت چھین کر خود قبضہ کرلیں! یہ
مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر
ہے۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ
ان میں ہے وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ
عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا
خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ
وَيُسْـَٔلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ
الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا
لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ
هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝

(الزخرف : ۱۹-۲۰)

اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت
والے خدا کے بندے ہیں عورتیں بنا دیا۔
کیا وہ اُن کی پیدائش کے وقت حاضر
تھے؟ ہم اُن کی گواہی لکھیں گے اور اُن
سے اِس کی باز پُرس کی جائے گی۔ اور
انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم اُن
(فرشتوں) کو نہ پوجتے۔ انہیں اس کا (تحقیقی)
علم نہیں وہ صرف اٹکل لگاتے ہیں۔

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے لئے دعوت کا سامان کیا" اور انہوں نے کھایا۔" (تکوین ۱۸ - ۸) لیکن قرآن پاک نے اس قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی ہے کہ فرشتے انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا مگر

فَلَمَّا رَآٓ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ○

(ھود: ۷۰)

جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے اور وہ دل میں ڈرا۔ انہوں نے کہا ڈرو نہیں ہم لوطؑ کی قوم کی طرف ان کے تباہ کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

کفارِ قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ○

(الانعام: ۹)

اور اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو آدمیوں کے لئے اسکو آدمی ہی بناتے اور جس شبہ میں اب ہم نے اُن کو ڈالا ہے اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے (یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو بلکہ آدمی ہو)

اس آیت اور دوسری آیتوں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے۔ تاہم فرشتے کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام وغیرہ کے قصوں میں ہے:

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○ (مریم: ۱۷)

وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتوں کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لئے دعوت کا سامان کیا۔ مگر یہ دھوکا جلد رفع ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں ان سے دو باتیں مقصود ہیں:۔

(۱)۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بُت پرست اقوام اور دوسرے اہلِ مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے۔ جب تک اس کی تصریح نہ ہوتی کلمہ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

(۲) دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادّہ کے خواص وطبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جو اِن مادّی خواص وطبائع کی بالذّات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے۔ کیونکہ یہی پتھر اُن کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک اُن کو لے جاتا ہے۔

درحقیقت ان مادّی خواص وطبائع پر روحانی اسباب مسلّط ہیں جو خدا کے حکم سے اُس کے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں۔ مادّہ اور اُس کے خواص بالذّات مُؤثّر نہیں بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنی ارواحِ مجرّدہ کے ذریعہ سے اُن کو مُؤثّر بناتا ہے۔ اِس عقیدہ سے مادّیت کا بُت ہمیشہ کے لیئے ٹوٹ جاتا ہے۔ غرض منزّہ خالق اور مادّی مخلوق کے درمیان احکام وشرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور اِن محکوم ارواحِ مجرّدہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

وَرُسُلِہٖ

ایک عام غلط فہمی کا ازالہ یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اُسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔ آنحضرتؐ کے وجودِ مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے۔ تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربّانی کے لئے وہی منتخب کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی۔ اُسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیبیوں کا مسکن اور اُسی کی زبان خدا کی خاص مقدّس زبان ہے۔ بابل و نینوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان ہر ملک کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدّس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ صرف اپنے کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرّف ہونے کا مستحق جانتے تھے۔ لیکن تعلیمِ محمدیؐ نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشّان وسعت سے بدل دیا۔ آپؐ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں۔ نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدّم حاصل ہے۔[1] ساری زمین خدا

[1] مسند احمد بن حنبل، از ابو نضرہ تابعی۔

کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدمؑ) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا"[1] اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ روپ، ملک و مرز و بوم اور زبان سے نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نکوکاری سے ہے[2]

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی۔ دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہوگیا۔ بنی اسرائیل جن کو خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا وحی محمدیؐ نے اُن کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ط (المائدۃ: ۱۸)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔

نبوّت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوّت اور پیغمبری صرف انہی کے خاندان کا ورثہ ہے جس طرح اس آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور نبیوں نے سُنی جو وید کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر یہی خیال تھا۔ اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف و عدل و کرم اور رحمتِ عام کے منافی قرار دیا اور کہہ دیا:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ

یہ (نبوّت) اللہ کی مہربانی ہے جس

---

[1] جامع ترمذی آخر کتاب المناقب۔ [2] قرآن اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳)

يَّشَآءُ ط وَ اللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ ○ (الجمعه : ۴)

کو چاہے دے۔ اور اللہ بڑی مہربانی
والا ہے۔

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ
يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ
اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ط
قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَآءُ ط وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ○ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ
مَنْ يَّشَآءُ ط وَ اللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ ○

(آل عمران : ۷۳-۷۴)

کہدو کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے (اسرائیلی
علماء اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ
کیا یہ ممکن ہے کہ جیسا دین تم کو دیا گیا کسی
اور کو دیا جائے یا یہ نئے دین والے تم
سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں، کہدو کہ
(یہ نبوت کا) فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے
وہ جس کو چاہتا ہے اس کو دیتا ہے اور
اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ
اپنی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور
جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص
کرتا ہے، وہ بڑا فضل والا ہے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ
اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
مِّنْ رَّبِّكُمْ ط وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ
بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَ اللّٰهُ
ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○

اہلِ کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند
کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر
تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی
بھلائی نازل ہو۔ اور اللہ اپنی رحمت کے
ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص
کرتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل

(البقرۃ: ۱۰۵) والا ہے۔

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے اور یہ سلسلۂ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک برابر جاری رہا۔

تمام دنیا میں پیغمبر آئے بعثتِ محمدیؐ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی۔ ہندوستان کے رِشیوں اور مُنیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا۔ اُن کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا۔ زردشت نے پاک نژاد انِ ایران کے سوا سب کو یزدان کے جلوۂ نورانی سے محروم یقین کیا تھا۔ بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لئے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں۔ اس کی نگاہ میں عرب و عجم، شام و ہند سب برابر ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ بیں آنکھوں نے پورب، پچھم، اُتّر، دکھن، ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سُنی:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ — اور ہر قوم کے لئے ایک رسول ہے۔

(یونس، ۴۷)

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا — اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک

(النحل : ۳۶)

رسول بھیجا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ

اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔

(الروم : ۴۷)

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

اور ہر قوم کے لئے ایک رہنما آیا۔

(الرعد : ۷)

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝

اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔

(فاطر : ۲۴)

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝

اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے۔

(الزخرف : ۶)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ

اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا تاکہ وہ ان کو بتا سکے۔

(ابراھیم : ۴)

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول تعلیمِ الٰہی کی تشریح و بیان کے لئے مامور ہیں۔

تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف ایک یہودی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں۔ ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے۔ ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے۔ ایک زردشتی تمام عالم کو بحرِ ظلمات کہہ کر بھی نورانی ہو سکتا

ہے اور وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دینداری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعویٰ کر کے اُن سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ آنحضرتؐ تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا والنبیون حقٌ ومحمدٌ حقٌ[1] (سب نبی برحق تھے اور محمدؐ بھی برحق ہے) غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک وہ پہلے موسوی عیسوی اور سلیمانی و داؤدی نہ بن لے۔ اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راستبازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت و رہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ خدا کا ماننا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ	بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں
رُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا	کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور
بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ	اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں
نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ	اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض
وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ	کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس
ذٰلِکَ سَبِیْلًا ○ اُولٰٓئِکَ ھُمُ	کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں وہی تو
الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا	حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے
لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ○	لئے ہم نے اہانت والا عذاب تیار رکھا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری باب التہجد۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

(النسآء : ۱۵۰-۱۵۲)

اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی مزدوری خدا اُن کو دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ

(البقرۃ : ۱۷۷)

اور فرشتوں پر، کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ○

اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

بقرہ کے خاتمہ میں ہے :

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ق

(البقرۃ : ۲۸۵)

ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ

(البقرۃ : ۱۳۶ ، اٰل عمرٰن : ۸۴)

ہم اُن پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

پیغمبروں میں تفریق کی ممانعت پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض

کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں۔ اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسولِ صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے اور اُن پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے۔ اور اب بھی اُن کا یہی عقیدہ ہے۔ یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لئے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں۔ مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ خود آنحضرتؐ کے زمانے میں بہت سے یہود آپؐ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آنحضرتؐ نے اُن کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا۔ مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے اُن کا محروم رہنا قبول نہ فرمایا[1] اور اُن سے صاف کہا:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ	اے یہود! کیا بیر ہے تم کو ہم سے مگر یہی
مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ	کہ ہم خدا پر اور جو ہماری طرف اُتارا گیا
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ	اور جو پہلے اُتارا گیا، اُس پر ایمان
قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ○	رکھتے ہیں اور تم میں اکثر بے
(المائدۃ: ۵۹)	حکم ہیں۔

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے چٹکتے تھے تاہم

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، جلد ہشتم۔

ان کی خاطر سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی نبوّت، تقدّس اور معصومیّت کا انکار نہیں کیا گیا۔ قرآن نے کہا:

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا	اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت
إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝	بیان کی گئی تو تیری قوم اس سے چلّانے
وَقَالُوا ءَأَلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ	لگتی ہے۔ اور بولی کہ ہمارے معبود
هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا	اچھے ہیں یا وہ۔ یہ نام جو وہ تجھ پر دھرتے
جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ۝	ہیں، صرف جھگڑنے کو۔ بلکہ وہ
إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ	جھگڑالو ہیں۔ تو وہ ایک بندہ ہے
(الزخرف، ۵۷-۵۹)	جس پر ہم نے فضل کیا۔

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ بن مریم علیہ السّلام کو بندہ اور رسول مانتا ہے خدا نہیں۔ باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں پر بھی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرستی کا الزام دھرتے تھے۔ قرآن نے اُن کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

پیغمبروں کی غیر محدود تعداد اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے۔ طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ مبعوث ہوئے۔ دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے۔ قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف انہی انبیاءؑ کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے۔ قرآن میں بعض ایسے انبیاءؑ بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے۔ مثلاً حضرت ہود اور حضرت

شعیب علیہما السلام بعض ایسے بھی ہیں جن کو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے لیکن پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے۔ مثلاً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام۔ وحی محمدیؐ نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

پیغمبری کی واضح حقیقت کا اظہار اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب ہے۔ اسلام سے پہلے نبوت، رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی۔ یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کے تھے اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے اور جس کے متعلق وہ یقین رکھتے تھے کہ اس کی دعا یا بد دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔[1] اسی لیئے حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ اُن کے ہاں موجود ہے۔ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان اُن کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے۔[2] حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی حیثیت اُن کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے اور اُن کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں۔ یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت سخیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں۔ عیسائیوں کے ہاں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ "مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے"۔[3] موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ اُن کے تذکرے ہیں اور نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے۔ حضرت

---

[1] دیکھو توراۃ صحیفہ تکوین باب ۲۰۔ ، [2] تکوین ۱۴۔ ۱۸۔ [3] انجیل۔

زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جن کے تذکرے انجیل میں ہیں، وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلّم نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی۔ اس کے فرائض بتائے، اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور اُن سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا۔ آپؐ نے بتایا کہ نبوّت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ اُن کو دکھائیں۔ وہ ہادی (رہنما)، نذیر (ہشیار کرنے والے)، داعی (خدا کی طرف بلانے والے)، مبشّر (خوشخبری سُنانے والے)، معلّم (سکھانے والے)، مبلّغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے۔ خدا ان سے ہم کلام ہوتا تھا۔ اپنی باتوں سے اُن کو مطّلع کرتا تھا اور وہ اُن سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے۔ وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے۔ ان کے سب کام خدا کے لئے تھے اور خدا ان کے لئے تھا۔ یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لئے ہر قوم میں پیدا ہوئیں جنہوں نے ان کو مانا نجات پائی اور جنہوں نے جھٹلایا، ہلاک و برباد ہوئے۔ قرآن پاک نے اُن کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی روئیداد ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ اُن کے پڑھنے اور سُننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، اُن کے اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اُس نے شانِ نبوّت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں ان کی طرف منسوب تھیں ان کو چھوڑ دیا ہے اور یا ان کی تردید کر دی ہے۔

پیغمبروں کی عصمت الغرض نبوّت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام

نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں، نبی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اس لئے انہوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیئے۔ عیسائی ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو معصوم کہتے ہیں باقی سب کی گنہگاری کے قائل ہیں۔ لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے۔ اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاءؑ اور مرسلینؑ کا مشترک وصف ہے۔ کیونکہ گناہ گار گنہگاروں کی رہ نمائی کا مستحق نہیں اور اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا۔ اس بنا پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کو رباطنوں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے اُن کو دھو کر پاک و صاف کیا اور یہ رسالتِ محمدیؐ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام احکامِ عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہلوایا:

وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ	اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا
جَبَّارًا شَقِیًّا ○	اور مجھ کو خدا نے جبار اور بدبخت
(مریم : ۳۲)	نہیں بنایا۔

کیونکہ احکامِ عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی۔ اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروا نہیں کرتے

تھے۔ قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا :

وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ○	اور خدا نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں جیتا رہوں۔
(مریم : ۳۱)	

یہود حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت رکھتے تھے۔ قرآن نے اس الزام کو دور کیا اور کہا :

وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ○	اور مریم بنت عمرانؑ جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔
(التحریم : ۱۲)	

وہم پرست یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو گنڈہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے حالانکہ سحر و جادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا۔ قرآن نے علانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی :

وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ	اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا۔ وہ لوگوں کو جادو
(البقرۃ : ۱۰۲)	سکھاتے تھے۔

اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں اس کی

تردید کی۔

قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرتؐ نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لئے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام سے دلوں میں جوشِ عقیدت نہیں پیدا ہو سکتا۔ تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیاؑ کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیاؑ کا نام و نشان صحیفۂ محمدی میں تلاش کریں گی۔ اس لئے ایک جامع آیت میں تمام انبیاؑ کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی۔ فرمایا:

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ	ہم نے (اے محمدؐ) تمہارے پاس وحی
اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ	بھیجی جس طرح نوحؑ اور اُن کے بعد کے
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ	پیغمبروں کے پاس بھیجی اور ہم نے ابراہیمؑ کو
اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ	اور اسمٰعیلؑ کو اور اسحاقؑ کو اور یعقوبؑ کو اور
وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ	اُن کے خاندان کو اور عیسیٰؑ کو اور ایوبؑ اور
وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ	یونسؑ کو اور ہارونؑ کو اور سلیمانؑ کو وحی بھیجی
وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝	اور داؤدؑ کو زبور عطا کی اور دوسرے
وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ	رسولوں کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے
مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ	پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا
عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى	حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا اور
تَكْلِيْمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ	خدا نے موسیٰؑ سے بات کی اور اُن رسولوں

وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○ (النساء: ۱۶۳-۱۶۵)

کو خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب و دانا ہے۔

انبیاءؑ کے متعلق یہی حقیقت سورہ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط (المؤمن: ۷۸)

اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے اُن میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔

وہ انبیاءؑ جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں تعلیم محمدیؐ کے اُصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرتؐ سے پہلے خدا کے انبیاءؑ مبعوث ہو چکے ہیں اور اس لئے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو جن کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کرسکتا۔ اسی بنا پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن اور رام[1] کو بلکہ ایران کے زردشت[2] کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے۔ بہرحال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اصل یہ ہے

---

[1] کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جانجاناںؒ۔ [2] ملل و نحل ابن حزم۔

کہ قرآن نے انبیاءؑ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اُس نے بیان نہیں کیئے ہیں۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاء کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیئے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیغمبر آئے تھے گو بہ تخصیص اُن کے نام نہیں معلوم ہیں۔ وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں اگر ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہیں تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان بلکہ قرینۂ غالب ہو سکتا ہے لیکن یقین اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے۔

ایسے انبیاء کی شناخت کا اصول اس قسم کے انبیاء جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ آنحضرتؐ سے پہلے گزر چکے ہیں اور اُن کے پیرو اُن کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ

اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔

(النحل: ۳۶)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی

اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○	کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں
(الانبیآء : ۲۵)	مجھی کو پوجو۔

اس لئے وہ تمام قدیم رہبرانِ انسانی اور رہنمایانِ عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے اور جن کی تبلیغ و تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور جن کی زندگی اس تعلیم کے شایانِ شان تھی، ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کے مطابق انبیاء اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اسی بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتمِ نبوتؐ کے زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے۔ اِن سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے۔ البتہ ان انبیاءؑ میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو
عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ	کسی پر فضیلت دی۔ ان میں سے
وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ	کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	کے بہت درجے بڑھائے اور ہم
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ	نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو نشانیاں
الْقُدُسِ ؕ	دیں اور پاکی کی روح سے اس
(البقرۃ : ۲۵۳)	کی تائید کی۔

انبیاء کی باہمی ترجیح کا مسئلہ آپؐ نے دوسرے انبیاءؑ کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی ہے کہ اُن کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آپؐ کو یا خَیْرَ الْبَرِیَّۃ (اے بہترینِ خلق) کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا "وہ تو ابراہیمؑ علیہ السلام تھے"۔[1] ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے عالی خاندان کون تھا؟ فرمایا "یوسف پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ علیہم السلام"۔[2] ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ "قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو بشر پر فضیلت دی"۔ ایک مسلمان یہ کھڑے سن رہے تھے۔ ان کو غصہ آگیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا۔ اس نے دربارِ نبویؐ میں جا کر شکایت کی۔ آپؐ نے اُن صحابی کو بلا بھیجا اور مقدمہ کی روداد سُنی۔ پھر نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک کو دوسرے پر فضیلت[3] نہ دو، یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو۔

یہی وہ تعلیماتِ محمدیؐ ہیں، جن کے ذریعے سے دنیا میں وحدتِ مذاہب، روحانی مساوات، انسانی اخوت اور تمام انبیاءؑ اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ان کی عظمت و جلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے۔ وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ

---

[1] مسند ابنِ حنبل جلد اوّل۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، مناقب حضرت یوسفؑ۔

[3] صحیح بخاری، مناقب حضرت موسیٰؑ۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر دفعتاً اس کو مٹا دیا اور ان کی پاکی کی گواہی دی جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہندوستان، ایران، چین جن کے سچے رہنماؤں کا اُن کے ملک سے باہر کوئی ادب و احترام نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے ان کے جائز ادب و احترام کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت و رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیاءؑ اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے، جو اُن کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے، جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی[1]۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر سُن کر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے[2]، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہو گئے اور تبرکاً اُن کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں شائع اور ذائع ہیں۔ اُنھوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی، اُن کے ادب و احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی اور اُن کی تعظیم و تکریم کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنا لیا۔ دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیاءؑ کے نام ادب سے لئے جائیں، مگر ایک مسلمان کے لئے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور اُن پر درود و سلام پڑھے۔

---

[1] الزخرف: ۵۷-۵۸۔ [2] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ۔

کتبُ الٰہی پر ایمان

وَکُتُبِہٖ

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے کا مقصد ایک مسلمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے۔ ہر چند یہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا اس کی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے۔ تاہم یہ تصریح اس لئے کی گئی تاکہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ — اور جو اُس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمدؐ) اتاری گئی۔ (البقرۃ: ۴)

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں۔ یہ گویا پوری شریعتِ مطہّرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے اور اس لئے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل

ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آجاتی ہیں۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں اُن سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے اُن کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو اُن کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیوں کر مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟ اسی بنا پر اُسکی تشریح آنحضرتؐ نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ بِمَا جِئْتُ بِہٖ (جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ) قرآن نے کہا:

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ	اور ایمان لائے اس پر جو محمدؐ پر اُتارا
(محمد: ۲)	گیا۔

اس عقیدہ کا تکمیلی پہلو لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحبِ مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے۔ قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے اور یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اہلِ قرآن قرآن کیساتھ دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک صحیفۂ محمدیؐ کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے شروع والی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ	اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ سے
(البقرۃ: ۴)	پہلے اترا۔

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ	رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف

مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

(البقرۃ : ۲۸۵)

سے اس پر اُترا اور اہلِ ایمان بھی ہر
ایک خدا پر، اُس کے فرشتوں پر اور
اُس کی کتابوں پر ایمان لایا۔

تمام کتبِ الٰہی پر ایمان لانا ضروری ہے

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاءؑ کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیاءؑ کا اجمالی ذکر کرکے ان کی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ
وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى
وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ
مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ

(البقرۃ : ۱۳۶)

اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ
ہماری طرف اُتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیمؑ
اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور
خاندانِ یعقوب کی طرف اُتارا گیا اس
پر اور جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اُس
پر اور جو کچھ اور پیغمبروں کو اُن کے پروردگار
کی طرف سے دیا گیا ہم اُن سب پر ایمان لائے۔

آلِ عمران میں کسی قدر تفصیل ہے:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ
عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى
اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ
وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ
اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَ

کہہ کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہم پر اُتارا گیا اس
پر اور جو کچھ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ،
اور یعقوبؑ اور خاندانِ یعقوب پر اُتارا گیا اس
پر اور جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اُس پر اور
دوسرے سب پیغمبروں کو اُن کے پروردگار

النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (اٰل عمران : ۸۴)

کی طرف سے جو کچھ دیا گیا اُس پر ہم اُن سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں اُس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ اُس کے انکار کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ (النسآء : ۱۳۶)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ خدا پر، اُس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول پر اتاری اور اُس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

سورۂ مومن میں اُن منکروں کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی تکذیب کریں :

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ۙ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۝ۙ (المومن : ۷۰-۷۱)

جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اُس کو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے جب اُن کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی۔ وہ گھسیٹے جائیں گے۔

چار معلوم الاسم آسمانی صحائف نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے۔ توراۃ جس کو ایک جگہ صحفِ موسیٰؑ بھی کہا گیا ہے حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور خود قرآن۔ ان کے علاوہ ایک موقع پر صحفِ ابراہیمؑ کا بھی تذکرہ ہے:

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ○	یہ باتیں گزشتہ صحیفوں میں بھی ہیں۔
صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی ○	ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔

(الاعلیٰ: ۱۸ — ۱۹)

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گزشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں:

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ○	کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اُس کی گواہی اُن کو نہیں پہنچی؟

(طٰہٰ: ۱۳۳)

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ○	اور بے شبہہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔

(الشعراء: ۱۹۶)

انبیائے قدیم کے غیر معلوم الاسم صحائف اس بنا پر انبیاءؑ کی طرح اِن کتابوں پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی اور اجمالی ایمان ہے۔ جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان پر ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں اُن پر بالاجمال ایمان ضروری ہے۔ کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحیدِ الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت

بھی ہے تو اگرچہ ہم اس کو بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے۔ اسی بنا پر آنحضرتؐ نے یہ فرمایا کہ "اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب[1]" یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے۔ عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے۔ پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفۂ ابراہیم، توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں، تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتبِ الٰہی ہونا ممکن ہے۔

اس عقیدہ کا اثر سیاساتِ عالم پر حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا۔ یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے۔ یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے۔ عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے۔ پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے۔ ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی تمام آسمانی کتابوں کو دجل و فریب مان کر

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و حدیث الافک و تفسیر سورۂ بقرہ۔

بھی آواگون سے نجات حاصل کرسکتا ہے۔ مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کرے جنت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں۔ یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانا اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون۔ اور ان ہی دونوں تقسیموں پر اُن کے قانون کی بنیاد ہے۔ عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی، یہود اور بت پرست گو تین قومیں مانی جاتی ہیں مگر چونکہ اُن کے مذہب میں قانون نہیں ہے اس لئے وہ اکثر امور میں رومن لا کے پیرو رہے ہیں۔ لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں، رومی اور غیر رومی۔ ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لئے اور غیر رومی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ پارسیوں میں پاک نژادانِ ایران اور اور بیرونی لوگ، دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں۔ ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت اور ملیچھ قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

اقوام عالم کی قانونی تقسیم اور ان کے حقوق

مگر اسلام کے گزشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرتؐ نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار طبقوں میں تقسیم فرمایا اور اُن کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیئے جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا۔ یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مسلمان جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتابِ الٰہی یقین کرتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور بُرائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کرسکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح

کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

۲۔ اہلِ کتاب یعنی اُن کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں یا یوں کہو کہ جو قرآن کو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کے حدود میں رہ سکتے ہیں۔ ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں۔ ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ اُن کی جان و مال اور عزت و آبرو کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں۔ اُن کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور اُن کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ ان کا جائز کھانا وہ کھا سکتے ہیں اور وہ اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہل الکتاب یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ و انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود ان کے علاوہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدّعی ہیں جیسے صابئی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہرِ قدرت کی پرستش کرتے ہیں۔ ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہلِ کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرتؐ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں۔ اِن کی جان و مال و آبرو اور اُن کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

۴۔ کفار و مشرکین یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دینِ الٰہی کی طرف منسوب ہیں۔ اُن کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جاسکتا ہے لیکن حقوق حاصل کرنے کے لئے اُن سے کہا جائے گا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کرلیں جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں حرّانی عراقیوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کرکے اپنے لئے حقوق حاصل کیئے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے۔ یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقاید و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لئے آمادہ کیا۔ اور مجوسیوں، صابیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان کے ملکوں کے مناسب مختلف تمدّنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوّت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان تمام رسولوں اور اُن کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہو کہ آدمؑ سے لے کر محمد علیہما السّلام تک جتنے سچّے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ چنانچہ درحقیقت آپؐ کی یہی تعلیم تھی۔ اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدم سے محمد علیہما السّلام تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ سے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

تمام سچّے مذاہب ایک ہیں صحیفۂ محمدیؐ نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیئے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعۃ، منسک اور منہاج۔ شرعہ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں

اور منسک کے معنی طریقِ عبادت کے ہیں۔ دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ پاک پر منکشف ہوا کہ دینِ الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا، ایک رہا اور ایک رہے گا۔ نورِ معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی۔ ایک ہی دین تھا۔ جس کو لے کر اوّل سے آخر تک تمام انبیاؑ آتے رہے۔ اس میں زبان و مکاں کے تغیّر کو کوئی دخل نہ تھا اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے ہر پیغمبر نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید اس کے صفاتِ کاملہ، انبیا اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت حقوقِ انسانی، اخلاقِ فاضلہ اچھے اور بُرے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا۔ یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر جملہ مذاہبِ حقّہ کا اتّفاق ہے۔ اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو طریقۂ تعبیر کی غلطی ہے اور یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی نقص شامل ہو گیا ہے۔

دین و شرعہ، منسک اور منہاج کا فرق

دوسری چیز جس کو آنحضرتؐ کی زبانِ وحی ترجمان نے شرعہ، منہاج اور منسک کہا ہے وہ جزئیاتِ احکام اور متفقہ، مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً عبادتِ الٰہی ہر مذہب کا جزءِ لازم ہے لیکن طریقِ عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے۔ عبادت کے لئے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرّر کی ہے۔ مگر وہ سمت خاص خاص مصلحتوں

کے لحاظ سے مختلف مقرر کی ہے۔ اسی طرح اعمالِ قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے۔ مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں۔ غرض یہ راستے اور طریقے پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے۔ مگر اصلِ دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے، ناقابلِ تبدیل اور ناقابلِ تغیر رہا ہے۔

انبیاءؑ کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اس ازلی ابدی صداقت کو ہمیشہ اہلِ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسبِ حال ہوں، وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں۔

صحیفے وقتاً فوقتاً کیوں نازل ہوئے انبیاءؑ کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک صاحبِ شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب کہ اگلا صحیفۂ وحی جو دین و شریعت کا محافظ تھا کھو گیا یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہو گئی۔ صحیفۂ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفرِ تکوین میں ہے، صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا۔ صحیفۂ موسیٰ کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کے لئے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے۔ پھر انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا۔ چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لئے آیا ہے۔ اس لئے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے اور قیامت تک کی جائے گی اسی لئے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت

ہے۔ البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات واحداثات کے انسداد کے لئے ائمہ، خلفا، مجددین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنّتِ محمدیؐ کا احیاء اور بدعات کا قلمع وقمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدیؐ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

وحدتِ دین پر قرآن کی شہادت وحدتِ دین کی حقیقت کو وحیٔ اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا	اس نے دین میں تمہارے لئے وہی راہ
وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ	مقرر کی جو نوحؑ سے کہی تھی اور ہم نے تیرے
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَآ	پاس جو حکم بھیجا اور جو کہدیا ہم نے ابراہیمؑ سے
بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى	اور موسیٰؑ سے اور عیسیٰؑ سے، یہ کہ دین کو قائم
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا	رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو
تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى	جدھر تو بلاتا ہے وہ اُن پر گراں گزرتا ہے۔
الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ	خدا اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے جو اس
اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ	کی طرف رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے
مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ	لوگوں نے وحی کا علم (حقیقی) ملنے کے بعد
مَنْ يُّنِيْبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا	آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کئے ہیں
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ	اور اگر تیرے رب کی طرف
بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ	سے ایک بات وقتِ مقرر تک کے لئے

سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى لَّقُضِىَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ
اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ
مُرِيْبٍ ۝ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ
وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا
تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ
اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ
كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ
بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ
لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ
لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ
اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ
الْمَصِيْرُ ۝

نہ ہو چکی ہوتی تو اکشفِ حقیقت کر کے اُن
کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو اُن
اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس
امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو اُن
کو چین نہیں لینے دیتا۔ ہو تو سب کو اسی حقیقت
کی طرف بُلا اور اُسی پر استواری سے قائم رہ جیسا
کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور اِن تفرقہ اندازوں
کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں
ایمان لایا ہر اُس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور
مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف
کروں، ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ
ہے۔ ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملے گا اور تم کو
تمہارے کاموں کا۔ ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں
اللہ سب کو اکٹھا کرے گا اور اُسی کی طرف
پھر جانا ہے۔

(الشوریٰ : ۱۳-۱۵)

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو، ابراہیم کو، موسیٰ کو اور تم کو اے محمد (صلوات اللہ علیہم) عطا کیا گیا ہے۔ اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی، اپنے ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیئے اور آپس کی

ضد اور تعصبات سے فرقہ واری کی الگ الگ راہیں نکالیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدتِ دین کی حقیقت کا یقین اہلِ کتاب کو نہیں ہے۔ حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہؐ! تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم اے اہلِ کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہو، تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں یا معاملات میں تمہارے ساتھ عدل و انصاف کروں۔ پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے دو نہیں۔ اگر اتحاد چاہو تو اس نقطہ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں۔ البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے اس کے ذمہ دار ہم تم خود ہیں نہ تم ہمارے کاموں کے جوابدہ ہو اور نہ ہم تمہارے کاموں کے۔ اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

وحدتِ دین کی دعوتِ عامّہ اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ	اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو
سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا	ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے متفق
نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ	ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی
بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا	پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک
بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	بنائیں اور نہ آپس میں ایک خدا کو چھوڑ

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○

(اٰل عمرٰن: ٦٤)

کررب بنائے۔ اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہدے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکمِ الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں۔

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ واریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں اُن کی طرف اشارہ کرکے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ○

(الانعام: ١٥٩)

بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے تجھ کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی ان کو جتا دے گا جو وہ کرتے تھے۔

دینِ قیّم | پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل "دینِ قیم" کی جو ابراہیمؑ علیہ السّلام کا تھا، دعوت دی گئی:

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○

(الانعام: ١٦١)

کہہ دے کہ تیرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف میری رہنمائی کی جو دین صحیح ہے۔ ابراہیمؑ حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیمؑ) مشرکوں میں سے نہ تھا۔

غرض اسلام وہ "دین قیم" ہے جو ہمیشہ انبیاءؑ کا دین رہا اور موجودہ دین اسلام یہود

نصاریٰ کی تحریفات وتصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے جس کی طرف تمام انبیاءؑ اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے۔ اسی لئے اکثر انبیاءؑ کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ	یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی سو تو انہی کی راہ چل۔
(الانعام: ۹۰)	

بعض اسلامی حدود وشرائع کی تشریح کے بعد فرمایا گیا:

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ	خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو اُن کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔
(النسآء: ۲۶)	

اسلام اور مذاہب قدیمہ کا اتحاد اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اپنی حدود وشرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے۔ جو لوگ قرآن کا اس لئے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے اُن سے کہا گیا:

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝	بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں تھی یعنی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔
(الاعلیٰ: ۱۸-۱۹)	

ایک اور آیت میں کہا گیا :

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ○ (الشعراء : ۱۹۶)

اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔

ایک اور مقام پر یہ فرمایا گیا :

مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ط (حٰمٓ السجدۃ : ۴۳)

(اے محمدؐ) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔

دین ہمیشہ ایک رہا اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا۔ ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے بلکہ یہ اسی پرانی دعوت کی تکرار ہے جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یا دب گئی تھی۔ اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گزشتہ اجمال کی تفصیل اور دینِ سابق کی تکمیل ہے۔

اس لئے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی۔ لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرّف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعہ سے مفصّل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک محفوظ و باقی رہے گی۔

شرعہ و منہاج میں تبدیلی ہوئی دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت

ہے اور جو اصل مقصد نہیں، ذریعہ ہے۔ وہ بدلتی رہتی ہے اور عہدِ محمدیؐ تک برابر بدلتی رہی ہے۔ اس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے۔ یہودیوں کو آنحضرتؐ پر اعتراض تھا کہ آپؐ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں۔ قرآن نے اُس کے جواب میں یہی ہمیشہ کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے اُن میں تغیّر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

تبدیلِ قبلہ اس کی مثال قبلہ ہے کہ مقصودِ اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے۔ بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی۔ وہ ان کا قبلہ ہوئی۔ ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی دلبستگی اور لگاؤ تھا، اس لئے ان کا قبلہ بنی۔ چنانچہ قرآن نے تعیینِ قبلہ کے موقع پر کہا:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ (البقرۃ: ۱۴۸)

اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے، سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو۔ اس لئے فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (البقرۃ: ۱۷۷)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رُخ کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)

خانۂ کعبہ کے حج کی تعیین اسی طرح خانۂ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا۔ اسلام نے

جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر گروہ نے اپنے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے اور اسلام نے خانۂ کعبہ کے حج کو اس لئے تجویز کیا ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا	ہر قوم کے لئے ہم نے عبادت کا طریقہ
هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ	بنایا جس کی اس قوم کے لوگ مذہباً
فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ	پابندی کرتے ہیں۔ سو اس بات میں
إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ ○	وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں۔ تو اپنے رب کی طرف
وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ	بلائے جا۔ تو بیشک سوجھ کی سیدھی راہ پر
بِمَا تَعْمَلُونَ ○	ہے اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہدے
(الحج: ٦٧ – ٦٨)	کہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں پر عمل کرنے کی ہدایت

سورہ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزاو سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا، یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔

پہلے یہودیوں سے کہا:

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى	ہم نے توراۃ اُتاری۔ اس میں ہدایت
وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ	اور روشنی تھی۔ پیغمبر جو حکم بردار تھے
الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا	وہ یہود کا فیصلہ کرتے اور اُن کے
وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا	عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ

اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ	نگہبان تھے۔ اور وہ تھے اس پر خبردار۔

(المائدۃ: ۴۴)

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ	اور ہم نے اُن پیغمبروں کے پیچھے مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا سچ بتاتا ہوا اُس کو جو اُس کے پہلے تھا یعنی تورات اور ہم نے اس کو انجیل دی۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی توراۃ کی اور ہدایت اور نصیحت پرہیزگاروں کے لئے اور چاہیئے کہ انجیل والے اُس کا حکم دیں جو اِس میں خدا نے اتارا۔

(المائدۃ: ۴۶-۴۷)

مسلمانوں کو شریعتِ اسلام پر عمل کرنے کا حکم اس کے بعد آنحضرتؐ کو خطاب کر کے کہا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا	اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اُتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور امانت کے ساتھ اُس پر شامل ہے۔ سو تو اُن کے درمیان

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط	اِس کے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے اُتارا اور تیرے پاس جو سچائی ہے اُس کو چھوڑ کر اُن خواہشوں کی پیروی نہ کر۔
(المائدۃ : ۴۸)	

اہلِ اہواء کی پیروی کی

[illegible] کتابوں کو چھوڑ کر [illegible] کے ساتھ صحیفۂ محمدیؐ نے [illegible] سابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی اور اُن اہلِ مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے، اپنی اپنی کتبِ مُنزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گزشتہ کتابوں پر امین و محافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یکجا ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہواء (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی۔ یہ اہواء کیا ہیں؟ کتابِ الٰہی میں تحریف و تصرّف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکامِ الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۙ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے) آنحضرتؐ کو حکم ہوتا ہے کہ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر ان اہلِ کتاب کی اہواء کی پیروی نہ کریں۔ اس کے بعد حدود و جزا و سزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات، انجیل اور قرآن میں ہیں، غیر اہم بتایا گیا۔ فرمایا:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ط	ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔
(المائدۃ : ۴۸)	

یہود و نصاریٰ فروعی اختلافات پر ایکدوسرے کو برسرِ باطل کہتے تھے

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسرِ باطل کہتے تھے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ

اور یہود نے کہا نصاریٰ کسی راہ پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہود کسی راہ پر نہیں، حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔

(البقرۃ: ۱۱۳)

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ

اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

(البقرۃ: ۱۳۵)

اسلام کی دعوت اصل دینِ ابراہیمی کی طرف

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے اپنے الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دینِ ابراہیمی پر متّفق ہو جاؤ:

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى

کہہ بلکہ ابراہیمؑ کے دین کی پیروی کرو جو موحّد تھا مشرک نہ تھا۔ تم لوگ کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اُترا اور جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد پر اُتارا گیا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اور جو سب نبیوں کو

وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ

(البقرۃ: ۱۳۵ – ۱۳۷)

اُن کے خدا کی طرف سے دیا گیا سب پر ایمان لائے۔ ہم اِن رسولوں میں فرق نہیں کرتے۔ اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر رُوگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔

یہود اور نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ

(البقرۃ: ۱۱۱)

یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنّت میں داخل نہ ہوگا۔

جواب دیا گیا:۔

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ

(البقرۃ: ۱۱۱)

یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔

بلکہ

بَلٰى ۟ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے۔ نہ اُن

يَحْزَنُوْنَ ○ کو خوف ہوگا اور نہ غم۔

(البقرۃ : ۱۱۲)

اسلام کا تمام اہلِ مذاہب کو یکساں خطاب تمام اہلِ مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

(البقرۃ : ۶۲)

بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو اُن کی مزدوری اُن کے پروردگار کے پاس ہے۔ نہ اُن پر خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے اور نصاریٰ اور صابیین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دورِ نبوت میں خدا کی توحید پر، روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کیئے اُن کو اپنے کام کا پورا ثواب ملے گا یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر اور بُت پرستی سے یقیناً پاک تھی، عمل کیا اس کو اُس کا ثواب ملے گا۔ خدا کی توحید اور روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہو سکتا بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے اور اس پر تمام اہلِ مذاہب کا اتفاق ہے۔ اس لئے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ
وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ
اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ
بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ
أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝
أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ
وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا
مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ
أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ
يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ
اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

(النساء: ۱۵۰ - ۱۵۲)

بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں
کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ
اور اُس کے رسولوں میں جدائی کریں اور
کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی
کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ
اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں
وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں
کے لئے اہانت کرنیوالا عذاب تیار کیا
ہے، اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں
پر ایمان لائے اور ان میں کسی کا کبھی انکار
نہیں کیا یہ وہ ہیں جن کو اُن کی
مزدوریاں خدا دے گا اور خدا بخشنے والا
رحم کرنے والا ہے۔

دوسری آیت میں ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ

مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے
رسول پر ایمان لائے۔

(النور: ۶۲)

اسلام کامل تمام رسولوں کی تصدیق ہے اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبولِ عمل کے لئے ایمان شرط ہے۔ دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے علم

کے لئے نبی کی تصدیق ضروری ہے اسی لئے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کے ماننے والے ہیں۔ اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے۔ چنانچہ اس کی تفصیل سورہ مائدہ میں ہے :

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

کہدے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا اس کو قائم نہ کرو۔ اور (اے پیغمبر) جو تیری طرف اترا ہے وہ ان کی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا۔ تو ان منکروں کا غم نہ کرو۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور صابئی اور عیسائی جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو ان پر کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(المائدۃ، ۶۸ - ۶۹)

یہود و نصاریٰ انبیاءؑ کی تکذیب کرتے رہے اور اس لئے اصل اسلام سے ہٹ گئے

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیتِ مسیح میں مبتلا ہو گئے۔ اس لئے

اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے۔ فرمایا:

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ
وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ط
كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا
تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا
وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ○ وَحَسِبُوْٓا
اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا
ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ
عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ط
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ
اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط
وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ
اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ط
اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ
حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ
مَاْوٰىهُ النَّارُ ط وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ○ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ
قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ م

بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد
لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے۔
جب کبھی اُن کے پاس کوئی رسول اُن
کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام
لے کر آیا تو انہوں نے کتنوں کو جھٹلایا
اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال
کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی۔ سو
اندھے ہو گئے اور بہرے۔ پھر خدا اُن
پر رجوع ہوا پھر ان میں بہتیرے
اندھے اور بہرے ہو گئے اور اللہ دیکھتا
ہے وہ جو کرتے ہیں۔ بے شبہ وہ کافر
ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا
مسیحؑ ہی اللہ ہے۔ مسیحؑ نے تو یہ کہا تھا
کہ اے بنی اسرائیل! اللہ کو پوجو جو میرا
اور تمہارا رب ہے۔ بیشک جو اللہ
کا شریک بنائے گا تو اللہ نے اُس پر
جنت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانا
دوزخ ہے اور گنہگاروں کی کوئی مدد

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ
وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○
(المائدۃ: ۷۰-۷۳)

کرنے والا نہیں۔ بے شبہ وہ کافر ہوئے
جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے
حالانکہ کوئی اللہ نہیں مگر وہی ایک۔ اگر وہ اپنے
اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں
کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا۔

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے "ایمان" کا حال تھا۔ اس کے بعد اسی رکوع میں اُن کے "حُسنِ عمل" کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی کے بعد ہی اُن سے کہا گیا ہے:

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ
النَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا
اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○
(المائدۃ: ۸۱)

اور اگر اللہ اور اِس نبی پر اور جو اِس
نبی پر اُترا اُس پر یہ لوگ ایمان لے
آتے تو اِن (مشرکوں کو) وہ اپنا
دوست نہ بناتے۔ لیکن ان میں
اکثر نافرماں ہیں۔

اسلام کا اصل الاصول توحیدِ کامل اور رسالتِ عمومی ہے اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں، توحیدِ کامل اور رسالتِ عمومی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلا شریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ
اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ

کیا وہ دینِ الٰہی کے سوا کوئی اور دین
چاہتے ہیں، حالانکہ جو بھی آسمانوں میں

الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ	اور زمین میں ہے وہ خوشی سے یا مجبوراً
يُرْجَعُوْنَ ○ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ	خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کیطرف
وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ	سب لوٹائے جائیں گے۔ (اے پیغمبر) کہہ کہ
عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ	ہم اللہ پر اور جو اُس نے ہم پر اُتارا اور جو ابراہیمؑ
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ	پر اور اسمٰعیلؑ پر اور اسحاقؑ پر اور یعقوبؑ پر
وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى	اور اُن کی اولادوں پر اُترا اور جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ
وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا	اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف
نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ وَ	سے ملا ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے
نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ وَمَنْ	ہیں۔ ہم ان میں سے کسی میں کوئی فرق
يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ	نہیں کرتے ہم اُسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار
يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ	ہیں اور جو اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○	گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائیگا اور وہ آخرت
(آل عمران: ۸۳-۸۵)	میں نقصان اٹھانیوالوں میں سے ہوگا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔ جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ آلِ عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلاتِ باطلہ اور اتباعِ متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے یعنی دینِ اسلام سے رُوگرداں ہو کر اختلافات میں پڑ گئے۔ فرمایا:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ	بیشک دین خدا کے نزدیک اسلام

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ
بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ۝ فَاِنْ حَآجُّوْكَ
فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ
وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ

(اٰل عمرٰن : ۱۹-۲۰)

ہے اور جن کو کتاب دی گئی، انہوں نے علم
آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے
سبب سے اختلاف کیا، اور جو اللہ کی
آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب
لینے والا ہے۔ تو اگر (اے پیغمبر) یہ تجھ سے
پھر کج بحثی کریں تو کہدے کہ میں نے اور
میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع
فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔

اسی کے بعد آنحضرتؐ کو حکم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ
الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ
اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

(اٰل عمرٰن : ۲۰)

(اور اے پیغمبر) اُن سے جن کو کتاب دی گئی
اور عرب کے جاہلوں سے کہدے کہ کیا
تم نے بھی اسلام قبول کیا۔ اگر کیا تو انہوں
نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ
پر صرف پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ بندوں
کو دیکھتا ہے۔

اسلام کا ہدایتِ تامّہ ہونا یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر "ہدایتِ تامّہ" ملنے کی بشارت ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اسلام "ہدایتِ تامّہ" ہے یہی دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گزشتہ پیغمبر کی اُمّت

ہوں کھو دیا تھا۔ اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے جو ہدایت اُن قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ "اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابئی، جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا" اُن میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود "توحیدِ کامل ہے"۔ اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابئی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ کیا مسلمان بھی اس توحیدِ کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو اُن کے رسولؐ کے ذریعہ سے دنیا میں آئی ہے یہ اصول ہر ایک کے لئے ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابئی غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

نبوّتِ محمدیؐ کا دعویٰ نبوّتِ محمدیؐ کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے۔ بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہبِ سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے چونکہ اُن کے پیرو اپنے تاویلات، تحریفات تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لے کر آخری دفعہ تشریف لائے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی کبھی ناقص نہ ہوگی کیونکہ اس کا صحیفۂ ہدایت (قرآن) تحریف، اختلافات اور تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔

دعوتِ محمدیؐ میں ہدایت کی بشارت یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوتِ محمدیؐ کی دعوت جہاں دی گئی ہے ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے۔ چنانچہ اسی آیت میں جو اوپر گزری یہ ہے:

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (آل عمران: ۲۰)

اور (اے پیغمبر) اُن سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے۔ اگر اسلام لائے تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔

سورۂ بقر میں ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ (البقرۃ: ۱۳۶-۱۳۷)

(اے مسلمانو!) کہو کہ اللہ پر اور جو ہماری طرف اُترا اور جو ابراہیمؑ پر اور اسمٰعیلؑ پر اور اسحٰقؑ پر اور یعقوبؑ پر اور ان کی اولاد پر اُترا اور جو موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو اور سب پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا (سب پر) ایمان لائے۔ ہم اُن میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں۔ تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو اُنہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد پر ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیم محمدیؐ کی طرف دعوت اسی "ہدایت" کے پانے کے لئے ہے جو اسلام یعنی انبیاءؑ کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور اب فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ	اور جو اُس کو جو تیری (پیغمبر) طرف اُترا
اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ	اور جو تجھ سے پہلے اُترا دونوں کو
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝	مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے
اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ	ہیں۔ وہی اپنے پروردگار کی ہدایت
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

(البقرۃ: ۴-۵)

اہلِ مذاہب اور تمام مسلمانوں کو دعوتِ محمدیؐ کیوں پیش کی گئی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے اُن کا حصہ ہے جو تعلیم محمدیؐ کو قبول کریں اور وہی نجاتِ کامل کے مستحق ہیں:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ	اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے
فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ	تو اس رحمت کو میں اُن کے لئے لکھ
يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ	دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ دیتے
بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ	ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں
يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ	جو اِس اَن پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی

الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ
یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ
وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ
عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ
كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا
النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ یٰٓاَیُّهَا
النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ
جَمِیْعَا ِالَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ
یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(الاعراف: ۱۵۶-۱۵۸)

کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ اور
انجیل میں لکھا پاتے ہیں، جو اُن کو نیکی کا
حکم دیتا ہے اور بُرائی سے باز رکھتا ہے
اور اچھی چیزوں کو اُن کے لئے حلال
کرتا اور بُری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور
اُن کے بندھن کو اور اُن زنجیروں کو جو
اُن پر پڑی تھیں اُتارتا ہے تو جنہوں نے
اِس کو پیغمبر مانا اور اِس کی تائید کی اور اِس
کی مدد کی اور اُس روشنی کے پیچھے چلے جو
اِس کے ساتھ اُتری وہی کامیاب ہیں۔
کہدے (اے پیغمبر) کہ اے انسانو! میں
تم سب کی طرف اُس خدا کا رسول ہوں
جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی
ہے۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہی
جِلاتا اور وہی مارتا ہے۔ سو اللہ اور اُس کے
اِس اَن پڑھ پیغام رساں رسول پر ایمان
لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان
رکھتا ہے اور اِس رسول کی پیروی کرو
تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گزشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ دینِ خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا، وہ صحفِ الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپؐ کے ذریعہ سے پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیاتِ احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا، وہ آپؐ کے ذریعہ سے دُور کی گئیں۔ نیز آپؐ عالمگیر پیغمبر بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں۔ اس لئے ہدایتِ تامہ، نبوتِ عمومی، نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف وحی محمدیؐ کے اندر محدود ہے۔

الغرض دینِ محمدیؐ کو قبول کرنا اس لئے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دینِ ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا، اسی کو صحیفۂ محمدیؐ لے کر آیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ چاروں دعویٰ یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختمِ نبوت حسبِ ذیل دلائل سے ثابت ہیں:

تکمیلِ دین | قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اُس کے ذریعہ سے دینِ الٰہی اپنے تمام اصول و فروع (مناسک و مناہج و شرائع) کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا۔ بلکہ گزشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"میں ان کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا (استثناء ۱۸-۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اُن کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے مُنہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی طرح ایک اور صاحبِ شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے بھی کہا:

"لیکن وہ فارقلیط (احمدؐ) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا ۱۴-۲۶)

"اور وہ فارقلیط (احمدؐ) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے ..... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی۔ اسلیئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سنے گی سو کہے گی۔ میری بزرگی کرے گی۔" (یوحنا ۱۶-۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا، اور ایک آیندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔

موعود الاممؐ کی آمد اور اس کا دعویٰ آخر وہ موعود الاممؐ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰؑ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں اور میرے منہ میں خدا

نے اپنی بولی ڈالی ہے" اور یہ دعویٰ کیا کہ "میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لئے آنی ہے۔ میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اوپر سے سنتا ہوں" اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحیٔ الٰہی نے اس کی زبان سے یہ اعلان عام کیا:۔

وحیٔ الٰہی کی جانب سے تکمیل کا اعلان

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا۔
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ	اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور
رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط	تمہارے لئے اسلام کا دین
(المائدۃ ۳)	پسند کیا۔

اِسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت تشفی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے لئے ان پر عاید تھے اور اصل دینِ ابراہیمی میں داخل نہ تھے[1] یا انسانوں کے اضافے اور تفرقات تھے، بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کئے جو ہر زمانہ کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے اُس نے اپنے بعد کسی آنے والے پیغمبر کی پیشینگوئی نہیں کی۔ نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی۔ نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنے والے، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِکَ کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔

---

[1] دیکھو آیت کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِہٖ الایۃ (آل عمران ۹۳)

قرآن مہیمن کتب ہے اس دینِ کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدّق ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (المائدۃ: ۴۶) — اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لئے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کرلیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (المائدۃ: ۴۸) — اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔

لفظ مہیمن کی تفسیر اہلِ زبان مفسروں نے یہ کی ہے:۔

ابن عباسؓ: شاہد اور امین۔ قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہؓ: قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں ان کا وہ امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچّی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے۔ قرآن سے پہلے کوئی کتابِ الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور اور تصرّفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ توراۃ جل جل کر خاک ہوئی۔ پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور

ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا۔ اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے۔ اِن کتابوں کا یہ حال اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ اسی بنا پر اُن کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا۔ لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی اور محفوظ رہے گا۔ اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ○ (الحجر : ۹)	ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اُتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

یہ وعدۂ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ○ (القیٰمة : ۱۷-۱۹)	بیشک ہمارے ذمہ ہے اِس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا اور اِس کا پڑھنا پھر جب ہم پڑھیں تو تو اِس کے پڑھنے کے ساتھ رہ پھر بے شبہ ہم پر ہے اسکو کھول کر بتانا۔

اس آیت میں قرآن کی قرارت یعنی لفظ وعبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی۔ فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ○ لَّا يَاْتِيْهِ	اور بے شک یہ قرآن ایک ایسی کتاب

الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ○	ہے جو غالب ہے۔ باطل نہ اِس کے سامنے سے اور نہ اِس کے پیچھے سے اِس کے پاس آئے گا۔ ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اُترا۔
(حٰمٓ السجدۃ : ۴۱-۴۲)	

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی۔ باطل نہ اُس کے سامنے سے اُس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے۔ کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اُتری ہے اس لئے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لئے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت مقدماتِ بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو لیکن وحی محمدیؐ نے ہر شک کے ازالہ کے لئے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب آپؐ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں کہ دینِ کامل اور صحیفۂ الٰہی محفوظ ہو چکا اور ہدایتِ ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا۔ چنانچہ خود تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ بعثتِ محمدیؐ کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں، زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل

گئے اور توحیدِ کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہوگیا۔ اور خدا کے تمام رسولوں کو سچّا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقّی پانے لگا، یہاں تک کہ اُن قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کرلیا۔

وحدتِ ادیان اور دینِ اِسلام

تفصیلِ بالا کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ وحدتِ ادیان کا منشا کیا ہے یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاءؑ کا مذہب رہا لیکن وہ بعد کو اُنکے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرّف کے سبب سے بگڑتا رہا۔ اسی دینِ ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوّت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم اور باقی رہے گا۔ اگر تمام مذاہبِ سابقہ اپنے اپنے اس اصلِ دین پر آجائیں جس کی تعلیم اُن کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ وہی دینِ ازلی ہوگا جس کا نام اسلام ہے اور نوحی، ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا۔ اسی لئے فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	اے وہ لوگو جن کو پہلے کتاب دی گئی
اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا	اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں
مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ	اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت
وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ	کے گنہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی
اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ	ہم اُن پر لعنت کریں اس وحی پر ایمان
السَّبْتِ ؕ	لاؤ جو ہم نے اب اتاری۔ (قرآن)، جو

(النسآء : ۴۷) ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں
تصدیق کرتی ہے۔

مشرکینِ عرب سے زیادہ اہلِ کتاب کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا اس لئے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے:

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ

(البقرۃ : ۴۱)

اور جو کتاب ہم نے اب اُتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے، اُس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ بنو۔

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ

(البقرۃ : ۹۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اُتارا، اس پر ایمان لاؤ تو جواب دیا کہ جو ہم پر اُترا ہم اس کو مانتے ہیں اور وہ اُس کے سوا کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ یہی (قرآن) حق ہے اور جو اُن کے پاس ہے اُس کی تصدیق کرتا ہے۔

صحیفۂ محمدیؐ نے اہلِ کتاب کو وحدتِ دین کی دعوت دی

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے مسلمان ہونے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں قرار دیا کہ وہ تنہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی قرار دیا کہ وہ تمام اگلی نبوتوں اور صحیفوں پر بھی ایمان

لائے۔ چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرتؐ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپؐ کے ہموطن آپؐ کے صحیفہ کو نہیں مانتے تھے بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے تھے۔ سورۂ سبا میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ	اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر
بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ	ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے
يَدَيْهِ ؕ (سبا: ۳۱)	اگلی کتاب پر (یعنی تورات پر)

وحدتِ دین کی حقیقت صحیفۂ محمدیؐ میں۔

اور اسی لئے آنحضرتؐ نے تصریح کے ساتھ فرمایا کہ "جو میری عبدیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ بن مریمؑ کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا وہ جنت میں جائے گا"[1] الغرض وہ ازلی ابدی دین صرف ایک ہی تھا اور تمام انبیاؑ اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے تھے۔ یہی وحدتِ دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ	اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام
الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ	کرو۔ میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور
اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ وَ	بے شک تم سب کی امت ایک امت
اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً	ہے اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار
وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝	ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو۔ تو اُن کے
فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ	پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، ذکر عیسیٰ علیہ السلام۔

كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○ (المومنون: ۵۱-۵۳)

ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔

اسی حقیقت کی مزید تشریح آنحضرتؐ نے اپنے الفاظ میں فرمائی ہے:

الانبیاء اخوۃ لعلات امھاتھم شتی ودینھم واحد (بخاری کتاب الانبیاء۔ ذکر عیسیٰؑ)

تمام انبیاء ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں اور اُن کا "دین" ایک ہے۔

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ: ۲۶۴) وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (البقرۃ: ۴)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات[1] کی آخری کڑی ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے۔ سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

(البقرۃ: ۴)

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔

(التوبۃ: ۱۸)

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان

(التوبۃ: ۴۴) لائے ہیں۔

اٰخرۃ کے لفظی معنی "پچھلی" کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے۔ عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً "دنیا" کے لفظی معنی "قریب ترین" کے ہیں اور یہ صفت ہے۔ اس کا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدار

---

[1] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کی تفصیلات کی گئی ہیں وہاں یوم آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

(گھر) ہے۔ اس لئے الدنیا کا مفہوم الحیاۃ الدنیا (قریب ترین زندگی یعنی اِس عالم کی موجودہ زندگی) یا الدار الدنیا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم) ہے۔ اسی طرح الآخر اور الآخرۃ کا مفہوم الیوم الآخر و الحیوۃ الآخرۃ و الدار الآخرۃ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر ہے اور قرآن پاک میں یہ لفظ انہی معنوں میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حیاۃ (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسبِ ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ — اور بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔

(العنکبوت: ۶۴)

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ — اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔

(الانعام: ۳۲)

ان دونوں آیتوں میں دار یعنی گھر کا لفظ موجود ہے؛

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ — کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہو گئے؟

(التوبہ: ۳۸)

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا — جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی (زندگی) کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔

المومنون: ۳۳

ان آیتوں میں الحیاۃُ الدُّنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ الآخِرۃ سے مراد اَلحَیَاۃُ الاٰخِرَۃ یعنی پچھلی زندگی ہے[1] اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لے کر حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں یا آئیں گے۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

---

[1] دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بیشمار آیتوں میں مذکور ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے:

وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ط — دنیا اور آخرت میں معزز۔

(اٰل عمرٰن : ۴۵)

سلسلہ دعا میں ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً — پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔

(البقرۃ : ۲۰۱)

کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے:

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ج — ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔

(البقرۃ : ۲۱۷)

اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ — انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔

(النحل : ۱۰۷)

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ج — ہم ہیں تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست۔

(حٰمٓ السجدۃ : ۳۱)

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ط	جو ایمان لائے اُن کو اللہ حیاتِ دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات (کلمۂ توحید) پر مضبوط رکھے گا۔

(ابراھیم : ۲۷)

اس آیت میں "آخرت" سے مراد "عالم برزخ" ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی جب کہ ہر چیز اُس وقت واضح اور نمایاں ہوگی۔ اس لئے اس آیت میں "آخرۃ" سے مراد عالمِ برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی اور ایک حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ "قبر" (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے۔"[1]

یومِ آخر اور حیاتِ آخرت پر ایمان اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور اُن کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴۴) اور کبھی "دنیا" کے بجائے "اولیٰ" (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ فرمایا:

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ○ (النازعٰت : ۲۵)	تو خدا نے اس کو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔
وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ○ (الیل : ۱۳)	اور ہمارے ہی لئے ہے پچھلی اور پہلی زندگی۔

[1] ابن ماجہ و حاکم بحوالہ کنز العمال جلد ہشتم (ترمذی)

اکھڑ جائے۔ اسی لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرتؐ کی تعلیم نے اس آیندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت اور فنا نہیں۔ پہلے دور کا نام "برزخ" اور دوسرے کا نام "بعث" یا حشر و نشر اور قیامت ہے۔ اور ان سب کے معنی جی اٹھنے، اکٹھے کیئے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لئے اس دوسری زندگی یا اُس کے عالم کا نام قرآن میں اَلدَّارُ الْاٰخِرَۃ اور عُقْبَی الدَّار وغیرہ ہے جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

توراۃ و انجیل میں برزخ و قیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے۔ لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں بلکہ اُس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجود عالم کے علاوہ عالم برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے سزا، جزا کے دو مقام ہیں۔ شخصی موت کے بعد ہر شخص عالمِ برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے، سلسلۂ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہو گی، دوسری زندگی کی دنیا شروع ہو جائے گی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس اور ظل ہو گی۔ چنانچہ سورہ توبہ کی حسبِ ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دورہائے حیات کا ذکر ہے:۔

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ	ہم اُن کو دو مرتبہ عذاب دیں گے
اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝	پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف،
(التوبۃ ۱۰۱)	لوٹائے جائیں گے۔

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا، برزخ اور قیامت ہیں۔

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرّت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے وہ صرف اِس مادّی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے ورنہ درحقیقت اس کی براہِ راست راحت و لذّت کا اس مادّی دنیا میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چُھپ جائے گا۔ وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا۔ لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذّت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

برزخ

قرآن میں لفظ برزخ اور اس کے معنی

"برزخ" کا لفظ قرآن پاک میں تین جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ، حاجب اور حائل مراد ہے۔ چنانچہ سورۂ رحمٰن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے۔ جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے، جو ان کو آپس ملنے نہیں دیتا:

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ○ (الرحمٰن: ۲۰)

ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا

اس عجیب و غریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ (الفرقان: ۵۳)

اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے

اس کا نام برزخ ہے۔ سورہ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○	اور اِن مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے۔ اس دن تک جب کہ وہ (قیامت میں) اُٹھائے جائیں گے۔
(المومنون : ۱۰۰)	

قبر برزخ کا عرفِ عام ہے | عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم ورواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام "قبر" ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعرِ دریا یا کسی درندہ یا پرند کے پیٹ میں۔ اسی لئے فرمایا۔

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ ○	بے شبہہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔
(الحج : ۷)	

اب ظاہر ہے کہ یہ "بعث" صرف انہی مُردوں کے لئے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میّت کے لئے ہے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو۔ اسی لئے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسمِ خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت وحیات کی منزلیں | قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے۔ ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ○	ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا۔ ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا۔ پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔
(المومن : ۱۱)	

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمائی ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ○

(البقرۃ : ۲۸)

کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ
تم پہلے مردہ تھے۔ پھر تم کو اس نے
زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم
کو مار دے گا۔ پھر تم کو جلائے گا پھر
اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے۔ جب وہ مادّہ یا عنصر کی صورت میں تھا پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا۔ یہ اس کی پہلی زندگی ہے۔ پھر موت آئی۔ روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادّی صورت میں منتقل ہو گیا۔ یہ دوسری موت ہوئی۔ پھر خدا اُس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا۔ یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی۔ جس کے بعد پھر موت نہیں۔ قرآن پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ○
ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ
رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ○

(الزمر : ۳۰-۳۱)

بے شک تو بھی مرنے والا ہے، اور
وہ بھی مرنے والے ہیں۔ پھر تم قیامت
کے دن اپنے پروردگار کے سامنے
دعویٰ پیش کرو گے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝
ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
تُبْعَثُوْنَ ○

(المؤمنون : ۱۵-۱۶)

پھر تم اس کے بعد مر جانے والے
ہو۔ پھر تم قیامت کے دن اُٹھائے
جاؤ گے۔

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہو گی؟ اس کے سمجھنے کے لئے

ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔

نیند اور موت کی مشابہت اللہ تعالیٰ نے اس مادّی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لئے اپنی عجیب و غریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے۔ جس کو ہم نیند کہتے ہیں۔ روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے۔ ایک ادراک و احساس کا اور دوسرے تدبیر و تغذیہ کا نیند وہ عالم ہے جس میں ہمارے تمام آلاتِ ادراک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گرد و پیش کی مادّی دنیا سے یکسر بے گانہ بن جاتے ہیں۔ تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلّق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادّی زندگی، نشو و نما اور بقا کی تدبیروں اور دل و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کی غذا رسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے۔ اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے۔ اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلّق قائم رہتا ہے۔ اس لئے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے، لیکن موت کی حالت میں جسم کا روح سے تدبیری تعلّق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے۔ اس لئے جسم کے اجزاء کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے۔ جس کی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہامِ طبعی کی خبر دیتا ہے۔ قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ	اور وہی ہے، جو تم کو رات میں مارتا
وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ	ہے اور جانتا ہے جو تم نے دن میں
ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ	کمایا۔ پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تاکہ
مُّسَمًّى ۚ	مقرّرہ وقت پورا کیا جائے۔

(الانعام: ۶۰)

اس سے زیادہ تفصیل سورہ زمر میں ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (الزمر: ۴۲)

وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو اُن کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں، اُن کو اُن کی نیند میں (وفات دیتا ہے)۔ تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو (جس پر موت کا حکم نہیں (یعنی نیند والی کو) ایک مدت معینہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے "برزخ" کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پاکر قبروں سے اٹھیں گے۔ تو گناہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا:

يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۭ (یٰسٓ: ۵۲)

اے ہماری خرابی، کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اُٹھا دیا۔

غزوۂ اُحد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، اُن کی موت ٹل نہیں سکتی تھی۔ اگر وہ میدانِ جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل نکل کر اپنے مقتل میں خود آجاتے۔ اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے:

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ

کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے

اَلَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ ج	تو جن کے لئے مارا جانا لکھا گیا تھا۔ وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔
(آل عمران : ۱۵۴)	

اسی لئے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لئے اکثر "بعث" لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں[1]۔ جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ	اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے۔ پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔
(الانعام: ۶۰)	
وَ اَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ ۝	اور بے شک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں، جگائے گا۔
(الحج : ۷)	

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال وجواب کے بعد نکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ نَمْ کَنَوْمِ الْعُرُوْس (دلہن کی نیند سو جاؤ) جس کو وہی جگاتا ہے، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اُٹھائے گا[2]۔

---

[1] صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ سے نمازِ تہجد کے لئے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا، تو حضرت ممدوحؓ نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی یا رسول اللہ! انفسنا بید اللہ۔ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا" (ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں، جب وہ جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے) اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔

[2] جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر حدیث حسن غریب۔

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی ایک طویل و عمیق[1] نیند کے مشابہ ہے۔

خواب میں لذّت و الم | انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات اپنی مادّی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں۔ مگر اُس کے ادراک و احساس کی تمثیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادّی دنیا کی طرح تشکّل ہو جاتی ہے۔ اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے۔ جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے۔ اُس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں۔ نیز اس میں درد و رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادّی دنیا میں ہیں۔ اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے۔ اور اگر اس میں لذّت ملتی ہے تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اُس کو اپنے مادّی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں۔ غرض عالمِ خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی و رنج اور لذّت و الم اور اس مادّی دنیا کی جسمانی و مادّی شادی اور رنج اور لذّت و الم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالمِ خواب کی لذّت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادّی دنیا کی لذّت و تکلیف احساس و ادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادّی بیداری والی لذّت و تکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خواب والی لذّت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں فھذا المبتلیٰ فی الرویا غیر انہ رویا لا یقظۃ منھا الی یوم القیامۃ، باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ، یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یہ ایک ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگتا نہیں ہے۔

خواب والے لذائذ و آلام کے مختصر مناظر اور ان کے حقائق اور اسباب و علل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب و غریب معاملات سامنے آتے ہیں۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات و معلومات جو کبھی بھی ذہنِ انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بحالتِ بیداری مادّی دُنیا کے مشاغل اور زمانہ کے استمداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں مادّی گراں باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسّم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں۔ اس لئے وہ تمام اچھے اور بُرے اعمال جو انسان نے عمر بھر کئے ہیں خواہ وہ اُن کو آج بھول گیا ہو، مگر اُن کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے۔ معدوم و مفقود نہیں ہو گئی۔

خواب کی عجیب و غریب صورت وہ ہے جس کو تمثیلی کہتے ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمتِ کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستاروں کی صورت میں دیکھا۔ شاہِ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اس کے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرندے اس میں چونچ مار کر کھاتے ہیں۔ شاہِ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دُبلی گایوں کی صورت میں دیکھا۔[1] آنحضرتؐ نے فتحِ مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں۔ مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذّابوں

---

[1] یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں۔

کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا۔ شہدائے اُحد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا۔ مدینہ کی وبا ایک پریشان مو کالی عورت کی صورت میں نظر آئی۔ خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ کے علم کو دودھ کی اور ان کی دینداری کو لمبی قمیص کی شکل میں دیکھا۔[1] ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادّہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسّم شکلیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی، دریا اور سمندر نظر آئیں گے۔ اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی کالی صورتیں نظر آئیں گی۔ اسی طرح دوسرے تغیّراتِ خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسّم اور متشکّل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔[2]

اسی طرح اعمال جو جسم مادّی سے بالکل الگ ہیں خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسّم ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی بھائی کا حق واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے۔ اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مُردار کھا رہا ہے۔ سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اژدھا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے۔ ذلّت اور خواری کتّے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ شبِ معراج میں آنحضرتؐ کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی۔ اسی طرح کہن سال دُنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی۔

اسی قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں۔ مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا:

---

[1] ان خوابوں کو صحیح بخاری، کتاب التعبیر میں دیکھو۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہؒ ذکر برزخ۔

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ

(الحجرات : ۱۲)

اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بُرا نہ کہے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے۔ سو گھن آئی تم کو۔

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ

(البقرۃ : ۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے دیا نہیں اٹھتے، لیکن جیسے وہ اُٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیئے ہوں۔

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝

(النسآء : ۱۰)

وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور آگے جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے۔

وہ خود غرض لوگ جو بے کسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے دردِ گرسنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ) بھی اُن کے کھانے کو نہیں دیتے، دوزخ میں اُن کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا۔ فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ	بے شک وہ خدائے بزرگ پر ایمان
الْعَظِيْمِ ۙ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى	نہیں رکھتا تھا اور مسکین کے کھانے پر
طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَلَيْسَ	آمادہ نہیں کرتا تھا۔ تو آج اس کا بھی یہاں
لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۙ	کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے
وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۙ	دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے اور
لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ۝	اس کو وہی گنہگار کھائیں گے۔

(الحاقۃ : ۳۳-۳۷)

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز شاداب باغ سے دی:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا	کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ	کی مضبوطی کے لئے خرچ کرتے ہیں
بِرَبْوَةٍ	ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ

(البقرۃ : ۲۶۵) پر ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مرنے والوں کو جانِ نو اور حیات جاوداں کی خوشخبری دی گئی۔ فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ	جو خدا کی راہ میں مارا جائے اور اس
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ	کو مُردہ نہ کہو وہ لوگ زندہ ہیں۔

(البقرۃ : ۱۵۴)

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا۔ خدا اس کو بڑھا کر دے گا۔ جو دوسروں کو

معاف کرے گا خدا اُس کو معاف کرے گا۔ جو دوسروں کی عیب پوشی کرے گا خدا اس کی ستاری کرے گا۔ قرآن واحادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا و سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے، اُن کی نسبت فرمایا:

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ	جس مال کا بخل کیا تھا۔ قیامت میں اس کا اُن کے گلے میں طوق پڑے گا۔

(آل عمران : ۱۸۰)

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝	جس دن اُس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے اُن کی پیشانیاں اور پہلو داغ دیئے جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے گاڑ رکھا تھا۔ تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔

(التوبۃ : ۳۵)

دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نورِ بصیرت سے رُوگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا خدا اُس کو وہاں بھلائے گا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ	اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لئے ہے تنگ گذارن اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا میرے پروردگار

بَصِيْرًا ○ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ○

(طٰہٰ : ۱۲۴-۱۲۶)

تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ خدا کہے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو اُن کو تُو نے بھلا دیا اور اُسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے:

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ○

(بنی اسرائیل : ۷۲)

جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا، وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے، جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا۔ یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا:۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من اتاه الله مالا فلم يؤد زكوته مثل له ماله شجاعًا اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيمة ياخذ بلهزمتيه اى شدقيه فيقول انا مالك انا كنزك۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اُس نے اُس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اُس کا مال اس کو اُچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا۔ جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا۔ اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے۔ وہ اس

(صحیح بخاری تفسیر ال عمران جلد دوم)

کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا
اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا
اور کہے گا میں ہوں تیرا مال میں ہوں۔
تیرا خزانہ۔

اسی طرح وہ حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز و روزہ وغیرہ اعمال، عذاب سے بچنے کے لئے ڈھال بن کر داہنے بائیں سے نمودار ہوں گے[1]۔ یہ بھی حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتۂ الٰہی مُردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے (مثّلت الشمس عند غروبھا) نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے[2]۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں، بلکہ اس کی تمثیل ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے۔ یعنی یہ کہ اُس مُردہ کو ایسا نظر آتا ہے اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں | اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسّم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت اُن اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابیؓ نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے لئے ایک نہر بہ رہی ہے۔ اور جب اُس کا ذکر آنحضرتؐ سے کیا تو آپؐ نے اُس کی تعبیر میں فرمایا:

---

[1] مسند ابن حنبل۔ [2] سنن ابن ماجہ ذکر القبر۔

ذٰلك عمله۔ یہ نہران کا (نیک) عمل ہے۔

(صحیح بخاری کتاب التعبیر)

آنحضرتؐ کی ایک رویائے صادقہ میں مختلف گناہوں کی مختلف تمثیلی سزاؤں کے مناظر

اس تمہید کے بعد آنحضرتؐ کی اس رویائے صادقہ پر غور کرو جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں، بلکہ برزخ ہی کا مرقّع پیش کرتا ہے، جواب بھی قائم ہے۔ آپؐ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا۔ میں اُن کے ساتھ چل کھڑا ہوا، تو میں نے دیکھا کہ

(۱) ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اُس کے سر پر ایک بڑا پتھر لئے کھڑا ہے۔ اور وہ اس پتھر کو اُس کے سر پر اِس طرح دے مارتا ہے کہ اُس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے۔ وہ اُس کے پیچھے جا کر اُس کو اُٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے، اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے۔ ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ

(۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لئے کھڑا ہے۔ اور وہ اُس سے اُس کے جبڑے کو، پھر نتھنے کو اور پھر آنکھوں کو گدّی تک چیر ڈالتا ہے۔ پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ

(۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورتیں اس میں ننگے پڑے ہیں۔ اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں اور وہ چیختے ہیں۔ آگے بڑھے تو نظر آیا کہ

(۴) ایک خون کی سُرخ نہر بہ رہی ہے اور ایک آدمی اُس میں تیر رہا ہے۔ نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے، جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اُس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اُٹھا کر اِس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اُس کے منہ میں

جاکر پیٹ میں اُتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر کلی کھِل رہی تھی۔ باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچّے تھے۔ آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمرائیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا، جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی۔ ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے، دروازہ کھلوایا۔ دروازہ کھُلا تو اس کے اندر گھسے تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا۔ میرے ہمراہیوں نے اُن سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف و شفاف بہ رہی تھی، اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جاکر غوطہ لگاؤ۔ وہ غوطہ لگا کر آئے، تو اُن کی بدصورتی کا حصّہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے۔ میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنّت عدن ہے اور وہ آپؐ کا دولت خانہ ہے۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ سپید لکّہ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا، وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صُبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے۔ اور دوسرا شخص جس کے گلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں، وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دُنیا میں اُس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں، وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا اور منہ سے پتھر نگلتا تھا، وہ سود خوار ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپؐ نے دیکھا وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے گرد

جو بچے تھے، وہ ننھے اور کمسن بچے تھے جو فطرت پر مرے تھے۔ کسی صحابیؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی، اور وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا، وہ ہیں جنہوں نے کچھ اچھے کام بھی کئے تھے تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیئے۔[1]"

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اُن کی نوعیت اور کیفیت اُن کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے۔ نمازِ صبح سے غافل ہو کر بالینِ راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا گلپھڑا پھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا، اپنا دوبالشت کا پیٹ بھرنے کے لئے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا۔ سراسر اُن کے دنیاوی اعمال کی تمثیل و تصویر ہے اور آخر میں نصف حُسنِ عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوءِ عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے۔ اور صاف و شفاف نہر کی صورت میں رحمت و مغفرتِ الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔[2]

علم النفس سے انسان کی لاعلمی ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے۔ وہ نفس سے باہر آفاقی یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادّی دنیا کی اشیاء کے خواص و صفات کے جاننے میں کی ہے۔ جن سے سائنس کی ایجادات و اختراعات کا تعلق ہے۔ لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے، جس کو قرآن نے اَنْفُسٌ کہا ہے۔ ان النفس یا ارواح کے اوصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے۔ ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اور اسپرچولزم (علم ارواح) ابھی طلسم و فریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹفک تجربے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر ملخصاً [2] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ۔ ذکر واقعاتِ حشر۔

بہر حال ابھی تک علمِ نفس و روح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اس کے خارجی وجود میں تعلق ہے؟ ایک معمّا ہے۔ بہت سے ہندو اہلِ فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے۔

تصوری یقین اور خارجی وجود کا باہمی تعلق

بہر حال نفسِ انسانی کے اندرونی قویٰ کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاجِ تکمیل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوّری یقین اور خارجی وجود میں بہت ہی شدید تعلّق ہے۔ مسمریزم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے، اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآن میں یقین کی دو قسمیں

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں۔ علم الیقین اور عین الیقین۔ کسی شے کی دلیلیں سُن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کر لو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے۔ اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک و شُبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے۔ قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۂ تکاثر میں بیان کیا ہے:۔

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ	تم کو دولت و نعمت کی بہتات نے
الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝	غفلت میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ تم
ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝	نے قبروں کو جا دیکھا۔ ابھی نہیں، تم آگے
كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝	جان لوگے۔ پھر ابھی نہیں! تم آگے جان
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا	لوگے، ہرگز نہیں اگر تم یقین کا جاننا

عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ

(التکاثر: ۱-۷)

جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے۔ پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لو گے۔

بنا بریں اگر انسان اپنے اندر علم الیقین حاصل کر لے جو کمالِ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۙ

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ

نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علمِ یقین ہو تو دوزخ کو بے شبہ دیکھ لو گے۔

(التکاثر: ۵-۶)

کفّار آنحضرتؐ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے۔ وحیِ الٰہی نے اس کے جواب میں کہا:

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۙ

(العنکبوت: ۵۴)

وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعمِ خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں، اس کے جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝

اور ان میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے جہاد میں عدم شرکت کی اجازت دے دیجیے اور آزمائش میں نہ ڈالیے۔ ہاں! وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور

(التوبۃ : ۴۹)　　دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے۔ ہر شخص اُس سے اِس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا۔ بلکہ بہتیرے اُس کے منکر ہیں۔ اس لئے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اِس وقت نظر نہیں آتی۔ لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے۔ جب وہ آئے گی تو مادّہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے، اُٹھ جائے گا۔ اس وقت اس عالمِ غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب و عذاب اور جنّت و دوزخ کے بعض مناظر اُن کے سامنے آجائیں گے۔ اور اُس وقت اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کر لیں گے:

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝　　پھر تم دوزخ کو عین الیقین سے دیکھ

(التکاثر: ۷)　　لوگے۔

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا۔ جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا۔ وہ علمِ حقیقی اور یقینِ تحقیقی کا دن ہوگا۔ قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ　　اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے

الْوَعِيْدِ ۝ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔　　ڈر کا دن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ہم

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فَكَشَفْنَا عَنْكَ　　نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج

غِطَاۗءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝　　تیری نگاہ تیز ہے۔

(قٓ : ۲۰، ۲۲)

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے

آجائیں گے اور دوزخ منظرِ عام پر آجائے گی۔ فرمایا۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝ (النازعٰت: ۳۴-۳۶)

جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا، جس دِن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آجائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔

احوال برزخ کا عین الیقین ایک عرب شاعر (ابوالعتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے ؎

الموت باب وکل الناس یدخلہ ۔۔۔ یلیت شعری بعد الباب ما الدار

موت ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے۔

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اُس کو پسِ پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہو جائے گا، اور وہی برزخ کا عالم ہے۔ فرمایا:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝

جب ان گناہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ (زندگی کے پسِ پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر) کہتا ہے اے میرے پروردگار! مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو ماحول چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام

(المومنون: ۹۹- ۱۰۰)

کردوں۔ ہرگز نہیں۔ یہ بات ہی بات ہے۔ جو وہ کہتا ہے اور (اب) ان گناہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آجاتی۔ تو اس کا شک و شبہ دفعتاً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے۔ فرمایا:

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ط ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ○

(قٓ: ۱۹)

اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آگئی۔ یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت "حقیقت" کا کوئی منظر سامنے ضرور آجاتا ہے۔ اہلِ تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے۔ ابنِ جریر طبری لکھتے ہیں:

بالحق من امر الاٰخرة فبينة للانسان حتى تثبته و عرفه[1]

حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان اس کو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔

حافظ ابنِ کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يقول عز وجل وَجَآءَتْ ايها

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان

---

[1] تفسیر ابنِ جریر طبری بست و ششم۔

الانسان سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ط — "موت کی بے ہوشی حق کو لے کر آگئی"۔

ای کشفته لك عن اليقين الذی كنت تمتری فيه[1] — یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا جس میں تو شک کرتا تھا۔

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے:

ومعنی بالحق انه عند الموت يتضح له الحق ويظهر له صدق ما جاءت به الرسل من الاخبار بالبعث والوعد والوعيد — اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے اور پیغمبر جس قیامت اور جزا و سزا کی خبریں لے کر آئے تھے ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے:

والمعنی احضرت سكرة الموت حقيقة الامر الذی نطقت به كتب الله تعالیٰ ورسله عليهم السلام — اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقتِ امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشّاف) اور ابو حیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحرِ محیط) میں بھی یہی ہے۔ یہ مفسّرین مختلف فرقوں سے تعلّق رکھتے ہیں۔ لیکن ان سب کی متّفقہ تفسیر یہی ہے۔ اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

---

[1] تفسیر ابنِ کثیر بر فتح البیان، جلد نہم۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ○ (قٓ : ۲۲)

ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشافِ تام ہو جاتا ہے۔ لیکن بہرحال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت

موت کے لئے قرآن میں اکثر "خدا کی طرف بازگشت" یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے:

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (الجمعۃ : ۸)

کہہ دو بے شک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے۔ پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے۔ تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○ (البقرۃ : ۱۵۶)

ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا (المائدۃ : ۱۰۵)

تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہ طرزِ ادا بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع، بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام ارواحِ انسانی یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں۔ اور موت کے وقت اس عناصر

سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے۔ جہاں سے آئی تھیں۔ اِس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا۔ جو اس دنیائے دارالعمل میں انہوں نے کمایا ہے۔ یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو ان کی زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی:

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

(الانعام: ۶۰)

اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کما چکے، اُس کو جانتا ہے۔ پھر تم کو دن میں جگا اُٹھاتا ہے تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو۔ پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔

ایک اور آیت میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

(یونس: ۲۳)

اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے۔ دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آجانے کی اطلاع دی

ہے اور اہل تفسیر نے بھی اس رجوع اِلی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں[1]۔

اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے۔ گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں ویسے ہی گناہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں۔

فرمایا:

كَلَّآ إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَ	ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسلی) تک
قِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ وَظَنَّ أَنَّهُ	آ پہنچے اور لوگ کہیں، اب کون ہے۔
الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ	جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا اور سمجھا کہ
بِالسَّاقِ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ	اب جدائی کا وقت آگیا اور پنڈلی سے
الْمَسَاقُ ۝	پنڈلی لپٹ گئی۔ اس دن تیرے
(القیٰمۃ: ۲۶-۳۰)	پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي	اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے
إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝	خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو
(الفجر: ۲۷-۲۸)	اپنی مالک کے پاس واپس چلی جا۔

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی دلکش واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں | وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے

---

[1] تاریخ طبری ج یازدہم۔

کتنا دردناک ہے۔ اُس وقت سے اُس کی زندگی صرف اُس کے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ہر عمل کی صورت اُس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ	اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار موت
غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	کی بیہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے
بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا	ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے)
اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ	اپنی روحوں کو آج تم کو اس ذلت کی
عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ	سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ
تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ	باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے
وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝	ماننے سے غرور کرتے تھے۔ اور تم ایک
وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا	ایک کرکے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار
خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ	تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے
مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ	اور جو سامان و اسباب تم کو دیا تھا،
(الانعام: ۹۳-۹۴)	جس نے تم کو مغرور بنایا تھا، اُس کو اپنے
	پیچھے چھوڑ آئے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے، اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا	اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں

الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

کی جان لیتے ہیں۔ اُن کے مُنہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے۔ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

(الانفال: ۵۰-۵۱)

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا۔ بلکہ وہ درحقیقت قانونِ عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے۔ اُن کو ہر طرف سے بشارتیں سُنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے:

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۝ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝

پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو۔ تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلٹا دیتے ہو اگر تم (اپنے انکار و تکذیب میں)

فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْحَقُّ الْيَقِيْنِ ۝

(الواقعة : ۸۳-۹۵)

سچے ہو۔ تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہوا تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ (اس سے کچھ کم درجہ) داہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی داہنے والوں میں سے! اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو گرم پانی کی دعوت اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالمِ برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب و راحت | اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بُری روحوں کی رُوبرُو عذاب کے منظر گذرتے ہیں۔ قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں، جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گذرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے۔ منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝

(التوبة : ۱۰۱)

ہم ان کو دو دفعہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عَذَابٍ عَظِيْمٍ سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے۔ اب اس عذابِ دوزخ

سے پہلے عذاب کے دو دور اُن پر گذر چکے ہوں گے۔ ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے۔ قرآن میں آلِ فرعون کے ذکر میں ہے:

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ	اور فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب
الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ	اُلٹ پڑا۔ آگ کہ اُس پر وہ صبح اور
عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ	شام پیش کیئے جاتے ہیں اور جس دن
تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۖ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ	قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (ندا ہوگی
فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝	کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھ
(المومن: ۴۵-۴۰)	کر عذاب میں ڈالو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھایا جاتا ہے ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ "تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ اہلِ جنّت میں سے ہوتا ہے تو جنّت اور اہلِ دوزخ سے ہوتا ہے، تو دوزخ۔ پھر اُس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام اس وقت تک کے لئے کہ جب تو قیامت کے دن اُٹھایا جائے۔"[1] ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنّتی مُردہ کے سامنے جنّت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا مگر تیرے نیک عمل کے سبب اب یہ جنّت تیرا مقام ہے[2] اور اس دن تک کے لئے کہ لوگ

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنۃ و النار باب عرضِ مقعد المیت جلد دوم و جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر حدیث حسن صحیح و صحیح البخاری کتاب الجنائز باب عذاب القبر و سکرات الموت [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

اٹھائے جائیں۔ اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے[1]

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الٰہی سچ ہے تو ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے اُس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے۔ اس لئے ارشاد ہے:

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۝

(الفرقان: ۲۲-۲۶)

جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گناہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں۔ اور کہیں گے کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آرہا ہے، اب اوٹ میں روکا جائے اور ہم (خدا فرماتا ہے) ان کے کئے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور اُن کو اُڑتا غبار بنا دیا (یعنی بے کار و بے سود و معدوم) جنّت والے لوگ (یعنی جن کو جنّت ملنے والی ہے) اس دن ان کے لئے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا۔ اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اُتارے جائیں گے۔ اس دن رات راج سچّا خدا کا ہوگا اور وہ

---

[1] صحیح مسلم باب عرض مقعد المیت۔

دن کافروں پر سخت ہوگا۔

کتنی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا اور فرشتوں کا اُترنا قیامت کا نقشہ ہے۔ اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گناہگاروں کے لئے کوئی خوش خبری نہیں اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرارگاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خواب گاہ ملی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورۂ محمدؐ میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گناہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ فرمایا:

فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ	پھر کیا حال ہوگا۔ جب فرشتے ان کو وفات
يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ۝	دیں گے اُن کے چہروں اور ان کی پیٹھوں
ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ	پر مارتے ہوئے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے
اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ	اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش
أَعْمَالَهُمْ ۝	کر دیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند
(محمد: ۲۷-۲۸)	نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادّی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیے بہرحال اس سے یہ ثابت ہے کہ گناہگار مُردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔

سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے:

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي	اور اگر تو دیکھے جب گناہگار موت کی

غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ

سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو (اپنے جسم کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔

(الانعام : ۹۳)

اَلْيَوْمِ جس کے معنی آج کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں۔ اس "آج" سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو چوبیس گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے[1]۔

قوم نوح کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا ذکر ہے:

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝

وہ ڈبو دیئے گئے۔ پھر وہ آگ میں داخل کئے گئے تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔

(نوح : ۲۵)

حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے:

وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝

اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔

(التحریم : ۱۰)

---

[1] دیکھو فتح القدیر شوکانی و تفسیر ابوالسعود و تفسیر روح المعانی آلوسی۔

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔

سورہ یٰسین میں ایک خیر خواہِ قوم کا ذکر ہے، جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا۔ مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزّت بخشی تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزّت سے سرفراز ہوتی:

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ط قَالَ	کہا گیا جنّت میں داخل ہو۔ اس نے کہا
يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا	اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ
غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ	میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور
الْمُكْرَمِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا	مجھے عزّت والوں میں سے بنایا اور ہم نے
عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ	اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان
جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا	سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم
مُنْزِلِيْنَ ۝	اُتارا کرتے ہیں۔

(یٰسٓ: ۲۶-۲۸)

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے:

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ	بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس
يُرْزَقُوْنَ ۝	روزی پاتے ہیں۔

(اٰل عمرٰن: ۱۶۹)

اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنّت کی روزی ملتی ہے۔

اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنّت کی خوشخبری سناتے ہیں۔ فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○	جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنّت میں چلے جاؤ۔

(النحل : ۳۲)

قبر کی اصطلاح سطورِ بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیثِ صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں، وہ عموماً[1] قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ لیکن اس لفظ "قبر" سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مُردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں۔ بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں۔ اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے۔ مادّی عناصر کی نہیں۔ اسی لئے قرآن نے اس عالم کے تعلّق سے ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے اور ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے۔ اُس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنّیٰ ہوتا ہے۔ تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے۔ مگر

---

[1] بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔ یہ غلط فہمی ان کو اس لئے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر وقبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں، لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواحِ انسانی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر موجود ہے تو انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اسی قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں۔

تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے۔ اس خواب میں جس طرح تمہارے مادّی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے اور جو ہو بہو تمہارا مادّی جسم ہے، اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا، جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اِس خاکی جسم کے مطابق ہوگا[1] اور تمہاری روح اسی جسمِ مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روحِ انسانی ہے، جسم خاکی نہیں۔ فرمایا۔ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ[2] (یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی۔) اس لئے اصل مکلّف روح ہے، جسم نہیں۔ جسم بمنزلہ آلہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا۔ برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادّہ و مادّیات سے پاک و بری ہوگا۔ تاہم اس کو اپنے جسمِ خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے۔ کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مُردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں۔ قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ	اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں
كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ	کی روح قبض کرتے ہیں۔ مارتے ہیں
وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَ	ان کے مُنہ اور پیٹھ پر اور (کہتے ہیں)

---

[1] اس سے اس شُبہہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مُردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے۔ لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب و ثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔ [2] المدثر: ۳۸۔

ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○ چکھو جلنے کا مزہ۔

(الانفال : ۵۰)

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنا ہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ماران کے مُنہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے۔ مگر یہ مُنہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (مُنہ پر) اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں۔ اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو۔ یہی مفہوم، صاف لفظوں میں، اس آیت میں ہے:

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ○ اُس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہنکایا جانا۔

(القیمۃ : ۳۰)

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس برزخ میں جسم خاکی کی شکل وصورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومنِ کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنّت میں اڑتی پھرتی ہے[1]۔ اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں اُن کا آشیانہ ہوں گی۔ اسی طرح دوزخ وبہشت کے متعلق آنحضرتؐ کی جو رویائے صادقہ پہلے گذر چکی ہے۔ اس میں جن جسمانی قالبوں میں گناہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، وہ تمام تر مثالی ہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مومن، سعید اور شہداء کے وہ مثالی قالب اور گناہگاروں کے یہ مثالی

---

[1] سنن ابنِ ماجہ کتاب الجنائز۔

اجسام اُن کے وہ قالب اور جسم نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں سڑ گل کر فنا ہو گئے یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرّے ہوا میں اُڑ کر منتشر ہو گئے یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اُس کا جزوِ بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرتؐ سے ان مٹّی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادّی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مُردوں کو گاڑتی ہیں۔ اس میّت کی یادگار اس دنیا میں اُس کے اُس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے، جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیّت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اُڑا دی جائے، تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے۔ مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو مجسّم کر کے کھڑا کر دیا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔[1]

سوال و جواب | احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مُردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔

اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف
طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ	حالت میں وفات دیتے ہیں، کہتے ہیں
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ	کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے
تَعْمَلُوْنَ ۝	کے بدلہ جنّت میں چلے جاؤ۔

(النحل: ۳۲)

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم، کتاب الرقائق باب الخوف من اللہ۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۖ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ

(النسآء : ٩٧)

بے شک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں۔ تم کس بات میں تھے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے۔ وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔

ایک اور آیت ہے:

حَتّٰٓى إِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوٓا أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلٰٓى أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ۝ قَالَ ادْخُلُوا فِيٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ ۖ

(الاعراف : ٣٧-٣٨)

یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے، کہاں ہے وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے۔ تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن و انس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے۔ کہ اُن سے اُن کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا۔ بہرحال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا۔ اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی توحید و رسالت کی معرفت کا اُن سے سوال ہوگا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمۂ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمۂ توحید) اور کلمۂ خبیثہ (بُری بات یعنی کلمۂ کفر) کی ایک ایک مثال ہے۔ کلمۂ طیبہ کی مثال اُس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں۔ اُس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں اور اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑ زمین سے اُکھڑی پڑی ہے اور وہ اب گرا اور تب گرا۔ اس کے بعد قرآن میں ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ	اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس
الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ	دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی
فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ	اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔

(ابراھیم: ۲۷)

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا، وہاں وہ بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔

ہر چند کہ رسول پاکؐ کی صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں تاہم تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی "قولِ ثابت" پر ثابت

قدم رکھے۔ جانے کی بشارت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ کشفِ راز کا دن ہے۔ اُس دن تو کافر بھی اس قولِ ثابت سے پلٹنے کی جراءت نہیں کر سکتا۔ پھر یہ اہلِ ایمان کے لئے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے۔ البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اُس حصّہ میں موضوع ہو سکتا ہے جہاں ہنوز اسرارِ پسِ پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی اور وہ برزخ کا عالم ہے۔

اس آیت پاک کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعتِ مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔

حقیقت میں اس عالم برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا۔ بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیتِ اقرار و انکار کی مثال ہوگی یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواحِ انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدّد آیتوں میں ملتا ہے۔ سب سے پہلی آیت تو ان مذکورۂ بالا آیات کے بعد جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں۔ اس کے بعد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا	بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو
وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ	جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا

لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِىْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ

(الاعراف : ۴۰)

ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔ یعنی کبھی نہیں

اس سے معلوم ہُوا کہ آیاتِ الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کی حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی اور وہ فضائے زمیں میں آوارہ پھریں گی یا اپنے خاکی جسموں کے لگاؤ سے جہاں وہ سپردِ خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاک باز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمتِ الٰہی کا فرشتہ، بلکہ خود زبانِ رحمت اس کے کانوں میں یہ صدا دیتی ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۝ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۝

(الفجر : ۲۷ — ۳۰)

اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جا! تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش۔ تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

ان سے بڑھ کر وہ پاک باز روحیں ہیں، جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ

جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مُردہ

سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○

نہ کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔

(البقرۃ: ۱۵۴)

یہ پُرمسرت زندگی کیسی ہوگی۔ اس کی تفصیل دوسری صورت میں ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے، مُردہ نہ گمان کر، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ ان کو روزی دی جاتی ہے۔ خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے، اس پر خوش ہیں۔ اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں، ان کی طرف سے بھی خوش ہیں کہ اُن کو نہ کوئی خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں۔ اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

(آل عمران: ۱۶۹ - ۱۷۱)

یہ پُرمسرت زندگی شہداء کو ملے گی۔ اس زندگی کا مقام "خدا کے پاس" بتایا گیا ہے۔ احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنّت کی سیر کرتی ہیں اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں۔ اس کے بعد

غالباً ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیاءؑ کے روحانی مدارج و مراتب شُہداء سے بہرحال اعلیٰ و برتر ہیں۔ اس لئے ان کا مقام بھی اسی احاطۂ قدس کے اندر ہوگا۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے سیرِ معراج اور اپنی رویائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔

بعض وہ سعید روحیں ہیں، جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالمِ ملکوت میں اُڑ رہے تھے۔ عالمِ برزخ کے یہ دو اُڑانے والے بازو درحقیقت اُن کے اُن دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں، جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے اور وہ اس پر بھی اسلام کے عَلَم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے۔ عجیب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ	بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا
ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ	پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے
الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا	اُن پر فرشتے یہ خوشخبری لے کر اُترتے
تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ	ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور
الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ	اُس جنّت کی بشارت سنو، جس کا تم
اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا	سے وعدہ کیا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی میں
وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ	تمہارے رفیق ہیں اور آخرت
(حٰمٓ السجدۃ: ۳۰-۳۱)	میں بھی۔

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے۔

آخرت کی دُوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے ایک مرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے۔ قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لئے جگہ خالی کر جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے، اور اب تک چل رہا ہے۔ کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے اور اس محفل کی جو رونق اوّل روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے۔ غرض ؏

ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

کیا کبھی دنیائے حیات پر بھی موت طاری ہو گی؟

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائے گی۔ کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان و زمین کے کُرے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے۔ اور پھر وہ خلّاقِ عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہو گا۔

نظامِ کائنات کی بربادی کی پیشین گوئی اہل سائنس کی طرف سے

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب

اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہو گی۔ سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کُرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹس) کو ہو سکتا ہے۔ اہلِ فلسفہ کا بڑا گروہ اس امکان پر یقین رکھتا ہے اور اہلِ سائنس بھی اس کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبیعیات و ہیئت جدیدہ کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں۔ وہ اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ گرم آفتاب ہے جس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ آخر ایک دن آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچتے چلے آتے ہیں۔ تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب باہمی توازن باقی نہیں رہے گا۔ اس وقت تمام کرّے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں۔ ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسبابِ طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

قیامت کا عقیدہ مختلف آسمانی کتابوں میں

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے۔ اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے۔ تورات میں اس

کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ زبور میں اس کی تصریحات ہیں اور اُس میں اِس کو "عدالت کا دن" کہا گیا ہے[1]۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے۔ ایک صدوقی جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا اور قیامت کا منکر تھا۔ مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا، بدستور اپنے پرانے عقیدے[2] پر قائم تھا۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں جو یہودی تھے وہ قیامت، حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو دوسری پر زمینوں کو، تیسری پر درختوں کو، چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا۔ اور ندا آئے گی کہ "میں ہوں بادشاہ"[3]۔ انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صدوقیوں کے مقابلہ میں توریت کی ایک آیت سے حیاتِ اُخروی کا ثبوت پیش کیا ہے[4] اور مکاشفاتِ یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے۔ ہندو پرلے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام قرآن میں کسی شے کی حقیقت کی اوّلین گرہ کشائی، اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے۔ قرآنِ پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے۔ قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے وہ یوم الدین ہے یعنی جزا کا دن جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جا بجا آئے ہیں:

---

[1] زبور ۹-۱۶-۱۷ و ۲۲، ۱، ۲ و باب ۴۹ و ۵۰ [2] انجیل مرقس ۱۲/۲۴ و اعمال ۲۳۔ [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ زمر۔
[4] متی ۲۲-۳۱، ۳۲ و لوقا ۲۰، ۲۷ و مرقس ۱۲-۱۸۔

السَّاعَةُ	وہ گھڑی (وہ مقرّر وقت)
يَوْمُ الْقِيٰمَةِ	کھڑے ہونے کا دن (مُردوں کے کھڑے ہونے کا دن)
اَلْيَوْمُ الْحَقُّ	سچّا دن (نہ جس کے آنے میں کوئی شک ہے اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)
يَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ	جانا ہوا دن یا مقرّرہ دن
اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ	جانا ہوا وقت یا مقرّرہ وقت
اَلْيَوْمُ الْمَوْعُوْدُ	موعودہ دن
اَلْيَوْمُ الْاٰخِرُ	پچھلا دن
يَوْمَ الْاٰزِفَةِ	قریب آنے والی مصیبت کا دن
يَوْمٌ عَسِيْرٌ	ایک سخت دن
يَوْمٌ عَظِيْمٌ	ایک بڑا دن
يَوْمٌ عَصِيْبٌ	سخت دن
يَوْمُ الْبَعْثِ	جی اُٹھنے کا دن
يَوْمُ التَّغَابُنِ	افسوس کا دن
يَوْمُ التَّلَاقِ	باہم ملنے کا دن
يَوْمُ التَّنَادِ	پکار کا دن
يَوْمُ الْجَمْعِ	اکٹھے ہونے کا دن
يَوْمُ الْحِسَابِ	حساب کا دن

يَوْمُ الْحَسْرَةِ	حسرت کا دن
يَوْمُ الْخُرُوْجِ	قبروں سے نکلنے کا دن
يَوْمُ الْفَصْلِ	فیصلہ کا دن
اَلْقَارِعَةُ	کھڑکھڑانے والی
اَلْغَاشِيَةُ	چھا جانے والی
اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى	بڑی مصیبت
اَلنَّبَأُ الْعَظِيْمُ	بڑی خبر
اَلْحَآقَّةُ	ضرور آنے والی گھڑی
اَلْوَعْدُ	وعدہ
اَلْوَاقِعَةُ	وقوع پذیر
اَمْرُ اللّٰهِ	خدا کی بات
اَلصَّآخَّةُ	بہرا کرنے والی گھڑی

قیامت کے اوصاف یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں۔ ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں مثلاً

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ	جس دن نرسنگھا پھونکا جائے گا۔
(الانعام: ۷۳، النمل: ۸۷، طٰہٰ: ۱۰۲)	
يَوْمَ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ	جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام
(المائدۃ: ۱۱۹)	آوے گی۔
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝	جس دن نہ مال کام آئے گا، نہ

٢

(الشعراء : ٨٨) اولاد۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (الفرقان : ٢٧) جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ۔ (الفرقان : ٢٥) اور جس دن آسمان پھٹے گا۔

وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ○ (المومن : ٥١) جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔

لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ (آل عمران : ٢٥) جس دن میں کوئی شک نہیں۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا (النمل : ٨٣) جس دن ہم ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔

يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (المطففين : ٦) جس دن لوگ جہاں کے پروردگار کے لئے کھڑے ہوں گے۔

يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ (القمر : ٧) (جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ○ وَ اُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ○ (عبس : ٣٤-٣٦) جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام

(البقرۃ: ۴۸) نہ آئے گا۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ (النور: ۲۴) جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ط (الانفطار: ۱۹) جس دن کوئی دوسرے کے لئے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔

يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا (الدخان: ۴۱) جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کئے گئے ہیں جن سے اس عظیم الشّان دن میں انسان کی بیکسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا قیامت کے متعلق بعض متکلّمین کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ وہ مادّہ کے فنائے محض یا عدمِ محض کا نام ہے۔ حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمامتر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا۔

اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ (متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ ط والی۔ اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ متنبہ کرنے والی۔ یہ وہ دن ہے جب

الْمَبْثُوْثِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور

كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝

(القارعة : ١-٥)

پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ۝
وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ۝
وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۚ۝ يَوْمَئِذٍ
تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ۝

(الزلزال : ١-٤)

جب زمین خوب ہلائی جائے گی۔ اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی۔ اور انسان کہے گا زمین کو کیا ہوا؟ اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ۝ وَ اَذِنَتْ
لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ۝ وَ اِذَا الْاَرْضُ
مُدَّتْ ۙ۝ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ
تَخَلَّتْ ۙ۝

(الانشقاق : ١-٤)

جب آسمان پھٹ جائیں گے۔ اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری کے لائق ہیں۔ جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اس کو ڈال دی گی اور خالی ہو جائے گی۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ۝ وَ اِذَا
الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ۝ وَ اِذَا
الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ۝ وَ اِذَا الْقُبُوْرُ
بُعْثِرَتْ ۙ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا
قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ؕ۝

(الانفطار : ١-٥)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیئے جائیں گے۔ اُس وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اُس کو جان لے گی۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۖ۝ وَ اِذَا

جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا جب

النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝

ستارے تاریک ہو جائیں گے۔ جب پہاڑ چلائے جائیں گے

(التکویر: ۱-۳)

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝

جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والا ہے۔ جب ستارے ماند کر دیئے جائیں گے اور جب آسمان کھول دیا جائیگا اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔

(المرسلٰت: ۷-۱۰)

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝

جب نگاہ ماند ہو جائے گی۔ جب ماہتاب بے نور ہو جائے گا اور آفتاب و ماہتاب اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔

(القیٰمۃ: ۷-۹)

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝

جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔

(المعارج: ۸-۹)

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ

جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اُس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اُس دن کمزور

وَّاهِيَةٌ ۙ○

ہوجائے گا۔

(الحاقة: ۱۳-۱۶)

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ

وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ○

جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا اور پہاڑ بکھلا ہوا تانبا ہو جائیں گے.....

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا

يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۖ○

کیونکر متّقی ہو سکتے ہو جب اس دن کا انکار کرتے ہو جو بچّوں کو بوڑھا بنا دے گا۔

السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ ۢبِهٖ ؕ كَانَ

وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ○

آسمان اُس دن پھٹ جائے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

(المزمل: ۱۴-۱۸)

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ

الْاَرْضِ

جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔

(ابراھیم: ۴۸)

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ

وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ○

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے

(الرحمٰن: ۳۷)

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ○ لَيْسَ

لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ○ خَافِضَةٌ

رَّافِعَةٌ ○ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ

رَجًّا ۙ○ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ○

جب ہونے والی بات ہو جائے گی جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے۔ زیر و زبر کر دینے والی جب زمین خوب ملائی جائے گی، اور پہاڑ پراگندہ کئے جائیں گے

فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝ (الواقعة : ۱-۶)

اس وقت وہ پریشان ذرّات کی طرح ہو جائیں گے۔

وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝ (النبا : ۱۹-۲۰)

اور آسمان کھول دیئے جائیں گے تو وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو جائیں گے۔

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظامِ عالم کی درہمی اور دنیا کی حیاتِ موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ (ابراھیم : ۴۸)

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔ اور آسمان بھی بدل جائیں گے۔ اور سب لوگ اس ایک، سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔

قیامت کی حقیقت اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گوناگوں طریقوں سے کیا گیا ہے تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے :-

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ
اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ
عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى
اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ بَلْ يُرِيْدُ
الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝
يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝
فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ
الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَ
الْقَمَرُ ۝ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ
يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا
لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ
نِ الْمُسْتَقَرُّ ۝ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ
يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝
بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ
بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى
مَعَاذِيْرَهٗ ۝

(القیٰمة: ۱-۱۵)

میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے
والے نفس کی قسم کھاتا ہوں کیا (انسان) سمجھتا
ہے کہ ہم (اس کے مرنے کے بعد) اس کی
ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے۔ کیوں نہیں۔ ہم تو
اس کے پوروں کو درست کر سکتے ہیں۔ یہ
نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا
یہ ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے۔
پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو
جب نگاہ چندھیانے لگے اور چاند بے نور
ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دیئے
جائیں۔ انسان اُس دن کہے گا کہ اب کہاں
ہے بھاگنے کی جگہ۔ ہرگز نہیں۔ کہیں بچاؤ
نہیں۔ اس دن تیرے رب کے پاس
ہے جا ٹھہرنا۔ اُس دن انسان کو جو اُس نے
آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و
دولت) وہ بتایا جائے گا۔ بلکہ انسان اپنے
حال کو آپ دیکھتا ہے۔ اگرچہ وہ زبان
سے بہانے تراشا کرے۔

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت اور نفس لوّامہ کی یکے بعد دیگرے

قسم کھائی ہے۔ نفس لوّامہ یعنی ملامت کرنے والے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو اس کے ہر بُرے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے۔ اور اُس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے۔ آخری آیت میں اسی کیفیتِ ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا "بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے اگرچہ وہ زبان سے اپنی بُرائیوں اور کوتاہیوں کے لئے سیکڑوں بہانے تراشا کرے"۔ انسان کی اِسی قلبی کیفیت کا نام نفسِ لوّامہ ہے۔

(۱) اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے۔ جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گنہگار ہوتا ہے، نیکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نیکو نام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوّت حاصل کرتا ہے اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے، پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اُس کے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے، بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں۔ وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گناہگار ہوتی ہیں، نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر اُن کے عملی قویٰ کمزور و مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں۔

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر آج موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں کیا اسی اصول پر تمام اقوامِ عالم کا یہ مجموعہ جو پیدا ہوتا، بڑھتا، اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر نہ سو جائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آلِ فرعون وغیرہ قوموں کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفس لوّامہ یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر بُرے فعل کے وقت اُس کو ملامت کرتا اور اس کو گنہگار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصوروار جانتا اور گنہگار سمجھتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی اور اس کا ضمیر و نفسِ لوّامہ بھی اس کو ملامت کرے گا۔ کائناتِ انسانی سے بڑھ کر خود کائناتِ ہستی بھی اُس پر جو اس کے اندر کیا گیا، اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی۔ اسی عمومی اعترافِ قصور اور کلّی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے۔ اور اسی مناسبت سے سورہ بالا میں نفسِ لوّامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم میں یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے۔ اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیے۔[1]

۲۔ اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیئے، تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے۔ اس میں سردی و گرمی، بیماری و تندرستی، بقا و فنا اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوّتیں ودیعت رکھی گئی ہیں۔ ان متضاد قوّتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے وہ چیز زندہ رہتی ہے۔ اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے۔ ایک درخت میں ایک پھول کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا جب تک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی، وہ پھول شگفتہ رہا جس آن کسی ایک قوّت نے شکست کھائی پھول کی ہستی معرضِ فنا میں آگئی۔ یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افرادِ خاندان، جماعتیں، قومیں، بلکہ حیوانات، شجر، حجر غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

---

[1] مستفاد از تفسیر سورۂ قیامہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ۔

پوری کائناتِ ہستی کو لیجئے۔ اُس کو خلاقِ عالم نے ان ہی متضاد عناصر و اخلاط پر قائم فرمایا ہے۔ دن رات، روشنی، تاریکی، سردی، گرمی، پانی، آگ، بہار، خزاں، تندرستی، بیماری، دولت، افلاس، حیات و موت، آسمان، زمین، نیکی، بدی، خیر، شر، غرض جس کو بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری متضاد قویٰ اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں جب تک اعتدال قائم ہے اس دنیا کی کل چل رہی ہے۔ جس دن ان کے اعتدال میں فرق آیا وہی اس کی فنا کا دن ہوگا۔

لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظامِ کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہوگئی اور کُشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتاً وہ پھر اُبھری اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتیٔ نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچا لے گیا۔ بارہا اس باغِ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اُس پر چھا گیا۔ اجرامِ سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا جانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی، یہ کُرے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے۔ مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قویٰ اور کائنات کے استعدادات میں اعتدال قائم ہے۔ جس دن اعتدال فنا ہوگا نظامِ ارضی کا پورا کارخانہ بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ اُس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے دے گی:۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ	جس وقت زمین ہلائی جائے گی، اور
وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ	جب وہ اندر کے بوجھوں کو اگل دیگی

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ ۝ اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔
يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ ۝ اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ
بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ اس کے پروردگار نے اس کو حکم دیا ہے۔
يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں
اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ تو جس کسی نے ذرّہ برابر نیکی کی ہے وہ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا بدی کی ہے وہ بھی اس کو دیکھ
يَّرَهٗ ۝ لے گا۔

(الزلزال : ۱-۸)

صورِ قیامت قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر ہے۔ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ (پھر جب صور پھونکا جائے گا)۔ صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلانِ جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا۔ اس لئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے۔ چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہو گی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (آج کس کی بادشاہی ہے)۔ پھر اللہ تعالےٰ خود ہی جواب دے گا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (اس ایک سب پر غالب آنے والے کی)۔ غرض وہ دن آسمان و زمین اور نظمِ کائنات کے شہنشاہِ مطلق کے اظہارِ جلال اور شدید خطرۂ حساب کے اعلان کا ہو گا۔ اس لئے نفخِ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لئے استعمال کیا گیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعتاً اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور

اس کی تعمیل ہو جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔

عربوں کا انکار اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے۔ لیکن اہلِ عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدّت کے ساتھ انکار تھا، جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو اُن کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے۔ جاہلی عرب حیات بعد الموت اور خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرسش اور سزا و جزا سے قطعاً لاعلم تھے۔ اسی لئے اُن کو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دار و مدار ہے۔ عرب کا شاعر آنحضرتؐ کی اس تعلیم کو سُن کر تعجب سے کہتا ہے کہ۔

اموت ثم بعث ثم حشر　　حدیث خرافۃ یا ام عمر

کیا موت ہے، پھر جی اٹھنا ہے پھر اکٹھا ہونا ہے اے ام عمر! (شاعر کی بیوی کا نام)، یہ سب خرافات باتیں ہیں۔

قریش کا ایک اور شاعر[1] کہتا ہے۔

یحدثنا النبی بان سنحیٰ　　وکیف حیات اصداء وھام

یہ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کئے جائیں گے حالانکہ صدیٰ اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟

(ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے، اور آواز دیتا پھرتا ہے۔ اسی کا نام ان کے ہاں صدی اور ہام تھا)

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کئے گئے ہیں، مثلاً

---

[1] صحیح بخاری جلد اوّل باب الہجرۃ۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝

(قٓ : ۳)

کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے۔ یہ لوٹنا بہت دور ہے۔

ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ ۝ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝

(النازعٰت : ۱۰-۱۱)

کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے؟ کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈی ہو جائیں گے؟

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝

(بنی اسرائیل : ۴۹، ۹۸)

کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم نئے بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں؟

مَنْ يُّحْىِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ ۝۷۸

(یٰسٓ : ۷۸)

ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا؟

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے:

وَقَالُوْا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ

(الجاثیۃ : ۲۴)

انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے دوسری نہیں۔ مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا

اور انہوں نے کہا یہی ہماری موجودہ

الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ○ (الانعام، ۲۹)

زندگی ہے۔ ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

انہیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا:

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ○ (النبا: ۲۷)

وہ حساب کی اُمید نہیں رکھتے تھے۔

خبّاب بن الارتؓ نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں۔ یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے۔ وہ جب جاکر تقاضا کرتے تو عاص کہتا "جب تک تم محمدؐ کا انکار نہ کروگے میں تم کو کچھ نہ دوں گا"۔ انہوں نے کہا "یہ اس وقت نہیں ہوسکتا جب تک تم مرکر پھر جیو نہیں"۔ اس نے کہا "کیا مرکر مجھے پھر جینا بھی ہے"؟ انہوں نے کہا "بے شک" اس نے مذاق سے کہا "تو اچھا پھر وہیں میرا مال و دولت اور سروسامان ہوگا۔ وہیں تم دام بھی لے لینا"[1] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں اہلِ عرب کا کفر کتنا شدید تھا۔ اس لئے آنحضرتؐ نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا۔ قرآن مجید کی مکّی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور مؤثّر طریقوں سے روزمرّہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں ہیبتِ الٰہی، ہنگامۂ قیامت اور حشر و نشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے۔ انسان کے عجز و عقل کے قصور، خدا کی عظمت و قدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ پھر ایک طرف حیاتِ ابدی، نعیمِ جنت، اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت اور عذابِ الٰہی کی تہدید کا ایسا

---

[1] صحیح بخاری تفسیر کہیعص۔

ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تأثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحیٔ الٰہی نے قیامت اور بہشت و دوزخ کے حالات و مناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے اُن سے اہلِ نظر صحابہؓ ناواقف تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنّت و دوزخ کا بیان ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اُترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے۔ یہ آیت[1] بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَ أَمَرُّ (بلکہ اُن کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی) مکّہ معظمہ میں اُتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی۔ کھیلتی تھی۔ بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اُتریں جب میں آنحضرتؐ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔"[2]

اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے۔ اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی رجحان اور میلان پیدا ہوتا بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا و سزا کا ذکر باقی رہ گیا ہے دوسرے اہلِ ایمان کے دل بھی سخت اور تأثر سے خالی ہو جاتے۔ چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن مجید نے بیان کیا ہے:

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ	تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے
قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ	ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور
مُّسْتَكْبِرُوْنَ ○ (النحل : ۲۲)	میں مبتلا ہیں۔

---

[1] القمر: ۴۶ [2] صحیح بخاری جلد دوم باب تالیف القرآن

اسی لئے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (روز جزا کا مالک) اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطعِ نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے۔ اوّل یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا۔ اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اُس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ	(اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو
عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○	بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ
(المومنون : ۱۱۵)	جاؤ گے۔
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ○	کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا
(القیٰمۃ : ۳۶)	جائے گا۔

دوسری بات جو روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے وہ اللہ تعالےٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے۔ اگر اچھے اور بُرے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے۔ اس موجودہ مادّی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے۔ تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں۔ اس لئے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے

جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکّام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھّوں اور بُروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے۔ سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ○ فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ○ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ ○	لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی۔ کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں؟ (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)۔
(التّین: ۶-۸)	

اسی لئے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہو سکتا۔ ایک جگہ خدا فرماتا ہے:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ ○	کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھّے کام کئے اُن کی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں۔
(صٓ: ۲۸)	

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا	کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ
السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ	خیال کیا ہے کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں
كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	گے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ ان
سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ	دونوں کی زندگی اور موت برابر ہو گی، ان
سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○	کا یہ خیال برا ہے۔

(الجاثیۃ، ۲۱)

لوگوں کو روزِ جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے۔ یہ حقیقت میں استبعادی شبہہ ہے یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لئے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کے اَن ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے وحیٔ محمدی نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسبِ ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا۔

(۱) مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عزیز علیہ السلام اور اصحابِ کہف کے قصّوں میں مذکور ہیں۔ اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

(۲) جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے اور پھر دفعتاً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے، سبزہ نکل آتا ہے، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرتِ الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی) اور دوبارہ نئی زندگی

پیدا کر دے گی۔

(۳) دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لئے ہے کہ خدا کے دائرۂ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزہ اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

(۴) حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا۔ خدا نے اس کو ہست و موجود کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا۔ تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانے کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا؟ جس نے نقشِ اول بنایا کیا نقشِ ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

(۵) دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانینِ الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی۔ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی پھر جب انہوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانینِ الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لئے ضروری ہیں، مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور اُن کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قومِ لوط اور قومِ مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ	کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے
فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ	کہ اُن سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا جو
الَّذِیْنَ کَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ	اُن سے قوت اور زمین میں یادگاروں

كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ

کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔

(المومن : ۲۱)

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۛ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ

کیا نوحؑ کی قوم اور عاد و ثمود کی اور جو ان کے بعد آئے جن کو خدا ہی جانتا ہے، اُن کی خبر تم کو معلوم نہیں ہوئی؟

(ابراھیم : ۹)

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں۔ بابلی، اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوسِ لِمَنِ الْمُلْك بجاتی تھیں، ہزارہا سال سے بے نشان ہیں۔ نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے؟ یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے، اب اُن کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جو رومیوں کے مقابل صدیوں تک برسرِ پیکار رہے اب اُن کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں۔ امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس برّاعظم کے مالک تھے، اب فنا کے قریب ہیں۔

الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں، جماعتیں وجود میں آکر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا جب قانونِ الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔

جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں شک

کرتے ہیں۔ اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کی فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے۔ حالانکہ ایک وہ دن آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرّا ہو کر فنا ہو جائے گی۔ کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا۔ اس موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے قانونِ طبعی سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سائنس کہتی ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے آفتاب و ماہتاب، ستارے اور تمام اجرامِ فلکی ٹکرا کر چُور چُور ہو جائیں گے اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ (ابرٰھیم : ۴۸)

جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی۔ اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہو گی۔

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے:۔

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ ○ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ○ ۚ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ○ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ○ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ

قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مُردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس پر تعجب ہے کہ ان میں ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ڈر سُناتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے)

فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝ اَفَلَمْ
يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ
كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا
مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ
مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ
وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ
بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى
لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ وَنَزَّلْنَا
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ
الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ
لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا
لِّلْعِبَادِ ۝ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً
مَّيْتًا ۝ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝
كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ
وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۝
وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ
لُوْطٍ ۝ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ
وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۝ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ

یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے۔ (خدا کہتا ہے
یہ تعجّب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے
کہ زمین اُن (مردہ جسموں) میں جو کمی کرتی
ہے اور ہمارے پاس محفوظ کتاب ہے۔
بلکہ بات یہ ہے کہ اُن کافروں نے سچائی
جھٹلادی جب وہ اُن کے پاس آئی پس
وہ الجھی باتوں میں پڑ گئے۔ کیا انہوں نے
اپنے اوپر کے آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو
کیسا بنایا اور کس طرح اس کو سجایا ہے کہ اُس
میں کہیں سوراخ نہیں۔ اور زمین کو پھیلایا ہے
اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اس میں
قسم قسم کی رونق کی چیزیں اگائیں کہ ہر رجوع
ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد
آئے۔ اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا۔
پھر اُس سے باغ اور کٹتے کھیت کے اناج
اگائے اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے
خوشے اوپر تلے ہیں۔ یہ بندوں کو روزی پہنچانے
کے لئے ہے۔ اور اس پانی سے مردہ آبادی کو
ہم زندہ کرتے ہیں۔ اسی طرح (قبروں سے) نکلنا

فَحَقَّ وَعِيْدِ ○ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ
الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ
خَلْقٍ جَدِيْدٍ ○

(قٓ : ۱ — ۱۵)

ہوگا۔ اور کافروں سے پہلے نوحؑ کی قوم، رس والوں اور ثمود
وعاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں اور تبع
کی قوم نے اسکو جھٹلایا۔ (ان میں سے) ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا
تو میری دھمکی پوری اتری۔ کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو
دوبارہ نہیں پیدا کر سکتے۔ بات یہ ہے کہ ان کافروں
کو از سر نو پیدائش میں شک ہے۔

سورۂ قیامت میں بھی اس کا بیان ہے۔ اس کی آخری آیتیں یہ ہیں۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ
سُدًى ○ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ
مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ○ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً
فَخَلَقَ فَسَوّٰى ○ فَجَعَلَ مِنْهُ
الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ○
اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ
يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى ○

(القیٰمۃ : ۳۶ — ۴۰)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بے کار
چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی
ہوئی بوند نہ تھا۔ پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا
پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو
ٹھیک کیا۔ پھر اس کو جوڑا کیا یعنی نر
اور مادہ کیا۔ کیا وہ خدا اس پر قادر
نہیں کہ مُردوں کو دوبارہ
جلائے ؟

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ
رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا
جَدِيْدًا ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ
الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چُورا
ہو جائیں گے تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے
جائیں گے ؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ
جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا وہ ان

قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرآئیل : ۹۸-۹۹)

لوگوں کے مثل کو (دوبارہ بھی) بنا سکتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِىْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ط (الروم : ۲۷)

اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا۔ اور یہ (دوبارہ خلق کرنا) اس کے لئے آسان ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (الحج : ۵)

(لوگو!) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو ہم تو (پہلے) تم کو (اسی مردہ) مٹی سے پیدا کر چکے ہیں (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے)

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا مختصر جواب ہے:

قَالَ مَنْ يُّحْىِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِىْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ط (یٰسٓ : ۷۸-۷۹)

وہ بولا کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا۔ کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔

غرض وحیِ محمدیؐ نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

حشرِ جسمانی اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی اسی گوشت و پوست کے ساتھ ہو گی یا صرف روحانی ہو گی جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گزر نہ ہو گا؟ قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جس میں اشارتاً ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں

تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو۔ کفّار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جیئے گا؟ کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اُٹھ کھڑے ہوں گے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا۔ مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجّب نہ کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈّیوں میں روح پھونکی جائے گی بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیّل اُن کے لئے ناقابلِ فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیّل تو اور بھی اُن کے فہم سے بالاتر تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادّی زندگی کے ماننے والے سر تا پا روحانی زندگی کے تصوّر سے بالکل عاجز ہیں۔ اس لئے مصلحتِ الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے۔ کیسے اور کیوں سے تعرّض نہ کرے اور صاحبِ فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے۔ چنانچہ قرآنِ پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیئے:

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ	اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں
ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ بَلْ	کھو جائیں گے، کیا ہم نئی پیدائش میں پھر
هُمْ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝	ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ)
(السجدۃ: ۱۰)	یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔

غور کرو کہ ان کی مادّی معدومیت کے بعد مادّی پیدائش کے پُر تعجّب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اس لئے اُن کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے۔ اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح

ہوگا؛ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ○ (السجدۃ: ۱۱)

جواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعیّن ہے وہ تم کو موت دے گا پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔

یہی ملاقات و رجوع الی اللہ اس عقیدۂ حشر کی اصلی روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادّی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں۔ اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصوّر سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرارِ سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں تقریباً ناممکن ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستانِ وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے کیا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں لیکن جو شخص جسمانی حشر کا تصوّر اس لئے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا تو اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیّل تو اور بھی زیادہ محال ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا ہے بلکہ وہ اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کرے گا ان سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔ موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے اس لئے اگر یہ صحیح ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی تو ظاہر ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت اور کیفیت ہوگی جس کا

نام حیاتِ ثانیہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔ ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا بڑھ گئی جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھ دیا گیا۔

گو روحِ انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر فاعل کے فاعل بننے کے لئے آلات اور اوزاروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے۔ اسی طرح روح اپنے فعلِ لذت والم کے انجام دینے کے لئے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت والم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بناء پر روحِ محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا۔ خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی جسمانی پیکر و ہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

جسم و جسد حشرِ جسمانی ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائے گی یا یہ کہ آئندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا جبکہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے جسم پر نہیں اور اسی طرح جزا و سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو، روح پر مواخذہ اور ثواب و عذاب کی لذت اور الم کا احساس یکساں ہوگا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا اس کی خصوصیات اور لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہوں گے۔ چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب و رؤیا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے۔ اس لئے لفظِ جسم کے بولنے سے ان ہی خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر

اشکالات وارد کئے جا سکتے ہیں۔

خلقِ جدید چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا۔ اسی لئے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ۔

بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ (قٓ : ۱۵)	بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں۔

منکرین کی زبان سے کہلوایا:

ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ (بنی اسرائیل : ۴۹)	کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے:۔

اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ (سبا : ۷)	بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ط (الانبیاء : ۱۰۴)	جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے۔

اسی لئے اُس عالم کی اس نئی خلقتِ و پیدائش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے اور نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہٖ اس جسم میں ہونا ضروری ہے۔ اُس کو اگر اس عالم کے لفظ "جسم" سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف و قالب کے لئے جسم سے بہتر، قریب تر، اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گزشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لئے ضروری سمجھا جائے کہ

وہ بھی عذاب وثواب میں شریک ہوں، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے۔ قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ	بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے
نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتْ	ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے جب جب ان
جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا	کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو اور کھالیں
غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ	دیں گے جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی تاکہ وہ
اللّٰهَ کَانَ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ○	عذاب چکھیں، بے شک اللہ غالب
(النساء، ۵۶)	اور حکمت والا ہے۔

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو پہلا حصۂ جسم جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال پر شہادت دیں گی اس سے معلوم ہوا وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضاء کے علاوہ ہے اور وہ روحِ انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے | یہی سبب ہے کہ موت وحیات، عذاب وثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا ہے وہ نفس یعنی روح ہے:

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی	تو قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ
عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ	اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے
(الزمر، ۵۶)	پہلو میں کمی کی۔
وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ	اور چاہیئے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے
(الحشر، ۱۸)	کل (قیامت) کے لئے کیا آگے بھیجا۔
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ○	(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس

(التکویر: ۱۴) نے حاضر کیا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ○ (اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔

(الانفطار: ۵)

فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط (تو اس دن) کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔

(الانبیاء: ۴۷)

جنّت کی نسبت ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ج کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

(السجدۃ: ۱۷)

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور بُرے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا ہے اور اُسی کو تکلیف و لذّت سے آشنا کیا گیا ہے۔ جنّت میں داخلہ کی خوشخبری بھی اسی کو دی گئی ہے:

فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○ اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

(الفجر: ۲۹-۳۰)

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور اُن کے نتائج کی اصل ذمہ دار اور جنّت و دوزخ کی لذّت و الم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس و آلۂ احساس کی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی

کوئی حیثیت نہیں۔ یہ جسم لاکھ بار بدلے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمّہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے۔

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں حالانکہ اس مٹّی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا نہ ہو تو پھر اس مشتِ خاک میں دھرا کیا ہے؟ دیکھو انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادّہ ہر آن اور ہر لمحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے۔ بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا پھر تندرستی کے بعد نئے ذرّات داخل ہو کر لہلہائے۔ تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اس کے ذرّے کیونکر ہر آن جھڑتے اور گھستے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا رہا وہ خون ہو کر کیونکر بدل مایتحلّل بن کر اُن کی جگہ لیتی رہی۔ پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمّہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگا تھا اس عرصۂ دراز میں بدل گئے ہیں اس لئے وہ لائق تعزیر نہیں۔ کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا، جس طرح کل تھی بعینہٖ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی تھی بعینہٖ آج بھی پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیّر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لئے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضا کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہو گا۔ جسم کے اعضا دنیا میں بدلتے

جاتے ہیں مگر جو بیماری اگلے اجزا میں پیدا ہوگئی تھی وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے، مٹ نہیں جاتی بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزاء میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے درحقیقت اُن کے اعمال ہی کے ظلّ وعکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، مگر اُس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی وسپیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ خدا نے فرمایا:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۙ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝

(عبس: ۳۸ - ۴۱)

کتنے چہرے اُس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہو گی اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۫ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(آل عمران: ۱۰۶ - ۱۰۷)

جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے اور کتنے کالے لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو۔ اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔ اسی میں سدا رہیں گے۔

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنّت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے اوّلین بہشتی قد کے مطابق ہوگا۔ دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے، دل کے اندھے آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چُور چُور ہو جائیں گے تو پھر صحیح وسالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر اُن کی وہی کیفیت ہو گی۔ یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے۔ ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اُس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

جزا اور سزا

"یومِ آخر" یا "یومِ دین" پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ اُن کے ہر عمل کا بدلہ ہے۔ کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں۔ اسی کا نام جزا و سزا ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہمنوا ہیں۔

جزا و سزا دیگر مذاہب میں | درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اور اچھا یا بُرا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے اس کے مطابق اچھا یا بُرا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا۔ اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے۔ ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا بُرے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جاکر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے۔ اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے جہاں نرک (دوزخ) ہیں۔ وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے۔ بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے۔ جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے، اور اپنے کام کے مطابق

حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے۔ اُس وقت وہ مادّی قالبوں کی قید سے نجات پاکر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جاکر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اُس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے۔ یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے اچھے یا بُرے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے کامل اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا بُرا کوئی کام صادر نہ ہو۔ یہی ترکِ عمل روح کو مادّہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ موجودہ مادّی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکّر شروع ہوگا اور پھر اسی طرح چھٹکارا پائے گی۔ اور پھر دوسرے پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا۔ یہ چکّر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکّر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا اِلّا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترکِ عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے۔ لیکن اگر اس اصولِ نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے۔ ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آجائے۔ بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ اور بایں ہمہ دائمی و ابدی نجات میسّر نہ ہو کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔[1]

---

[1] تناسخ کے رد میں الندوہ مئی و جون ۱۹۰۶ء میں ایک مضمون ہے۔

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسان کو نجات دلائی ہے۔ انہوں نے موجودہ دُنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے جس میں لوگوں کو اچھے اور بُرے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی۔ مختلف زردشتی فرقوں نے آریہ نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو "ارداے ویراف" کے عجیب وغریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے[1]۔

صحیفۂ ابراہیمؑ یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اُٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے[2]۔ علیٰ ہذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اُخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں۔ نیکوکاروں کے لئے ایک "سنہری آبادی" کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ بدکاروں کے لئے ہلاکت، بربادی اور دردناک عذابوں کی خبر ہے۔ مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارضِ موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں دکھایا ہے حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی جنتِ عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے۔ علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور یعقوبؑ علیہما السلام کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ "جاں بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا" ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی[3] کا بھی تذکرہ ہے "اور جہنم کی آگ[4]" کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیئے جانے کی بھی تصریح[5] ہے۔ روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی اُن صحیفوں میں موجود ہے۔ مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس

---

[1] دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے۔ [2] تکوین ۲-۱۹۔ [3] پیدائش ۲۵-۸۔ [4] پیدائش: ۴۹-۳۳۔ [5] استثنا ۶-۲۴۔ [6] استثنا ۳۲-۲۲۔ [7] یرمیاہ ۱۷-۱۱۔

پھر جانے کا بھی تذکرہ ہے[1]۔ اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کی بھی تصریح ہے۔ آخر میں ہے "خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرضِ کُلّی یہی ہے کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بُری، عدالت میں لائے گا[2]"۔ زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں۔ امثال سلیمانی میں ہے کہ "انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانچتا ہے۔ شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑ جائے گا۔ وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا پھرے گا[3]"۔ دانیال میں ہے کہ "اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں، جاگ اٹھیں گے۔ بعضے حیاتِ ابدی کے لئے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لئے[4]۔ حزقیال میں جنّت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں[5]۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے یہودیوں میں صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکمراں یونانیوں کا تقرّب حاصل کرنے کے لئے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں[6]۔ منجملہ اُن کے وہ قیامت اور حیاتِ اخروی کا بھی منکر ہوا۔ مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا، اپنے پُرانے عقیدوں پر قائم رہا اور قیامت، حیاتِ اُخروی اور جنّت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنّت مادی ہوگی اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی[7]۔ یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے۔ چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گنہگار ہوں مگر چند روز سے زیادہ دوزخ

---

[1] واعظ ۳-۲۱۔ [2] واعظ ۱۲-۱۳-۱۴۔ [3] امثال سلیمانی ۵-۱۲۔ [4] دانیال ۱۲-۲۔ [5] حزقیال ۲۸۔

[6] برٹش انسائیکلو پیڈیا مضمون صدوقیین و صدوکیز۔ [7] مرقس ۱۲-۲۴۔

میں نہیں رہیں گے۔ یہ چند روز یا اختلافِ روایت تین روز، چالیس روز یا گیارہ مہینے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کے تردید وابطال میں مصروف تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آکر صدوقیوں کے اس عقیدے کی تردید کی اور قیامت اور جزا وسزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ "اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے" ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں:

"میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ بنوں"

(متی ۲۶-۲۹)

وہ یہودی علماء کو خطاب کرکے فرماتے ہیں:

"اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے"

(متی ۲۳-۳۳)

۱؎ البقرہ: ۸۰ و آل عمران: ۲۴ ۲؎ کتب سیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو، ۳؎ سیل کا ترجمۂ قرآن حاشیۂ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸،

اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور ابرہام (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو۔ اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابرہام! مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے کیونکہ میں اس لُو میں تڑپتا ہوں۔" (لوقا ۱۶-۲۳)

مکاشفاتِ یوحنا میں دوزخ کو "آگ اور گندھک" کہا گیا ہے[۱]۔ اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں[۲]۔ اسی طرح جنت اور اس کی طلائی و جواہراتی تعمیر اور نہرِ آبِ حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے[۳]۔ وہاں کے آبِ سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے[۴]۔

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لئے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ لینے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے۔

"مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا۔" (رومیوں ۴-۸)

"سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔" (رومیوں ۱۴-۱۲)

"لیکن وے اُس کو جو زندوں اور مُردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے، حساب دیں گے۔" (اوّل پطرس ۴-۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اُس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا بلکہ اُس کے تمام ضروری اجزا فراہم کئے۔ گذشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں۔ اُن کے نقائص کی تکمیل کی اور جزا و سزا کے اصول اس صفائی سے

---

[۱] مکاشفاتِ یوحنا ۱۴-۱۰۔ [۲] متی ۱۶-۱۸۔ [۳] متی ۲۶-۲۹۔ [۴] لوقا ۱۶-۲۳۔

بیان کئے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہوگیا۔

آیندہ مباحث کے سمجھنے کے لئے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

عالمِ آخرت کا فہم و ادراک اس عالمِ آخر میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے اس زیرِ تجربہ و زیرِ مشاہدہ مادّی عالم سے بالکل الگ ہوگا تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادّی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اس لئے یہ الفاظ جن مادّی خصائص کو مستلزم ہیں یا ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں، ان لفظوں کو سُن کر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں اُن لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں۔ اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سُن کر اُن میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں۔ اور بعضے اُن کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں۔ اسی لئے وحیٔ محمدیؐ نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے۔ اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادّی کہہ کر عالمِ آخرت کو بھی عالمِ آب و گِل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح اُن کو مادّہ سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ اُن کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے۔ بلکہ انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہلِ نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفّی و تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

اِن اُخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحیٔ محمدیؐ نے ایسے جچے تُلے الفاظ اختیار کئے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اور ایک ایسے مذہب کے لئے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی

وسعت کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ سب کے لئے اپنی اپنی جگہ پر تشفّی کا باعث ہو سکے۔ ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا کا مادّی ماحول، مادّی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیّلاتِ لپٹے ہوئے ہیں۔ اِن لفظوں کے سُننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سرتاپا انہی مادّی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے۔ ہم جب "آگ" کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں جو انسانوں، درختوں اور ہر اُس چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے، بلاتمیز یکساں جلا دیتی ہے۔ مگر اُخروی آگ ایسی نہ ہو گی۔ اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے۔ وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائے گی۔ کسی کے پاؤں کو چھوئے گی۔ کسی کی کمر تک آئے گی۔ کسی کے گلے تک پہنچے گی اور ایسی تیز و گرم ہو گی کہ یہ دنیاوی آگ اُس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے۔ "وزن" کا لفظ سننے کے ساتھ اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ترازو، پاسنگ، پلّے، ڈنڈی اور تولی جانے والی چیزیں جسمیت اور ثقل کا ہونا۔ اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی۔ اس بناء پر ان الفاظ کے لغوی معنی اور ان کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلافِ آراء کی بڑی گنجائش ہے۔ اس لئے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے اُن کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے۔ بایں ہمہ اُن لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلّی پا جانا چاہتے ہیں جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں کہ اگر مرادِ الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کئے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں کیا تاکہ اسلام

مختلف العقول انسانوں کے لئے عالمگیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لئے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اُس کے موجودہ تمام قوانینِ فطرت کو اس طرح لازم ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شئے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاً اس کی وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گی جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں۔ حالانکہ اربابِ عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلولات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہے وہ محض عادی ہے یعنی اس لئے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہ اس لئے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادّی دنیا میں جو قوانینِ فطرت اور علل و اسباب اور اُن کے نتائج کارفرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں اور اگر خدائے تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانینِ فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو۔ نئی خصوصیات کے جسم ہوں۔ نئی قسم کی زندگیاں ہوں۔ نئی قسم کی آگ ہو۔ نئی قسم کے باغ اور اُن کے پھل ہوں۔ نئی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں۔ نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانینِ فطرت ہوں۔ وحیٔ محمدیؐ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ	جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل
الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ	جائے گی اور آسمان (نئے آسمانوں

(ابراھیم: ۴۸) سے)

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادّی قانون جاری

ہوں گے جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری ہیں۔ اس بناء پر جسمانیت و مادّیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دنیا اور اُس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جزا و سزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے

وھو الھادی الی الصواب۔

اصولِ جزا اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے جس کو اہلِ فلسفہ قانونِ قدرت اور اہلِ مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اُس نے اپنے ہر عالم کے لئے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے۔ انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادّیات تک محدود ہیں حالانکہ مادّیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں۔ جس طرح یہ قانونِ فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مرجاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصولِ فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مرجاتی ہے۔ اور جس طرح اصولِ حفظانِ صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہوجاتا ہے اسی طرح اصولِ تزکیۂ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہوجاتا ہے۔ پھر جس طرح دوا اور اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسے ہی روحانی تدابیرِ علاج کے ذریعہ سے وہ شفایاب بھی ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم و نتائج غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اُس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اُسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ

نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری، بُخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے۔ اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیّت، شکّر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علّت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادّی اور طبیعاتی اشیا میں ہے۔

اشخاص کی نیکو کاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں۔ جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام اُن مادّی فزیکل اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور ان کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاءؑ کا کام ہے۔ اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے۔ انبیاءؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیئے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیا کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے۔ سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعتِ تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب و ثواب ردِّ عمل ہے الغرض یہ مادّی و جسمانی دنیا علّت و معلول اور عمل اور ردِّ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے۔ عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ اس لئے عقاب اُس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے۔ اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے

جس کے معنی لوٹنے کے ہیں۔ اس لئے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے کے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقّت نہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے:

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (الجاثیۃ: ۲۸) — جو تم کرتے تھے وہی آج بدلہ پاؤ گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے رَدِّ عمل (ری ایکشن) کا نام ہے

ایک اور جگہ ہے:

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ○ (طٰہٰ: ۱۵) — تاکہ ہر جان کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کرتی ہے۔

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا و سزا تمامتر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں:

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ (النحل: ۳۴) — تو اُن کے بُرے کام اُن پر پڑے اور اُن کا ٹھٹھا کرنا اُن پر الٹ پڑا۔

غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا "اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں۔ تو جو کوئی جزائے خیر پائے وہ

خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے[1]۔"

حصولِ راحت کا اصول | یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اُسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لئے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں۔ عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آیندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دوں ہمّت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آیندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آیندہ کی راحت گو بڑی خوش آیند ہو مگر وہ نسیہ ہے۔ اور اُن کا اصول یہ ہے کہ "نقد را بہ نسیہ مگذار"۔ لیکن بلند ہمّت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فاتح اور کشور کُشا آج اپنی جانیں جوکھم میں ڈالتے ہیں تاکہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے۔ تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ دولتِ فردا سے بہرہ مند ہوں۔ ہر مہذّب انسان اپنے بچّہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مُصیبتوں کی آگ میں بے تامّل جھونک دیتا ہے تاکہ اس کی آیندہ زندگی راحت و مسرّت میں بسر ہو۔ لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لا سکیں اور تنگ دستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لئے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لئے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو۔ اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائیدار

---

[1] صحیح مسلم ترمذی: کتاب الزہد و مسند ابن حنبل جلد پنجم اور ادب المفرد بخاری باب الظلم۔

اور دائمی کامیابی نصیب ہو۔ مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام و پائیداری کا ہم کو یقین ہو۔ کیونکہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں۔ اسی کے لئے ایمان کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں۔ جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے گنہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝

(القیٰمۃ: ۲۰-۲۱)

ہرگز نہیں! بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔

حالانکہ انسان اسی اصولِ کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے۔ آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے۔ موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا۔ تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو۔ ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لئے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے۔ غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے، تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہو گی۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے:

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً

اور خدا نے اُن کے صبر کرنے پر

وَّحَرِيْرًا ۝ ۙ — ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی۔ (الدھر : ۱۲)

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تاکہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو۔ اور یہاں ادائے نیکی اور احترازِ جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت تاکہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے۔ یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حفّت الجنّۃ بالمکارہ وحفت النّار بالشھوات یعنی جنّت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے۔ ناداں تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی وفانی لذّتوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اس لئے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذّت سے محروم رہیں گے۔ اور جو دین ودیانت اور نیکی وتقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذّتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لاانتہا لذّتوں سے شادکام ہوں گے۔ یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ — لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے
وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ ۙ — کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز
فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ — لذّتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنّت اس کا ٹھکانا ہے۔ (النازعٰت : ۴۰-۴۱)

نامۂ عمل | ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بے حکمِ خدا فنا نہیں ہوتی۔ اسی طرح افعال واعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس (جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجودہ ہے اور

ہمیشہ رہے گی۔ اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سُن سکتے ہیں) وہ اعمال و افعال کے دوامِ وجود سے اسلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی۔ دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لئے گویا بھرا ہے۔

قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے :

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ

اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا، اس کو آزمائے گی۔

(یونس : ۳۰)

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ

ہر آدمی اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔

(الطور : ۲۱)

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ

ہر جان اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔

(المدثر : ۳۸)

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا۔ اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا وہ اس کو بھی دیکھے گا۔

(الزلزال : ۷، ۸)

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ

جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کئے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کئے وہ بھی۔

(آل عمران : ۳۰)

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے، اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے، خدائی شاہد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سُن کر محفوظ کر لیتے ہیں:

اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ	جب دو لینے والے داہنے اور بائیں
الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ○	بیٹھے لیتے جاتے ہیں کوئی بات وہ
مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ	نہیں بولتا مگر ایک نگراں اس کے
رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ○	پاس حاضر رہتا ہے۔

(قٓ : ۱۷-۱۸)

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ	کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور
سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰی وَ	ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے؟ کیوں
رُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ ○	نہیں! بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے
(الزخرف : ۸۰)	پاس (اعمال کو) لکھتے ہیں۔
اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ○	بیشک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں
(یونس : ۲۱)	کو لکھتے رہتے ہیں۔

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور ذاتی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے:

وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا	اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن
مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ	سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ

مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ط

کوئی کام کرتے ہو لیکن ہم موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں لگے ہوتے ہو۔

(یونس: ۶۱)

کبھی یہ کہا ہے کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے۔ قیامت کے دن وہی فردِ عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو۔ فرمایا:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ○ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ○ .

اور ہم نے ہر انسان کا نتیجۂ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے۔ اور قیامت کے دن ہم اس کو دفتر کر کے نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا کہ اپنا دفتر پڑھ لے۔ آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔

(بنی اسرآئیل: ۱۳-۱۴)

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلمبند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے اسی طرح یہ نامۂ انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے۔ فرمایا:

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا

اور نامۂ عمل رکھا جائے گا تو گنہگاروں کو تو دیکھے گا اس میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں

مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝

گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا لیکن اس کو شمار کرلیا۔ اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے۔ اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

(الکھف: ۴۹)

بایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہوکر نامۂ عمل کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے۔ مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا۔ اسی لئے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا۔ چاہے یہ ہو یا وہ بہرحال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضا کی شہادت انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا بُرا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے۔ فرمایا:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰي نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝

بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے اگرچہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔

(القیٰمۃ: ۱۴-۱۵)

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ

نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

(المطففین: ۱۴)

اسی آیت کی تفسیر میں گویا آنحضرتؐ نے یہ فرمایا ہے کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے۔ اور اگر اسی طرح گناہ کئے جاتا ہے تو اُس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے[1]۔

اسی طرح وہ اپنے جن اعضاء سے جو بُرا کام کرتا ہے اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں۔ آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں۔ عالمِ غیب کو چھوڑو اسی عالمِ ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں انسانوں کے چہروں، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوانِ بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں۔ اسی طرح قیامت میں اُن کے اعمال کے آثار و نتائج اُن کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ	گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لئے
(الرحمٰن : ۴۱)	جائیں گے۔

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبانِ قال پر خداوندِ عدالت کے رعب و جلال سے مہرِ سکوت پڑ جائے گی۔ اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک اس کے اعمالِ بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فرمایا:

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ۝	اے گنہگارو! آج نیکو کاروں سے الگ
.... الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ	ہو کر پہچان میں آجاؤ ..... آج ہم ان کے
أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ	منھ پر مہر لگا دیں گے، اور اُن کے ہاتھ

---

[1] ترمذی۔

وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

(یٰسٓ : ۵۹ ، ۶۵)

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ

اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو اُن کے کانوں، اُن کی آنکھوں اور اُن کی کھالوں نے اُن پر اُن کے کرتوتوں کی گواہی دی۔ اُنھوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی؟ کہا جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اُسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔

(حٰمٓ السجدۃ : ۱۹-۲۱)

اس لئے اِن اعضاء کی گویائی بھی اُسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے۔ لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لے کر تشفّی پاتا ہے تو اس کو اِس کا حق حاصل ہے۔

میزان | اکثر انسانوں کے اچھے یا بُرے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں۔ ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر۔ دو مادّی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے۔ اس لئے وزن اور حساب سے عموماً عدل و انصاف، حق اور ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ اعمالِ انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان

کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا۔ فرمایا:

جَزَآءً وِّفَاقًا ۝ — پورا پورا بدلہ۔

(النبأ: ۲۶)

اس برابری اور کمالِ عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا۔ فرمایا:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے۔ اور وزن اس دن حق ہے۔ پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں جن کا بھلا ہوا۔ اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔

(الاعراف: ۷-۹)

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝

تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا۔ اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہے۔

(القارعہ، ۶-۹)

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمالِ خیر کی کمی و بیشی ہے۔ پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق و عدل ہے

اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علمِ الٰہی میں موجود ہوگا اور وہ کسی طرح بیش و کم نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ	وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ
بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ ؕ	اتارا اور میزان کو۔

(الشوریٰ: ۱۷)

یعنی کتابِ الٰہی حقانیت کے ساتھ اُتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی جس سے مراد عدل ہے[1]۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدالِ کامل رکھا ہے اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے:

وَ وَضَعَ الْمِیْزَانَ ۙ۝	اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔

(الرحمٰن: ۷)

حساب کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے۔ مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے۔ چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے۔ فرمایا:

وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ	اور ہم قیامت کے دن کے لئے ترازوئیں
لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ	یعنی انصاف رکھیں گے پھر کسی پر کچھ ظلم
نَفْسٌ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ	نہ ہوگا۔ اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ

---

[1] طبری تفسیر آیت مذکور۔

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ○

ہو گا تو ہم لے آئیں گے۔ اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

(الانبیاء: ۴۷)

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جا سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عملِ انسانی کا کوئی وزن معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا۔ اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے۔ لیکن بہر حال وزن و حساب کے مادّی ہی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنّت و دوزخ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمّہ داری سے مقصودِ الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواحِ انسانی کو سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں۔ مگر اس سعادت و ترقّی کی بنیاد خدا نے اعمالِ نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقتِ انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ وہ اپنی مقرّرہ سعادت اور موعودہ ترقّی کو حاصل کرے۔ اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں "بہشت" ہے۔ اور اُس عالم کا نام جہاں جا کر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہو گی، "دوزخ" ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنّت ہی انسان کا اصلی گھر ہے۔ مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنّت انسان کی وراثت ہے حضرت آدم علیہ السلام کا قصّہ جو توراۃ اور قرآن پاک میں مذکور ہے وہ آغازِ خلقت کی محض تاریخ نہیں وہ حقیقتِ انسانی کی سچّی اور حقیقی تفسیر ہے۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے فضل سے جس جنّت

میں جگہ دی تھی وہ پہلے اُن کو اور اُن کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دے دی گئی تھی۔ مگر چونکہ اتفاقاً اُن سے گناہ سرزد ہوا اس لئے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیئے گئے۔ مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السّلام کا زمین میں آنا تو اُن کی پیدائش سے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ (البقرۃ: ۳۰) — میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

حضرت آدم علیہ السلام کا زمین میں خلیفہ ہونا اُن کے زمین میں سکونت پذیر ہونے پیشین گوئی ہے۔ مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے اُن کو جنّت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور اُن کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنّت ہے۔ مگر اس سے دوری اُن کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا چنانچہ اُن کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ — ہم نے کہا کہ تم سب اس جنّت سے
فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی — اُترو۔ پھر کبھی تمہارے پاس
فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ — میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ — تو جس نے میری ہدایت کی
وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا — پیروی کی تو اُس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔
بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ — اور جنہوں نے نہ مانا اور ہمارے
النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ — حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ

(البقرۃ، ۳۸-۳۹)

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى ۙ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ۝ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ۝

والے۔ وہ اس میں رہا کریں گے۔

خدا نے کہا کہ اس جنّت سے تم دونوں ایک ساتھ اُتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا۔ اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اُس کے لئے تنگ معاش ہوگی اور قیامت میں ہم اُس کو اندھا اٹھائیں گے۔

(طٰہٰ: ۱۲۳-۱۲۴)

توراۃ میں ہے کہ جنّت میں دو درخت تھے۔ ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا۔ توراۃ کی رو سے آدم علیہ السّلام کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن آدم علیہ السلام نے اُس کو کھا لیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے اُن کو اپنی برہنگی کا علم ہوا۔ آخر خدا نے اُن کو جنّت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ جب وہ جنّت سے نکالے گئے تو اُن سے کہا گیا:

"اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اسے مت کھانا۔ زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اُگائے گی۔ اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔ (سفر تکوین۔ ۲)

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدم علیہ السّلام کو روکا گیا تھا، تصریحاً مذکور نہیں۔ لیکن ایک آیت سے اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ "وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا"۔ اور شیطان نے یہ کہہ کر اُن کو بہکایا کہ یہ "حیاتِ جاوید اور ملکِ جاوداں کا درخت ہے"۔ مگر اُس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کو "برہنگی کا علم" ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔ فرمایا:

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطَانُ	شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا۔ کہا اے
قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى	آدمؑ! کیا میں تجھے حیاتِ جاودانی
شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا	اور سلطنتِ غیر فانی کا درخت بتاؤں۔
يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ	تو (آدم اور حوّا) دونوں نے اس درخت
لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا	کا پھل کھایا تو ان کی بُری چیزیں اُن پر
(طٰہٰ: ۱۲۰ – ۱۲۱)	کُھل گئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ "حیاتِ جاوداں" اور "غیر فانی بادشاہی" سے مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جنّت ہے۔ شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنّت میں جس میں تم اب ہو، بے دردِ سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا۔ یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے۔ ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے گرانبار نہیں۔ غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی۔ چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسلِ آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی۔ فرمایا:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝

(الشمس : ۷-۸)

اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم۔ پھر نفس میں اس کی بدی اور اس کی نیکی کو الہام کیا۔

عجب نہیں کہ قرآنِ پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہوں :

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

(الاحزاب : ۷۲-۷۳)

ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اُس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اُس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا۔ تاکہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں اور شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان اور ایمان والیوں پر رجوع ہو۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھالیا جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور اس تکلیفِ شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی۔ لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اُس کے سب بندے اُس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اُس کی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکو کاروں پر اپنی

خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشتکار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا۔ اسی طرح جو بندہ شرک ونفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اُس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحتِ الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیاتِ جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جدّوجہد اور سعی وعمل پر موقوف رکھا تھا اور جسے شیطان نے آدم کو بلا سعی ومحنت محض بخت واتّفاق سے دلوانا چاہا تھا، بالآخر اُس کا ملنا تقدیرِ الٰہی، جدّوجہد، سعی وعمل اور نظامِ ربّانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعہ سے مقرّر ہوا جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ فرمان آیا:

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرۃ : ۳۸)	یہاں سے تم سب اُتر دو۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو اُن کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔
اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ○ (طٰہٰ : ۱۲۳)	تم دونوں یہاں سے نیچے اُترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبخت۔

جب انسان کا اصل مقام وہی حیاتِ جاوید اور مملکتِ ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیئے۔ اور اسی حیاتِ فانی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مُزدو معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنے باپ کی اُس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے:

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ	تو شیطان تم کو جنّت سے باہر نہ کردے
فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ	تو پھر تو مشقّت میں پڑ جائے۔ اور جنّت
فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ	میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہو گا
لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝	اور نہ ننگا، نہ پیاسا ہو گا اور نہ دھوپ کی
(طٰہٰ: ۱۱۷-۱۱۹)	تپش اٹھائے گا۔

آدم علیہ السلام اس جنّت سے نکلے تو اُن کو بھوک بھی لگی، ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی اور زمین میں آکر اِن ہی چار چیزوں کی مشقّت میں گرفتار ہوئے۔ کھانا، پینا، پہننا، رہنا یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں۔ اُن ہی کو اُس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالَم پیدا کر لیا جس کے مہیّا کرنے ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجّہ کو مصروف کر کے اصل جنّت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اکل، جائز شُرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا۔ اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمّہ داریاں پیدا ہوئیں۔ اور پھر اس لئے تاکہ اس حیاتِ فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے عرفانِ الٰہی (عقائدِ صحیحہ) اور عبادتِ الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی جو جنّت

کی اصلی غذا اور روزی ہے:

أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝	یہی وہ میراث لینے والے ہیں جو
الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ ط	سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے۔
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝	وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے
(المومنون: ۱۰-۱۱)	ہیں۔

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمالِ خیر ہی کے ذریعہ ملے گی۔ چنانچہ اہلِ جنّت کو جنّت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی:

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَ	اور اس جنّت میں وہ کچھ ہے جس کو
تَلَذُّ الْأَعْيُنُ ج وَأَنتُمْ فِيهَا	دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے۔
خَالِدُونَ ۝ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي	اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور
أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ	یہی وہ جنّت ہے جس کے وارث
تَعْمَلُونَ ۝	اپنے کاموں کے بدلہ تم بنائے
(الزخرف: ۷۱-۷۲)	گئے۔

اور اُن ہی کو مُنادیِ غیب یہ ندا دے گا:

وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ	اور اُن کو پکار کر کہا گیا کہ یہی وہ جنّت
أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ	ہے جس کے تم وارث (اور) اپنے
تَعْمَلُونَ ۝	ان کاموں کے بدلہ بنائے گئے۔
(الاعراف: ۴۳)	

ملّتِ توحید کے مُبلّغِ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝ — اور مجھ کو باغِ نعمت کے وارثوں سے بنا۔

(الشعراء : ۸۵)

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے جہاں نہ بھوک ہے نہ پیاس، نہ برہنگی ہے نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے۔ لیکن اُس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے جن کے مجموعہ کا نام "تقویٰ" ہے:

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝ — یہ وہ بہشت ہے جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے جو تقویٰ والا ہوگا۔

(مریم : ۶۳)

انسانی جزا و سزا کے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں۔ ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی، عالمِ موت یا عالمِ قبر جس کا نام برزخ ہے۔ اور تیسرا اُس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں۔ یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا و سزا پر ہے۔ اُن کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم اور دوسرے کا مطلق نہیں۔ اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے۔ لیکن وحیِ محمدیؐ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی جزا و سزا کا مقام قرار دیا۔ انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا و سزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو۔ اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سزا

کا منظر دیکھ لیتی ہے۔ اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اُس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کے لئے بیدار کیا جائے گا اور اُس وقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزا و سزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دار الجزا غرض انسان کا پہلا دار الجزا یہی دنیا ہے۔ گو اُس کے ہر نیک و بد فعل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی میں ملتی ہے لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اُس کو کچھ نہ کچھ جزا ملا کرتی ہے۔ انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت یہ سب اس زندگی کے اعمالِ خیر کے نتائج ہیں۔ اُن کے برخلاف ذلت، رسوائی، بے عزتی، کس مپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم، خوف اور محکومیت اُس کے اعمالِ بد کے اثرات ہیں۔

یہودیوں کی توراۃ میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دار الجزا کو دی گئی ہے۔ بلکہ توراۃ میں یہی خیال سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کے رنج و راحت کی صورت میں اسی زندگی میں ملتی ہے۔ مثلاً خدا کے حکموں پر عمل کرو گے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی، اولادیں برومند ہوں گی، جانور جنیں گے، درخت پھل دیں گے اور دشمن مغلوب ہوں گے۔ اور اگر خدا کی نافرمانی کرو گے تو تم پر وبائیں آئیں گی، قحط پڑیں گے، اولادیں جیتی نہ رہیں گی، جانور مر جائیں گے، شہر تباہ ہو جائیں گے، باغ پھل نہ دیں گے اور دشمن تم پر چھا جائیں گے۔ عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے۔ آنحضرتؐ جس دعوت کو لے کر آئے وہ یہودیت اور عیسائیت کی اس افراط و تفریط دونوں سے پاک ہے۔ اُس نے ایمان اور

عملِ صالح کا نتیجہ اِس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اُس دنیا کی بھی، زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنّت بھی، یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی اور وہاں کا باغ و بہار بھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(اٰل عمرٰن: ۱۴۸)

تو خدا نے اُن کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ایمان اور عملِ صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

(الفتح: ۲۹)

خدا نے اُن سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے، گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔

اور یہ بھی اُن ہی سے وعدہ ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪

(النور: ۵۵)

خدا نے اُن سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے، وعدہ کیا ہے کہ وہ اُن کو ملک میں حاکم بنائے گا جس طرح اُن سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اِس دنیا کی فانی زندگی سے اُس دنیا کی باقی

زندگی زیادہ پائدار ہے اُسی طرح اِس دنیا کے ثواب سے اُس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے۔ اور اِسی دنیا کے حُسنِ عمل کی کوشش سے اُس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے۔ فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝	جنہوں نے نیک کام کئے اس دُنیا میں اُن کے لئے بھلائی ہے۔ اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے۔ اور پرہیز گاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔

(النحل : ۳۰)

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اُس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا اُسی طرح اِس دنیا کی ذلّت و خواری اور رسوائی کو بھی فرمایا:

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ	اُس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔

(الحج : ۱۱)

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝	اُن کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑی مار ہے۔

(البقرۃ : ۱۱۴)

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ	اُن کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔

(البقرۃ : ۲۱۷)

یہ بھی فرمایا:

فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا	تو میں اُن کو دنیا اور آخرت میں

فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ — سخت سزا دوں گا۔

(اٰل عمرٰن : ۵۶)

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ○

(طٰہٰ : ۱۲۴)

اور جس نے میری نصیحت سے منھ پھیرا تو اس کے لئے تنگ گذران ہے۔ اور قیامت میں میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا (کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا)

انتہا یہ ہے کہ خود صحابہؓ کو جنگِ اُحد میں جو فتح نہیں ملی اللہ تعالیٰ نے اُس کو بھی اُن کی بعض فرد گذاشتوں کا ثمرہ بتایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا ۚ

(اٰل عمرٰن : ۱۵۵)

تم میں سے جو لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں پیچھے ہٹے، اُن کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے اُن کو پھسلا دیا۔

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ○

(الشوریٰ : ۳۰)

جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث۔ اور وہ بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے۔

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ عذاب کے موقع پر فرمایا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

(اٰل عمرٰن : ۱۱۲)

ان پر ذلّت ماری گئی جہاں پائے گئے لیکن (جہاں عزّت حاصل ہے) وہ خدا کے ذریعہ اور لوگوں کے سہارے۔ اور اللہ کا غصّہ کمالائے، اور اُن پر (قومی) محتاجی ماری گئی۔ یہ اس لئے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے۔ یہ اس لئے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدودِ الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔

اس کے بالمقابل عام اہلِ کتاب سے کہا گیا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ

(المائدۃ : ۶۶)

اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو اُن کی طرف اُن کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا، اُس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکاتِ آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے (ارضی خیر و برکت) سے کھاتے۔

ایک اور موقع پر اشارہ ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ

اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کے کام کرتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین سے برکتوں کو کھولتے۔ لیکن

كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (الاعراف : ۹۶)

انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے اُن کے اعمال کی پاداش میں اُن کو پکڑ لیا۔

مگر یہ دارُالجزا فانی ہے لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہلِ ہوش کو باخبر رہنا چاہیئے۔ اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے مگر کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دارالجزا جس کا نام دنیا ہے، عارضی اور فانی ہے۔ یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے۔ اس لئے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیئے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربّانی سلطنت ہے جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے۔ اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں۔ اس لئے اس فانی دنیا کی لذّتوں میں پڑ کر اس کو بھول نہیں جانا چاہیئے۔ اُس مسافر کی عقلِ سلیم کی داد کون دے گا جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدا بہار وطن کو فراموش کر بیٹھے :

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ○ (الاعلیٰ : ۱۶-۱۷)

بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پائیدار ہے۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (یوسف : ۵۷)

اور بے شک آخرت کی مزدوری یہاں کی مزدوری سے بہتر ہے۔

اسی طرح گنہگاروں کے لئے یہاں کی ذلّت و رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلّت و رسوائی

کا مقام ہے:

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی	تو خدا نے اُن کو اس دنیاوی زندگی میں
الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ لَعَذَابُ	رسوائی کا مزہ چکھایا اور شبہہ نہیں کہ آخرت
الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا	کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے
یَعْلَمُوْنَ ○	اگر وہ جانتے۔

(الزمر: ۲۶)

اس دنیا کی ذلّت و رسوائی تو شاید سہہ بھی لی جائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہہ سکتا ہے کہ

وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰی ○	اور آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت
(طٰہٰ: ۱۲۷)	اور زیادہ دیرپا ہے۔

اس لئے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حُسنِ عمل کے بدولت جو زور و قوّت، جاہ و جلال نعمت و مال اور حکومت و سروری ملے اُن کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہیئے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہو گی۔ اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحیٔ حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

وَ ابْتَغِ فِیْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ	اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اُس سے
الْاٰخِرَةَ ۫ وَ لَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ	آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا
مِنَ الدُّنْیَا ۚ وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ	حصّہ نہ بھول۔ اور جس طرح خدا نے تجھ پر
اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَ لَا تَبْغِ	احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر)

الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ط	احسان کر اور (اس دولت سے) زمین
(القصص: ۷۷)	میں خرابی نہ چاہ۔

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لئے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائداد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ اُن کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودے کا خیال بھول کر بھی نہ آیا:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	تو اُن کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے
وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ	وارث ہوئے جو اس دنیا کے سامان و
عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ	اسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو
سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ	معاف ہوگا۔ اور اگر ویسا ہی سامان و
عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ	اسباب پھر آئے تو پھر لیں۔ کیا اُن سے
يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ	کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ
اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا	وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ
الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ	جو اس میں ہے وہ اُس کو پڑھ چکے ہیں
وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ	اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے
يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝	لئے بہتر ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

(الاعراف: ۱۶۹)

یہ دارالجزا دارالاصلاح بھی ہے | اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا اور اُس ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتا دیا کہ اُس مقام کا دائمی و ابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اور یہ دنیاوی زندگی اسی لئے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدا بہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے۔

پھر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے، سُدھرنے اور کامیاب بننے کے موقع عنایت کئے۔ رسولوں کی بعثت، معلّموں کی آمد، شریعت کی تعلیم پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ، گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر، عملِ خیر پر روحانی لذّت اور عملِ شر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لئے مقرّر ہوئے کہ اُس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اُس نے اپنی غایتِ رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لئے حسبِ ذیل مراتب مقرر کئے :۔

(۱) نیکی سے بُرائی کا کفّارہ۔ چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا اس لئے جس طرح اس دنیا میں اُس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلّہ بھاری ہو اُس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اُس کا کوئی ایک نیک کام امتیاز بردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اُس کی تمام اگلی بُرائیوں کی فرد دُھل جاتی ہے۔ اسی کا نام "کفارۂ عمل" ہے۔ چنانچہ وحیٔ محمدیؐ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ — بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ (ھود : ۱۱۴)

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقّی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ پورا نیکو کار انسان بن جاتا ہے۔ اور یہ بھی خوشخبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی۔ اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں :

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ
عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ○
(النساء : ۳۱)

تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے اگر
اُن میں کی بڑی باتوں سے تم بچتے رہو گے
تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اُتار دیں گے اور تم
کو عزّت کے مقام میں داخل کریں گے۔

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ
الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ
عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ
اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ
عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ج

(المائدۃ : ۱۲)

البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو
اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور ان
کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح کا
قرض دو گے تو میں تمہارے گناہ
کو اُتار دوں گا۔ اور تم کو اُن جنّتوں میں
داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی
ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ
اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ
عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ
الْجَنَّةِ ط (الاحقاف : ۱۶)

یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول
اور ان کی بُرائیوں سے درگزر کریں
گے۔

(۲) توبہ کفّارہ ہے۔ انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اُس کا دل ہے۔ اُسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اُسی سے ناپاک بنتا ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اُس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار

ہوکر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہوکر آیندہ کے لئے نکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرلے تو اس کا نام توبہ ہے۔ یہ توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں لاکر ڈال دیتی ہے۔ آدم علیہ السّلام کا قصور اور پھر اُن کی توبہ اور رحمتِ الٰہی کا رجوع، واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کے لئے ہمیشہ وا رہتی ہے۔ رحمتِ الٰہی کے اس پُرجوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی اور پیامِ نبوّت میں نظر آتی ہے اس سے ہندوستان کا ہر مَت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے پیامِ ربّانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا ربّ العلمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصّہ تھا۔ فرمایا:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ	مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور
صٰلِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ	نیک کام کئے تو وہ جنّت میں
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۝	داخل ہوں گے۔ اور اُن پر کچھ ظلم نہ
(مریم : ۶۰)	کیا جائے گا۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر اُن کی جگہ آپ لے لے گی:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ	مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور
عَمَلًا صٰلِحًا فَاُولٰٓئِكَ	اچھے کام کئے تو یہ وہ ہیں جن کی
يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ	بُرائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝	دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا رحم والا

(الفرقان: ۷۰) ہے۔

اور یہی اس کی شانِ رحمت کا اقتضا ہے۔ یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو اُن کو بھی بشارت ہے:

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(المائدۃ: ۳۹-۴۰)

تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سُدھارا تو بیشک اللہ اس پر رجوع ہوگا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ

وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝

(طٰہٰ: ۸۲)

اور بیشک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کئے اور پھر راہ پر چلا۔

لیکن توبہ کس کے لئے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ

اللہ کو ان کی توبہ قبول کرنی ضرور ہے جو نادانی سے بُرا کام کرتے ہیں پھر جلد توبہ کرتے ہیں۔ تو یہی وہ ہیں جن

فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ

کو اللہ معاف کرتا ہے۔ اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے۔ اور ان کی توبہ نہیں ہے جو بُرے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔

(النساء : ۱۷-۱۸)

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آیندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں۔ ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے اور اُس کے بعد اتفاقاً موت آجائے تو یقیناً رحمتِ الٰہی اُس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی:

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ ۙ رَّحِيْمٌ ○

اور جنہوں نے بُرے کام کئے پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا تو بیشک تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(الاعراف : ۱۵۳)

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ

اور جو کوئی بُرا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ

اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○ (النساء: ۱۱۰)

کی معافی چاہے تو وہ اللہ کو بخشش والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔

(۳) مصائب کی تنبیہ اور کفّارہ۔ دنیا میں انسان کو مصائب سے زیادہ بُری اور تکلیف دہ چیز کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن یہ حقیقت بُھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہشیار ہوکر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں۔ چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مُصیبتوں ہی کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے۔ صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبّت اور رحم، ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت ان ہی مصائب کے زیرِ سایہ ہوتی ہے۔ مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتّفاق مُصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے تو سنبھل جاتا ہے۔ اس لئے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لئے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ اُن کی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہوکر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت و نعمت اور کامیابی و مسرّت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اُتار اتّفاقی مصائب ہی کی تُرشی سے ہوسکتا ہے۔ انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہو اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے تو دفعۃً اُس کی آنکھیں کُھل جاتی ہیں۔ بیماری، تنگدستی، عزیزوں کی موت، آرزوں کی ناکامی، اُن میں سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھاکر سرمست سے سرمست راہ گیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہوشیار ہوجاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہوجاتی ہے۔ اس لئے ان مصائب میں انسانوں کے اعمالِ بد اور گناہوں کا کفّارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی تکلیف سے بندہ میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و اصلاح کی فکر کریں۔ فرمایا:

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○

(الاعراف: ۱۳۰)

اور بیشک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

(الاعراف: ۱۶۸)

اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا تاکہ وہ باز آئیں۔

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ○

(الاعراف: ۹۴)

اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا تاکہ وہ شاید گڑگڑائیں۔

مسلمانوں سے فرمایا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ

اور البتہ ہم کو تھوڑے خوف، بھوک

الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے۔ اور ان صابروں کو خوشخبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔

(البقرۃ: ۱۵۵-۱۵۷)

اس اصول کے تحت آنحضرتؐ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ[1]۔ (جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اُس کو دیا جائے گا) تو میں نے آنحضرتؐ سے اس کا مطلب پوچھا فرمایا کہ "یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ پر عتاب ہے۔ اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے جیسے اس کو بخار آجائے یا وہ کسی اور مصیبت سے دوچار ہو جائے یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچے وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا۔"[2] دوسری حدیثوں میں ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ "مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی ہے لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس کو اُس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے

---

[1] النساء: ۱۲۳۔ [2] یہ اور اس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتبِ حدیث میں ہیں مثلاً ترمذی تفسیر اواخر النساء، سنن ابی داؤد اوائل کتاب الجنائز۔

یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے۔" تیسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا غم یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اُس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اگر اُس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی۔" چوتھی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہنچے اللہ تعالیٰ اُس سے اُس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔[1]" پانچویں روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا، اور اُس کی سزا اُس کو یہیں مل گئی، تو وہ اس کے لئے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک وصاف بنانے والی ہے۔[2]"

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرارِ توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ، اعمالِ نیک اور مصائب پر صبر و شکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے۔ اور اس دنیا سے اُسی طرح پاک وصاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارۂ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی لئے قرآن پاک میں ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ	اور ہم البتہ اُن کو بڑے عذاب کے
الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ	پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھائیں
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○	گے تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔

(السجدۃ: ۲۱)

اس آیتِ پاک سے معلوم ہوا کہ عذابِ الٰہی کا مقصد انتقام اور نفسِ سزا اور عقوبت

---

[1] صحیح بخاری اوائل کتاب المرضیٰ میں یہ تینوں روایتیں ہیں۔ [2] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیۃ۔

نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے۔ اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ	اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ	اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں)
شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝	کا قبول کرنے والا (تمہارے ہر عمل کو)
(النسآء، ۱۴۷)	جاننے والا ہے۔

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اور عالم برزخ اور عالم بعث چونکہ نئے عمل کے محل نہیں اس لئے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا۔ صرف گذشتہ بد اعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے۔ اور یہی عالم برزخ اور عالم بعث کے عذابوں کا مقصد ہے الّا یہ کہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عذاب برزخ بھی کفّارہ ہے لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفّارے بھی اُس کو دھو کر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمالِ بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اُٹھا کر پاک وصاف بننا پڑے گا۔ یہی عالم برزخ کا عذاب ہے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لئے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اُٹھائی اور اچھّے کاموں کے کرنے سے جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے اُس کو برداشت کر کے اچھّے کام جو نہیں کئے ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آکر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں تاکہ حیات ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک وصاف ہو سکیں تو پاک وصاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے

قابل بن سکیں جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے یعنی اُن کی ہے جو یا سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے مگر اعمالِ نیک، توبہ اور مصائب میں صبر و شکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پا گئے۔

یہ بات کہ عذابِ برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفّارہ ہے اسلام کے اس اصول سے مترشّح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفّارہ ہے۔ اس بنا پر عذابِ برزخ بھی اس کے گناہ کا کفّارہ ہوگا۔ قرآن پاک کی بعض آیتوں سے یہ بات بھی کنایۃً نکلتی ہے؛ گنہگار حشر کے دن کہیں گے:

وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (الانعام: ۱۲۸)	اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا، پہنچ چکے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمرؓ طول مقام امتی فی قبورھم تمحیص لذنوبھم۔ (کنز العمال، باب عذاب القبر جلد ہشتم)	ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمّت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طولِ قیام اُن کو گناہوں سے خالص کرتا ہے۔

اسی لئے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اکثر عذاب امتی فی قبورھم[1]	میری امّت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔

[1] اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ اباب الوقائع الحشریہ میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا اصل ماخذ معلوم نہ ہو سکا۔

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ اُمّتِ محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانۂ عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہو کر جنّت کے قابل ہو جائیں گے اور عذابِ دوزخ کی ضرورت اُن کو پیش نہ آئے گی۔ حافظ ابنِ قیم ایک موقع پر لکھتے ہیں:

فان وفت بالخلاص منها	اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں
فی هذه الدار والا ففی	نجات کے لئے پورا ہو گیا تو خیر ورنہ برزخ
البرزخ فان وفی بالخلاص	کی سزا سے علاج کیا جائے گا۔ تو اگر یہ
والا ففی موقف القیامة	نجات کے لئے کافی ہو گیا تو خیر ورنہ پھر
واهوالها ما یخلصهم من	قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی
تلك البقیة[1]	بیماریوں سے نجات دلائیں گی۔

رویائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گذر چکی ہے وہ منظر دکھایا گیا ہے جس میں گنہگار عذاب کے دَور سے نکل کر اور نہرِ حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں[2]۔ غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ج	اور جس دن وہ اُن سب کو اکٹھا کرے گا۔
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ	اے گروہِ جن! تم نے بہت سے انسانوں
الْاِنْسِ ج وَقَالَ اَوْلِيٰٓـؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ	کو اپنا بنا لیا۔ اور اُن کے دوست انسان
رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ	کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم میں
وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ	سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا۔
لَنَا ط	اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے

---

[1] شفاء العلیل لابن القیم۔ [2] صحیح بخاری: کتاب التعبیر۔

(الانعام: ۱۲۸) لئے ٹھہرایا تھا پہنچ چکے۔

یہ الفاظ کہ "ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا پہنچ چکے" یہ معنی رکھتے ہیں کہ "عالم برزخ" کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس لئے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے۔ جواب ملے گا:

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○

فرمائے گا۔ آتشِ دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا اس میں سدا رہو گے لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے۔ بیشک تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔

(الانعام: ۱۲۸)

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی۔ اس لئے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے۔ پھر جب خدا چاہے گا تم کو اس سے نجات دے گا۔ اُس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے علم و حکمت اور مصلحت کا جب تقاضا ہو گا تم کو نجات[1] ملے گی۔

عذابِ دوزخ کفّارۂ گناہ ہے

ابھی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ○

خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام۔ اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا تمہاری شکر گذاری کو قبول کرنے والا اور تمہارے دلوں کے حال کو جاننے والا ہے۔

(النسآء، ۱۴۷)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو گنہگاروں کے عذاب سے کوئی خوشی نہیں حاصل

---

[1] حسبِ تفسیر ابنِ عباسؓ، ابنِ جریر طبری جلد ہشتم۔

ہوئی۔ نہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے گنہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں۔ لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیئے ہیں وہ اُن کو توڑتا بھی نہیں۔ جس وقت آدم علیہ السلام کو جنّت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لئے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنّت کو دوبارہ ہمیشہ کے لئے حاصل کریں، اسی وقت یہ قانون بھی اُن کو سُنا دیا گیا تھا:

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا	یہاں سے تم سب اُترو۔ تو اگر تمہارے
يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ	پاس میری طرف سے کوئی ہدایت اُترے
هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا	تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اُن پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ غمگین ہوں
وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ	گے۔ اور جنہوں نے ناشکری کی اور ہماری
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝	نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے
(البقرۃ: ۳۸-۳۹)	ہوں گے۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت میں مستحقِ دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک کفران اور دوسری تکذیب۔ دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان اُن کے بالمقابل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاقِ جنّت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاقِ دوزخ کے اسباب ہیں۔ بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروع اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لئے نہیں بنایا کہ وہ اُن کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے بلکہ اُس نے تو اُن کو اپنی رحمت کے ظہور کے لئے پیدا کیا غیظ و غضب کے لئے نہیں۔ فرمایا:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ط إِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

(الاحزاب : ۷۲-۷۳)

ہم نے یہ امانت آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو اُن سب نے اُس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور ڈر گئے۔ اور انسان نے اُس کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا تاکہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو۔ اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

اس آیتِ پاک سے صاف ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصل صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے یعنی بخشش و رحمت اُس کی صفتِ ذاتی ہے۔ اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لئے وہ اپنے کو رحمتِ الٰہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے:

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

(التوبہ : ۷۰)

اللہ نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا۔ لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں:

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝

(المومن : ۳۱)

اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے:

لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی ○ (طٰہٰ : ۱۵)

کہ ہر جان کو اپنے ہی کئے کا بدلہ دیا جائے گا۔

اس لئے بہشت یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس غرض ہر اچھے یا بُرے فعل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے جو ہم کو اُس دوسرے عالم میں ملے گا۔ تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مر کیوں گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان کے اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایتِ رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے۔ ہم کو اُس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی۔ اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو اُن اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ م بَعْدَ الرُّسُلِ ط (النسآء : ۱۶۵)

یہ رسول بھیجے نیکوں کو خوش خبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (الانبیاء: ۱۰۷)

ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول سے انکار کیا اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا۔ اور جس غرض سے خدا نے اُن کو پیدا کیا تھا اُس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ○ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ط وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ط (هود: ۱۱۷-۱۱۹)

اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا درانحالیکہ ان کے رہنے والے نکوکار ہوتے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا (لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یونہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہوا۔ اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کے لئے بنایا ہے عذاب کے لئے نہیں لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا سزاوار اپنے کو ٹھہرا لیتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں:

لِلرحمة خلقهم ولم يخلقهم للعذاب (طبری جلد یازدهم)

خدا نے انسانوں کو رحمت کے لئے پیدا کیا عذاب کے لئے نہیں۔

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اُس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمٰن و رحیم جس کا یہ اعلان ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط	اُس (خدا) نے (مخلوقات پر) رحمت کو
(الانعام: ۱۲)	اپنے اوپر واجب کرلیا ہے۔
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى	تم پر سلامتی ہو تمہارے رب نے
نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لا	رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا
(الانعام: ۵۴)	لیا ہے۔
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ	اور میری رحمت نے ہر چیز کو سما
(الاعراف: ۱۵۶)	لیا ہے۔
وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ط	اور تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت
(الکہف: ۵۸)	والا ہے۔
ورحمتی سبقت غضبی	اور میری رحمت میرے غضب پر
(صحیح بخاری)	سبقت لے گئی۔

وہ اپنے گنہگار و سیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لئے اپنا منھ موڑ لے گا۔ حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں بلکہ بے غرض ہے۔ فرمایا:

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ط	اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا
(الانعام: ۱۳۳)	ہے۔

اور تسلی دی ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى	اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے

اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ	اوپر آپ ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت
اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ	سے نا امید نہ ہو۔ خدا سب گناہوں
جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ	کو معاف کرتا ہے۔ بے شک وہی
الرَّحِيْمُ ○	بخشنے والا رحمت والا ہے۔

(الزمر: ۵۳)

اُس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے اُس دنیا میں بھی ہوگا۔ اور وہاں اس کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر اُس کے مقامِ لعنت (دوزخ) سے دوری اور اُس کے مقامِ رحمت (بہشت) سے قرب ہے۔ فرمایا:

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ	جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا وہی
رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ○	ہے جس پر اُس نے اپنی رحمت کی۔ اور
(الانعام: ۱۶)	اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا یہ تقاضا ہے کہ وہ گنہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اُن کے نتائجِ عمل کے بھگت لینے کے بعد آخر کار اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور وہ اُن کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ

دوزخ قید خانہ نہیں شفاخانہ ہے

انسان جب عدم حفظِ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں، بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریوں کے

جو بُرے نتائج انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں اُن کو دُور کرنے کے لئے جسم جدوجہد کرتا ہے۔ اس لڑائی کا نام بیماری اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے جن کو ہم دردِ سر، دردِ شکم، اعضا شکنی اور بیخوابی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے جن کو ہم اصطلاحِ شرعی میں گناہ اور جن کے نتائجِ بد کو "عذاب" کہتے ہیں۔ یہ نتائج آتشِ دوزخ اور اُس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روحِ انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائجِ بد کو دور کرنے کے لئے جدّوجہد میں مصروف ہوگی اور جونہی وہ اُن سے عہدہ برآ ہوگی خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کے اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لئے قید خانہ ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کے لئے شفاخانہ ہے۔ بیمار کو شفاخانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں۔ درد، اعضا شکنی، شدّتِ تشنگی، سوزشِ جسم، وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اُس کو نشتر دیا جاتا ہے اُس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے اور ان سب کی تکلیفیں اُس کو اُٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری "ایذاءِ رسانی" کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ عدمِ صحت کی غلط کاریوں کے بُرے نتائج سے اُس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے۔ اُس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفاخانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفاخانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصولِ صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول اُن آیتوں اور صحیح حدیثوں سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن

نے یہ اصول پیش کیا ہے:

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک و
وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ○	خالص کرے اور کافروں کو
(آل عمران: ۱۴۱)	مٹائے۔

یہی اصول عذابِ آخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہلِ ایمان کی پاکی وصفائی ہے۔ چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوقِ عباد کے بعد

حتّٰی اذا ھذبوا و نقوا اذن	یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں
لھم فی دخول الجنۃ	گے اور پاک وصاف ہو جائیں گے
(صحیح بخاری، باب القصاص،	تب ان کو جنّت میں داخل ہونے
یوم القیٰمۃ)	کی اجازت ملے گی۔

اس حدیث میں یہ دو لفظ ھُذِّبُوا وَ نُقُّوْا۔ ذرا تشریح طلب ہیں۔ ھذبوا کا مصدر تھذیب ہے۔ تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لئے چھانٹ دی جائیں تاکہ اُن میں سرسبزی وشادابی پیدا ہو اور ترقّی کی نئی زندگی اُن کو مل جائے۔ اور نَقُّوا کا مصدر تنقیہ ہے۔ تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب وفاسد مادّہ کو الگ کر دیا جائے تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے۔ اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگاروں کو جنّت کے داخلہ کے لئے کیا درکار ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں ہے کہ اہلِ جنّت جب جنّت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی:

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○	تم پاک وصاف ہو چکے تو جنّت میں
(الزمر: ۷۳)	سدا کے لئے آجاؤ۔

الغرض جب اُس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملے گی۔ اسی لئے ہر گنہگار کے لئے دوزخ سے نکلنے کی مدّت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہر حال اُس کی انتہا ہے۔ فرمایا،

لَابِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ○ (النباء : ۲۳)

دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔

لیکن بالآخر ان صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا اور خدا نے چاہا تو اُن کو نجات ملے گی۔

حدیثِ رویائے برزخ میں ہے کہ "آپؐ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ بُرے کام کئے تھے۔ اُن کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت تھا۔ جب اُن کی سزا کی مدّت ختم ہوئی تو فرشتوں نے اُن سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جاکر پڑ جاؤ۔ سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سپید پانی بہ رہا تھا۔ وہ اس میں جاکر پڑ گئے۔ پھر نکل کر آئے تو ان کی وہ بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت[1] ہو گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گنہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گنہگاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود بیماروں کے لئے نعمت ہے۔ اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہگاروں کی پاکیزگی اور پاکوں کی جنّت میں اُن کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اُس رحمان و رحیم کی رحمت و کرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو اُن کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لئے محروم رکھا جائے۔ اس لئے ان کی صفائی کے لئے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا۔ اور جو اس سے بھی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التعبیر۔

پاک نہ ہوسکیں ان کے لئے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلاکر نکھر کر پاک ہو جائیں اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں۔ اس نظریہ کو پیشِ نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھئے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ ۙ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَن ذَنبِهِ إِنسٌ وَلَا جَانٌّ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ۝ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا

تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوڑیں گے پھر کوئی تمہاری مدد نہ کرسکے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے۔ پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہوجائے گا۔ تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے۔ پھر اس دن کسی انس و جن سے اس کے گناہ کی نسبت پوچھا نہ جائے گا۔ تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ گنہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لئے جائیں گے۔ پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے۔ تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے۔ یہ وہ دوزخ ہے جس کو گنہگار جھٹلاتے تھے۔ وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے۔ تو تم اپنے

تُكَذِّبٰنِ ○ — پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

(الرحمٰن: ۳۵-۴۵)

ان آیتوں کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجئے یہ بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں کے حق میں نعمت ہیں۔ اِس لئے بھی کہ دنیا میں وہ اُن کے ڈر سے بُرائیوں کو چھوڑ کر راہِ راست پر آتے ہیں اور اس لئے بھی کہ آخرت میں وہ انہی کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائجِ بد سے بَری ہو کر بہشتِ رَبّانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ میں رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا قائل اور رسولوں کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہگار ہو تاہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی۔ قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب و جلال کا روز ہوگا جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا مگر بالآخر اس رحمان و رحیم کی شانِ رحیمی کا ظہور ہوگا اور رحمتی سبقت غضبی (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کا مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔ اور گنہگاروں کو اُس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک وصاف ہو کر پاکوں کی بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی۔ فرمایا:

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ (التغابن: ۹)

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے اُس سے اس کی بُرائیاں جھاڑ دے گا اور اُس کو جنّت میں داخل کرے گا۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ

اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام

سَيِّئًا ط عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

نیک اور دوسرا بد، شاید اللہ اُن کو معاف کرے۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

(التوبۃ: ۱۰۲)

اس معافی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کردے۔ دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جاکر خدا کی معافی سے سرفراز ہوکر اُس سے نکلیں۔ فرمایا:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ج كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ○ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ○

اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے۔ پھر ہم اُن کو جو خدا سے ڈرے نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

(مریم: ۷۱-۷۲)

احادیثِ صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرتؐ کی حسبِ ذیل تصریحات مذکور ہیں:۔

(۱) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے"۔[۱]

(۲) حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "دوزخ سے کچھ لوگ اُس کی جُھلس کھاکر نکلیں گے اور جنّت میں داخل ہوں گے"۔[۲]

(۳) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "جنّت والے جنّت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہوچکیں گے تو خدا فرمائے گا کہ جس کے

---

[۱]، [۲] صحیح بخاری: کتاب الشفاعۃ۔

دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو۔ تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے۔ پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیئے جائیں گے تو وہ اس طرح اُگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اُگتا ہے[1]۔

(۴) حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا "پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا اور پڑا رہوں گا تو آواز آئے گی کہ اے محمدؐ! سر اٹھا۔ مانگ۔ دیا جائے گا۔ تو میں سر اٹھاؤں گا اور اُس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا اُس کی حمد کروں گا۔ اور سفارش کروں گا۔ تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں اُن کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنّت میں داخل کروں گا۔ پھر لوٹ کر آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا۔ پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا۔ اسی طرح تیسری پھر چوتھی بار کروں گا۔ یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا جس کو قرآن نے روک رکھا ہے[2]"۔

(۵) حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "محمدؐ کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنّت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنّم والے ہو گا[3]"۔

(۶) حضرت ابوہریرہؓ کے سوال پر آپؐ نے فرمایا کہ "میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہو گی جس نے خلوصِ قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو[4]"۔

(۷) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا۔ فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی

---

[1]، [2]، [3]، [4] صحیح بخاری، کتاب الشفاعۃ۔

کے نشانِ سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے تو وہ اُن کو جلا نہ سکے گی۔ فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جُھلسے ہوں گے۔ پھر اُن پر آبِ حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح اُگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اُگتا ہے[1]۔"

(۸) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جنّت والے جنّت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اُس کو دوزخ سے نکالو تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے۔ پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیئے جائیں گے تو اس طرح وہ اُگیں گے جس طرح سیلِ آب کے کنارے جنگلی دانہ اُگتا ہے[2]۔"

(۹) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "اہلِ دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہ مریں گے نہ جئیں گے۔ لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی تو وہ اس میں کچھ دیر کے لئے مر جائیں گے یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے۔ پھر اُن کے حق میں شفاعت کی اجازت ہو گی تو وہ جھوڑے جھوڑے کر کے آئیں اور جنّت کی نہروں میں پھیل جائیں گے۔ اور اہلِ جنّت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اُگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے[3]۔"

(۱۰) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا اور اس کو جنّت بھری معلوم ہو گی[4]۔"

(۱۱) حضرت ابوسعید خدریؓ سے صحیحین میں روایت ہے کہ خدا فرمائے گا کہ "ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی اور اہلِ ایمان نے سفارش کی۔ اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الشفاعۃ۔ [2]، [3] صحیح بخاری: کتاب الایمان۔ [4] صحیح بخاری و مسلم۔

رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے یعنی خود وہ رحمان ورحیم تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔[1]

(۱۲) حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ "حکم ہوگا کہ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو اور اُس کے دل میں جَو برابر بھی نیکی ہو اُس کو دوزخ سے باہر کرو۔ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اُس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو اور جَو کے دانہ کے برابر بھی اُس کے دل میں نیکی ہو اُس کو دوزخ سے الگ کرو۔"[2]

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں۔ ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ	بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا
بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ	کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے اور
یَّشَآءُ ط	اُس کے سوا جو گناہ ہے وہ اُس کو جس کے
(النساء : ۱۱۶)	لئے چاہے گا معاف کر دے گا۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے برأت کی جا سکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے ان کے نتائجِ بد بھگتے بغیر نجات کا تصوّر بھی خدا کے قانونِ ابدی کے خلاف ہے۔

شرک وکفر کی بخشایش نہیں | احکامِ الٰہی اور شریعتِ ربّانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلّق دل اور قلب سے ہے اور جو بمنزلۂ اصل کے ہے۔ اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم اور تصوّف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو اُس

---

[1] صحیح بخاری ومسلم۔ [2] ترمذی، صفۃ النار، حدیث حسن صحیح۔

عقیدۂ اوّل کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلّق اعضاء اور جوارح سے ہے۔ اُس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں۔ شرک و کفر کے گناہ کا تعلّق قسم اوّل سے اور دوسرے گناہوں کا تعلّق قسم دوم سے ہے۔ دلوں میں ایمان و عمل و عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ کی روشنی کی اُمید کسی طرح کی جاسکتی ہے۔ مگر جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرّہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لئے ناامیدی ہے۔ اسی لئے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے اعمالِ خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے۔ البتہ اعمالِ شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے جن کی تلافی عذابِ دوزخ کے بعد یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے۔ ایمان و علم و عرفان جس کی حقیقت "ایمان بالغیب" ہے اُس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں تو ہماری سعادت کا نتیجہ نہیں بلکہ خود اُن حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا۔ اس بنا پر شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے۔ البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لئے ان دونوں کی کُھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لئے تینتیس نمبروں کو کم از کم فرض کیا گیا ہے۔ اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لئے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لئے بھی یہ ناممکن ہے کہ اُس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے۔ لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیئے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ انتیس اور تیس کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحمدل ممتحن تینتیس تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان و علم و عرفان کے مجرم جن کا نام مشرک و کافر ہے اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ

کے بھگتے بغیر عذابِ دوزخ سے رہائی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ اُن کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔ مگر کیا شرک وکفر کے گنہگاروں کے لئے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصوّر کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟ دوزخ جو عقابِ الٰہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے[1]۔ اُن کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرّرہ

---

[1] ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل ونحل کی کتابوں میں موجود ہے۔ ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنّت کا وجود دائمی اور ابدی ہے۔ لیکن جہنّم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے۔ عام اہلِ سنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنّم اور جنّت دونوں کا وجود دائمی اور ابدی ہے۔ گنہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اُٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنّت میں داخل کئے جائیں گے۔ لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے۔ فقہاء اور محدّثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہوگا وہ گنہگار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنّت میں داخل ہوگا۔ اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفّار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہے گا اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہلِ سنّت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابۂ کرامؓ اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جس کے پُرجوش حامی حافظ ابنِ قیم ہیں یہ خیال ہے کہ جب گنہگار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو جہنّم فنا کر دیا جائے گا۔ حافظ ابنِ قیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح (دونوں مطبوعہ ہیں، حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے) میں قرآن، احادیث، آثارِ صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے۔ (دیکھو شفاء العلیل اور حادی الارواح جلد دوم)۔ علّامہ ابنِ تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہلِ سنّت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے۔ (حادی الارواح ابنِ قیم جلد دوم)۔ ایک (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

مدّتِ دراز کے بعد ایک دن آئیگا جب جہنّم کی آگ رحمتِ الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی۔ حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جنّت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے"[1] اسی کے ساتھ حدیثِ صحیح میں وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا اُسی وقت اُس نے اپنے عرش کے اُوپر یہ لکھ دیا کہ

رحمتی سبقت غضبی[2] میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔

اب اگر دوزخ جو اُس کے غضب کا مظہر ہے اُس کی جنّت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اُس کا غضب اُس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے یا برابر ہوا جاتا ہے اور اُس کا تخیّل بھی اُس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصّوں میں سے صرف ایک حصّہ دنیا میں اُتارا اور ننانوے حصّے قیامت کے دن کے لئے رکھّے ہیں[3]۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اُس کے غضب پر اُس کی رحمت غالب آئے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔ اور یہ وہ دن ہو گا جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۹۹ کا) زیدی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے (العلم المشائخ فی ایثار الحق علی الآباء والمشائخ)۔ صوفیہ میں شیخ محی الدین ابنِ عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلودِ نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ اُن کو اسی دوزخ میں راحت و لذّت معلوم ہونے لگے گی۔ جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں اور ان ہی میں لُطف اٹھاتے ہیں۔ میں نے اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمالِ الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے۔ اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور توبہ کی توفیق بخشے اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھول دے۔

[1] صحیح بخاری باب رحمۃ اللہ، جلد دوم و صحیح مسلم۔ [2] صحیح بخاری باب وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ جلد دوم و صحیح، مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ۔ [3] صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ۔

گنہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اُس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بنیں گے۔

اسلام کی رُو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں جو اُس وقت تک نجات نہ پاسکیں گے جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے۔ تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت بھی قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں:

۱۔ لَابِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ○ (النبأ: ۲۳)

وہ دوزخ میں صدہا ہزار سال ٹھہریں گے۔

صدہا ہزار سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو پھر بھی ایک دن اُس کا خاتمہ ہوگا۔ دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے:

۲۔ اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ (الانعام: ۱۲۸)

دوزخ ہے تمہارا ٹھکانا اُس میں تم سدا رہنے والے ہو لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے۔ بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے مگر اس کی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے۔ لیکن وہ حکیم و علیم ہے اس لئے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیئے اور کب کرنا چاہیئے۔

تیسری آیت میں ہے:

۳ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ

وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ○

تک آسمان وزمین قائم ہیں۔ لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

(ھود : ۱۰۷)

دوسری اور تیسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں اپنی مشیئت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو "رب" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیئت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہوجانا اُس کی "ربوبیت" کا اقتضا ہے۔

قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف وصریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام، عدمِ انتہا اور تسلسلِ وجود پر تصریح استدلال کیا جاسکے۔ حالانکہ اُس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی وبقا اور عدمِ انقطاع وعدمِ فنا کی بیسیوں آیتیں قرآنِ پاک میں موجود ہیں چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام وکمال یہاں نقل کرتے ہیں فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۙ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ○ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ

تو لیکن جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے۔ اُس میں اُن کو گدھوں کی طرح چلّانا اور رینگنا ہے۔ جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے مگر جو چاہے تیرا رب۔ بیشک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے۔ اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے تو وہ

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝

(ھود : ۱۰۶ - ۱۰۸)

جنّت میں ہوں گے۔ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ جب تک آسمان وزمیں قائم رہیں مگر جو چاہے تیرا رب۔ یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔

دیکھو کہ اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ دونوں کے لئے خلود دوام فرمایا۔ پھر ان دونوں میں اُس کے بعد اپنی مشیّت سے استثنا فرمایا مگر اہلِ دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ "مگر جو چاہے تیرا رب۔ بیشک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے اور چاہے تو قائم رکھے۔ لیکن اہلِ جنّت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا "مگر جو چاہے تیرا رب۔ یہ غیر منقطع بخشش ہوگی" اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنّت کے حق میں اُس کی مشیّت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام وتسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم اور باقی رہے۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد ائمۂ سلف مثلاً ابنِ زید اور شعبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنّت کے بارہ میں تو اپنی مشیّت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے لیکن اہلِ دوزخ کی نسبت اپنی مشیّت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے[1]۔

ایک مقام پر خاص طور پر کفّار ومشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

بیشک اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں۔ یہ بدترین لوگ ہیں۔ بیشک جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ

---

[1] تفسیر طبری، درمنثور سیوطی، تفسیر آیاتِ ہود رکوع ۹ والانعام رکوع ۱۵

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ
هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ؕ

بہترین لوگ ہیں۔ ان کی جزا اُن
کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے
باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہوں وہ
اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے

(البینۃ : ۶-۸)

غور سے دیکھو کہ اس میں اہلِ دوزخ کے مقابلہ میں اہلِ جنّت کے دوام کی نسبت کتنی تاکید پر تاکید ہے۔ پہلے "عدن" فرمایا جس کے معنی "قیام" اور "بسنے" کے ہیں۔ پھر "خالدین" کہا کہ وہ اس میں "رہا کریں گے" بعدازیں "ابدا" فرمایا کہ وہ جنّت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے:

وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

اور اُس کو ان باغوں میں داخل کرے
گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں
گی۔ جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور
وہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جنہوں
نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا
وہی دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں
رہا کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔

(التغابن : ۹-۱۰)

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور خالدین فیھا ابدا (ہمیشہ

رہا کریں گے، کا فرق کتنا نمایاں ہے۔ کہیں یہ کیا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کی تعیین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرمادی گئی ہے۔ مثلاً :

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ	جس دن کچھ منھ سپید ہوں گے اور
وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ	کچھ سیاہ۔ تو جو سیاہ ہوئے تو کیا ایمان کے بعد
وُجُوهُهُمْ ۖ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ	کافر ہو گئے تھے؟ تو اپنے کفر کی
إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ	پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔ اور
بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا	جن کے منھ سفید ہوئے تو وہ اللہ
الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي	کی رحمت میں ہوں گے اور اُس
رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝	رحمت میں سدا رہیں گے۔

(آل عمران : ۱۰۶ - ۱۰۷)

آیتِ بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تام ہے۔

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرتؐ اور بعض صحابۂ کرامؓ سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا جب دوزخ کے میدان میں ہُو کا عالم ہوگا اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا۔ چنانچہ

(۱) طبرانی میں حضرت ابوامامہؓ صحابی سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جب خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گا اور اُس کے دروازے کھل جائیں گے۔

(۲) حضرت جابرؓ یا کسی اور صحابیؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جہنم پر ایک

دن ایسا آئے گا جس میں اُس کے دروازے کھل جائیں گے اور اُس میں کوئی نہ ہوگا۔"

(۳) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم میں ایک دن ایسا آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔"

(۴) تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ "اگر اہلِ دوزخ ریگستانِ عالج کے ذرّات کے شمار کے بقدر بھی دوزخ میں رہیں پھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اس سے نکلیں گے۔"

(۵) عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ "جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس کے خالی دروازے بھڑ بھڑائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔ اور یہ اُس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدّت پوری کرلیں گے۔"

(۶) عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ صحابی یا ابوسعید خدریؓ صحابی یا کسی اور صحابیؓ نے فرمایا کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کا استثنا پورے قرآن پر حاوی ہے۔ یعنی جہاں جہاں قرآن میں خَالِدِيْنَ فِيْهَا (سدا اس میں رہیں گے) ہے وہاں مشیّتِ الٰہی کا استثنا قائم ہے۔

(۷) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا جب اُس کے خالی دروازے[1] کھڑکھڑائیں گے۔"

---

[1] حافظ ابنِ قیم نے شفاء العلیل میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتبِ تفسیر (حدیث) سے نقل کیا ہے۔ اُن میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورہ ہود جلد یازدہم میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر دُرِّ منثور تفسیر سورہ ہود، جلد ثالث میں زیرِ آیتِ مذکورۂ ہود ذکر کیا ہے۔ اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی مطبوعہ الہ آباد میں چھٹی روایت ہے۔

دفعِ شبہہ قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے۔ مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا (ہمیشہ کے عذاب) کی دھمکی دی گئی ہے:

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَاَعَدَّ لَھُمْ سَعِیْرًا ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا ۚ

(الاحزاب : ۶۵-۶۵)

بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

۲۔ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ۝

(الجن : ۲۳)

اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اُس کے لئے جہنم کی وہ آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا ۝ اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ؕ

(النسآء : ۱۶۸ - ۱۶۹)

بیشک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ اُن کو راہ دکھائے۔ لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔

ان تینوں آیتوں میں خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اُس وقت تک دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک حسبِ مشیّتِ الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔

باقی چند آیتوں میں اَبَدًا (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالدًا ہے جیسے

هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ — وہ اس میں خالد رہیں گے۔

یا ایک جگہ ہے:

وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ — اور "خلود" کے عذاب کا مزہ چکھو۔

(السجدۃ: ۱۴)

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیئے کہ خلود کے دو معنی ہیں۔ ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیامِ طویل۔ ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی۔ اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لئے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں کیونکہ وہ تادیر اور زمانۂ دراز تک باقی رہنے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تنہا خالدین کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے۔ جیسا کہ یہ قرینہ اُن آیتوں میں ہے جہاں اہلِ جنّت کو خٰلِدِیْنَ کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں۔ اس لئے جنّت کے سلسلہ میں جہاں صرف خٰلِدِین بھی ہے وہاں ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لئے جائیں گے۔ برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خٰلِدِین کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اس لئے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار زمانۂ دراز تک دوزخ میں رہیں گے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ گنہگار اہلِ ایمان کی سزا میں کبھی خٰلدین کے ساتھ ابداً استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ گنہگار اہلِ ایمان میں سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو۔ مگر اس کے لئے بھی خالدین کے ساتھ

ابداً استعمال نہیں کیا گیا۔ فرمایا:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	اور جو کوئی کسی باایمان کو قصداً قتل کرے گا
فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا	تو اس کا بدلہ دوزخ ہے جس میں وہ خالدًا
(النسآء ۹۳)	(یعنی مدت دراز تک پڑا) رہے گا۔

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہلِ اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشائش کے قائل ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں خلود سے مراد "ہمیشگی" نہیں ہے بلکہ زمانۂ دراز ہے کہ اہلِ توحید کی بالآخر نجات قرآن وحدیث کی متفقہ تعلیم ہے۔ اور اس لئے مومن کے لئے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں ان آیتوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں بلکہ عرفی دوام یعنی مدت دراز کے ہیں۔ ہم عام طور سے مجرم کے لئے "حبسِ دوام" کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد ابد تک کیا قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ عمر بھر بھی نہیں۔ بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی دراز ترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے۔ کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفوِ عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ گنہگار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝	بے شک گنہگار دوزخ میں ہیں۔
يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ وَمَا	وہ انصاف کے دن اس میں داخل
هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝	ہوں گے اور وہ اس سے چھپے

(الانفطار : ١٤-١٦)

نہیں رہ سکتے۔

٢- وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝

اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے۔ اللہ اُن کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر اُن کو دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔

(البقرة : ١٦٧)

٣- اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝

بے شک جنہوں نے کفر کیا اگر اُن کی ملکیت میں کُل روئے زمین ہو اور اتنا ہی اور ہوتا کہ اُس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں تو وہ اُن کی طرف سے قبول نہ ہو۔ اور ان کے لئے درد ناک عذاب ہے۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں لیکن وہ اس سے نکلنے والے نہیں۔ اور ان کے لئے قائم عذاب ہے۔

(المائدة : ٣٦-٣٧)

٤- كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ

جب وہ چاہیں اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا

وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○ (الحج، ۲۲)

دیئے جائیں گے۔ اور دکھا جائے گا کہ جلنے کی سزا چکھو۔

۵۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ○ (السجدۃ، ۲۰)

اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دیئے جائیں گے۔ اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذابِ دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے۔ مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو اُن کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی۔ پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گنہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا تو یہ محال ہے کہ عذاب سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے تو اب کے ہم نیکی کا کام کریں گے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں۔ تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جا سکتی اور نہ وہاں سے کوئی کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی

میں ڈال دیا جائے گا۔ ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے اور نہ مدتِ عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں۔ مگر اس سے خدائے تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی۔ اور نہ اُس کی کہ بقدرِ گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی۔ اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گنہگاروں کے لئے دوامِ عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے۔ مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوامِ بقا اور عدمِ فنا یا اُس کے عذاب کے عدمِ انتہا کی تصریح ہے۔ حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدمِ انقطاع کی تصریح بار بار اور تکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گنہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا یقیناً بُرائی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی قدّوسیت کا دامن تمامتر پاک ہے کہ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ[1] تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا[2]۔ اُس کا وعدۂ جنت پورا ہی ہوگا۔ لیکن اگر بُرائی کا بدلہ حسبِ تہدیدِ سابق بُرائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابلِ ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے جس کا اہل اُس رحمان و رحیم اور عَفُوٌّ غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں۔ اس لئے گنہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اُس نے فرمایا ہے، اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ چنانچہ مسند ابو یعلیٰ میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپؐ

---

[1] آلِ عمران: ۱۹۴۔ [2] مریم: ۶۱۔

نے فرمایا کہ "خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا۔ لیکن جس کسی کو اس کے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اُس کو اختیار حاصل ہے۔[1]"

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک وصاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات وکنایات کے بجائے اُن کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ اُن مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا کیونکہ اُس سے اُن میں ندامت اور توبہ کے رجحان کے بجائے خودسری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور اُن میں آئندہ کے نتائج بد سے نڈرپن اور بے خوفی آجاتی۔ اور ایسا نہ ہونا تنبیہ وصلاح وتدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا۔ اس لئے اُن کی قانونی سزا تو اللہ تعالیٰ نے دائمی عقاب مقرر فرمائی لیکن آخر کار اُن کی نجات کو اپنی مشیت اور علم ومصلحت کے سپرد فرما کر ان کو یک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا۔ اور امید وبیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا۔ اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعتاً معاف ہو جاتے ہیں۔ اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا۔ اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمالِ بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں، خدا چاہے بھی تو معاف نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے آکر ترازو کے اُن دونوں پلّوں کو

---

[1] بحوالہ شفاء العلیل ابن قیم۔

برابر کر دیا۔ ایک طرف فرمایا کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ[1] (ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے) اور دوسری طرف فرمایا یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ[2] (خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے) یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے۔ مگر خدائے تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے۔ جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ گو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں، جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں، مگر بایں ہمہ اس کا حکم اور اُس کی خواہش اور مصلحت اُن پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچا لیا اور دوسری طرف خدا کی قدرتِ تام اور رحمتِ عام کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا۔ سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزارہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ اُن کی تسکین کے لئے کافی ہوتے۔ دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پا جاتا ہے۔ چوری، عمل خلافِ قانون یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے؟ مگر اُس کے مُعاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کو خلافِ عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں، مہینوں بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں جا کر کہیں اُن چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے۔ اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت

---

[1] المدثر: ۳۸۔ [2] المائدہ: ۱۸۔

عمر بھر اُس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت یکسانی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے اُس کی تلافی کی مدت، غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت اور خلاقِ عالم کی مصلحت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے۔ اسی لئے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لئے یکساں نہیں ہو سکتی۔

واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

مشرک و کافر کا آخر انجام؟ اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی تو کیا اہلِ کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم و کرم کے سزاوار ہو جائیں گے؟ جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا۔ یعنی اُس کے اُخروی نتائج کی باداش ضروری ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک و کفر کی جزا دوام عذاب اور خلودِ نار (خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا) ہے یعنی جب تک دوزخ قائم ہے اس سے اُن کو نجات نہیں مل سکتی۔ مگر جب حسبِ مشیئت الٰہی وہ دن آئے کہ دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہو جائے تو اُس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○	فرمائے گا دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے۔ اس میں ہمیشہ رہو گے مگر یہ کہ جو چاہے اللہ! بے شک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔
(الانعام: ۱۲۸)	

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے غور کے قابل ہے۔ فرمایا "تیرا رب حکمت اور علم والا ہے" اس موقع پر خدا کے لئے خاص طور سے رَبّ کا لفظ لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی اور اُس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنّت میں داخل ہوسکیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک میں یہ تصریح الٰہی ہے:

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ (المائدۃ: ۷۲)	یہ کہ بے شک اللہ کا جو شریک بنائے گا، تو اللہ نے اس پر جنّت حرام کردی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

نیز ایک اور آیت میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ (الاعراف: ۴۰)	بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور اُن کے ماننے سے غرور کیا تو اُن کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنّت میں داخل نہیں ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہوجائے۔

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانونِ جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو دوزخ کے عذاب کا خاتمہ ہوجانے پر بھی جنّت کے احاطہ میں ان کا گذر نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت

کا دائرہ بہت وسیع ہے جیسا کہ خود اُس نے اہلِ دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ	وہ سدا دوزخ میں رہیں گے لیکن تیرا
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝	رب جو چاہے۔ بے شک تیرا رب
(ھود: ۱۰۷)	جو چاہے کر گذرتا ہے۔

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے کیونکہ اپنی رحمت کی وسعت کی نسبت اس کا اعلان یہ ہے

رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ	اور میری رحمت ہر شے کو اپنی
(الاعراف: ۱۵۶)	گنجائش میں لئے ہے۔

اس رحمتِ عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کی نسبت خدا فرماتا ہے:

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ	تو (اے پیغمبر) اگر وہ تجھ کو جھٹلائیں
ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا	تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع
يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ	رحمت والا ہے اور اس کا
الْمُجْرِمِيْنَ ۝	عذاب گنہگاروں سے لوٹایا نہیں
(الانعام: ۱۴۷)	جا سکتا۔

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اُس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے۔ لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دے کر جنّت نصیب کرے یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کر دے۔ اور اُس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا۔ فرمایا:

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ	جس سے اس دن عذاب ہٹایا

فَقَدْ رَحِمَهٗ ط — گیا تو خدا نے اُس پر رحم

(الانعام: ۱۶) — کیا۔

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنّت سے مایوس ہو جائے۔ اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنّت سے نا اُمید نہ ہو۔ مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے: ؎

بہ تہدید اگر برکشد تیغِ حکم — بمانند کرّ و بیاں صم و بکم

دگر در دہد یک صلائے کرم — عزازیل گوید نصیبے برم

خود اُس رحمان و رحیم کا جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے، یہ ارشاد ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے:

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ — جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس

مَنْ یَّشَآءُ ط وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ — کو چاہے عذاب دیتا ہے۔ اور آسمانوں کی

وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا وَ اِلَیْهِ — اور زمین کی اور اُن کے بیچ کی

الْمَصِیْرُ ○ — بادشاہی اللہ کے لئے ہے اور اس

(المائدۃ: ۱۸) — کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

لیکن اُس کی یہ مشیئت جیسا کہ اُس نے (الانعام: ۱۲۸) میں فرمایا ہے اُس کی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ مگر کرتا وہی ہے جو اُس کی مصلحت و حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔

اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح

خود خدائے تعالیٰ نے فرمائی اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے۔ اس لئے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیئت الٰہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ	دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے۔ اس میں
اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ	سدا رہو گے لیکن جو چاہے اللہ
حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝	بے شک تیرا پروردگار حکمت والا
(الانعام، ۱۲۸)	اور علم والا ہے۔

جمہور کا مسلک یہ جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کی معتقد ہے۔ جمہور کا مسلک اُس سے کچھ مختلف ہے۔ اُس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور اُن لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو گنہگار تھے مگر دل میں ایمان رکھتے تھے۔ ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے۔ دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اُس سے توبہ کئے اور ایمان لائے بغیر مر گئے۔ ایسے لوگوں کی بخشایش کبھی نہ ہو گی اور وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ ان کی گنہگاری اس درجہ ہو گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے۔ یہ وہ زمینِ شور ہوں گے جس میں اس رحمتِ عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

رحمتِ عمومی کے معتقدین گذشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں۔ وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور ان کی پیش کردہ روایات

کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں:

(۱) اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ

بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔

(الاحزاب: ۶۴-۶۵)

(۲) وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝

اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے۔ اس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔

(الجن: ۲۳)

(۳) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ

بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ اُن کو بخشے اور نہ یہ کہ اُن کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ۔ اُس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔

(النسآء ۱۶۸-۱۶۹)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اُن پر ہمیشہ عذاب ہوگا اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا

عذاب کفّار سے کبھی دور نہ ہوگا:

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَھُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْھُمْ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْھَا وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ○

(المائدۃ : ۳۶-۳۷)

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اگر بالفرض اُن کے پاس ساری دنیا کا خزانہ ہو اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تاکہ وہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے دن کے عذاب سے چھٹ جائیں تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور اُن کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

(۲) وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ○

(البقرۃ : ۱۶۷)

وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا:

(۳) فَالْیَوْمَ لَا یُخْرَجُوْنَ مِنْھَا وَلَا ھُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ○

(الجاثیۃ : ۳۵)

تو آج اُس (دوزخ) سے وہ نہیں نکالے جائیں گے اور نہ اُن کا عذر سُنا جائے گا۔

(۴) اِلَّآ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ ○

(الشوریٰ : ۴۵)

ہاں کافر اور مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔

ظلم کا اطلاق قرآن مجید میں شرک پر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ شرک کا عذاب قائم رہے گا،

(۵) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَ
هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ
لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِيْنَ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ
لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا
هُمْ يُنْظَرُوْنَ ○

(البقرۃ، ۱۶۲)

بے شک جنہوں نے کفر کیا اور اسی کفر
حالت میں مر گئے اُن پر اللہ کی فرشتوں
کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے
اس میں وہ سدا رہیں گے۔ اُن کے
عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی
اور نہ اُن کو مہلت دی جائے
گی۔

(۶) وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ
جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ
فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ
مِّنْ عَذَابِهَا ۭ

(الفاطر، ۳۶)

اور اُن کے لئے جنہوں نے کفر
کیا جہنّم کی آگ ہے۔ نہ تو اُن کا
فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں
اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے
گی۔

شرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی۔ فرمایا:

(۷) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ

(النسآء، ۴۸)

بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ
اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

(۸) اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا
وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ

بے شبہہ جنہوں نے کفر کیا اور خدا
کے راستہ سے روکا اور اسی کفر کی
حالت میں وہ مر گئے تو ان کو ہر

(محمد: ۳۴) ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔

ان کے لئے جنّت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے:

(۹) اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ

(المائدۃ: ۷۲)

یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اُس پر جنّت حرام کردی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

(۱۰) اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِىْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ

(الاعراف: ۴۰)

بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور اُن کے ماننے سے سرکشی کی اُن کے لئے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنّت میں وہ داخل ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں گھُس جائے۔

(۱۱) وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

(آل عمران: ۱۷۶)

اور (اے پیغمبر) تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، غم میں نہ ڈالیں۔ وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ خدا چاہتا ہے کہ اُن کے لئے آخرت میں کوئی حصّہ نہ بنائے۔ اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی، اُن کا گناہ بخشا نہ جائے گا اور وہ جنّت میں

کبھی داخل نہ ہو سکیں گے بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے جہاں نہ اُن کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی اور نہ اُن کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آ گئے ع

بیا کیں داوریہا را بہ پیشِ داور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے

اوپر عالمِ برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمامتر تمثیلی ہوگی۔ اس تمثیلی کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب و مشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ یعنی اپنے مال[1] کا میل کچیل مستحقین کو کھانے کے لئے نہ دے گا تو اُس کو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اُس کو جانِ تازہ اور حیاتِ نو بخشی جائے گی وہ دولت مند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کے لئے قصر و محل اور پینے کے لئے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزّت کی جگہ عنایت کی گئی تھی اگر اُس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا تو دوسری دنیا میں اُس کو یہ سامان ملے گا:

فِیْ سُمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ ۙ وَّظِلٍّ	وہ لُو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں
مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا	کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا، نہ باعزّت۔
کَرِیْمٍ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ	بے شک وہ پہلے ناز و نعمت میں
ذٰلِكَ مُتْرَفِیْنَ ۚۖ	تھے۔

(الواقعۃ: ۴۲ - ۴۵)

---

[1] حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے۔

رویائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوب صورت اور آدھا بدصورت تھا۔ یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور کچھ بُرے تھے۔ اس لئے بداعمالی بدصورتی اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی۔ صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ "جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا تو خدا اُس کو جنّت کے پھل کھلائے گا۔ اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنّت میں شرابِ طہور پلائے گا۔ اور جو کوئی کپڑوں کا حاجتمند ہو کر ننگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنّت کے سبز جوڑے پہنائے گا۔"[1]

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائے گا۔ اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مُصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا۔ اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا۔"[2]

(۳) جو انسانوں پر رحم کرے گا خدا اُس پر رحم فرمائے گا۔[3]

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امور معنوی اور غیر مجسّم ہیں وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے۔ مثلاً

(۱) قرآن میں ہے کہ "جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی

---

[1] ترمذی: کتاب الزہد والرقاق۔ [2] [3] ترمذی۔

اندھا ہوگا۔ دیکھو کہ دنیا کی معنوی قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

(۲) حدیث میں ہے کہ "اہلِ تکبّر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے جن پر ہر طرف سے ذلّت و خواری چھائی پھرے گی"[1] دیکھو کہ تکبّر کی جزا ذلّت و خواری سے ملے گی اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں۔ اس لئے اُن کی بڑائی اور تکبّر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ چیونٹی بن کر اُٹھیں۔

(۳) اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ "جو بخل کرے گا قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے گا"[2] صفتِ بخل اُس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اُس کی تکلیف کا باعث ہوگی۔ آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "جو شخص بلا وجہ بھیک مانگ کر اپنی آبرو ریزی کرتا ہے قیامت میں وہ اُٹھے گا تو اُس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا"[3] دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہو کر) جھک گیا ہوگا[4] ایک پہلو کا عدم ادائی حق اپنی تمثیلی صورت میں ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا۔ یہ چند حوالے ذکر کئے گئے ہیں۔ ان ہی پر جزا و سزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہیئے۔ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیئے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ	جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس
لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ	کو تنگ گذران ملتی ہے۔ اور قیامت کے

---

[1] ترمذی کتاب الزہد والرقاق۔ [2] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں قتل له ماله شجاع اقرع [3] ترمذی۔ [4] ترمذی۔

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ قَالَ
رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ
كُنْتُ بَصِيْرًا ○ قَالَ كَذٰلِكَ
اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ
الْيَوْمَ تُنْسٰى ○

(طٰہٰ، ۱۲۴-۱۲۶)

دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ
کہے گا اے میرے پروردگار! تو نے
مجھے اندھا کیوں اٹھایا۔ میں تو دیکھتا تھا۔
فرمائے گا اسی طرح میری آیتیں تیرے
پاس آئیں تو تو نے اُن کو بھلا دیا۔ ایسے
ہی آج تو بھلایا جائے گا۔

دیکھو کہ دل کی نابینائی قیامت میں ظاہری نابینائی اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا وہاں رحمتِ الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا۔

دوزخ کی جسمانی سزائیں دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی۔ قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) آتشِ دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے بلکہ اَلنَّارُ یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے۔ ان ہی معنوں میں السَّعِیْرُ یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے اور عَذَابُ الْحَرِیْق (جلن کا عذاب) بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے۔ ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ
فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ○

(المؤمنون: ۱۰۴)

ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ
جھلس دے گی اور اُن کی صورتیں اس
میں بگڑ جائیں گی۔

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے جس کے متعلق یہ ہے کہ

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ○ لَا
تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ○ لَوَّاحَةٌ

اور تمہیں کیا معلوم سقر کیا ہے۔
نہ وہ رحم کھائے گی، نہ چھوڑے

لِّلْبَشَرِ ○ گی۔ چہروں کو جُھلس دینے والی۔

(المدثر : ۲۷ - ۲۹)

كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ○ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ○ ہرگز نہیں! وہ شعلہ والی آگ ہے منہ کی کھال اُدھیڑنے والی۔

(المعارج : ۱۵-۱۶)

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ○ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ○ دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔

(المرسلٰت : ۳۲ - ۳۳)

(۲) وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ یہ حکم ہوگا:

انْطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ○ لَّا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ○ چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی۔ نہ گھن کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آسکے۔

(المرسلٰت : ۳۰ - ۳۱)

(۳) وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی:

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ○ (النبأ : ۲۴) اس میں نہ وہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔

(۴) دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے اور نہ ایسی زندگی ہی گی جس میں کوئی مسرت ہو۔ دو جگہ فرمایا:

لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ○ وہاں وہ نہ مرے گا نہ جئے گا۔

(طٰہٰ : ۷۴، ، الاعلیٰ : ۱۳)

(۵) پینے کو گرم پانی ملے گا جس سے آنتیں نکل پڑیں گی:

وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ○ (محمد: ۱۵)

اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر دے گا۔

(۶) اور پیپ پئیں گے:

اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ○ لا (النبآء: ۲۵)

لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔

(۷) ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا:

يُصْبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ○ (الحج: ۱۹)

ان کے سروں کے اوپر سے گرم پانی ڈالا جائے گا۔

(۸) کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا:

اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ○ ..... اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ○ لا طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ○ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ○ ج (الصّٰفّٰت ۶۲، ۶۴ — ۶۷)

یا سینڈھے کا پھل ..... وہ ایک درخت ہے، دوزخ کی جڑ میں۔ اس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر۔ تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے۔ پھر اس پر گرم پانی کی ملونی (ملاوٹ) ہو گی۔

اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝

سینڈھے کا درخت گنہگار کی غذا ہے جیسے پگھلاتا بنا۔ وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے پانی۔

(الدخان: ۴۳-۴۶)

(۹) خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا:

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝

اور اُن کے لئے کوئی کھانا نہ ہوگا لیکن خاردار جھاڑی جو نہ موٹا کرے گی اور نہ بھوک سے بے پروا کرے گی۔

(الغاشیۃ: ۶-۷)

(۱۰) زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی:

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝

اور نہ کوئی کھانا مگر زخموں کا دھوون۔

(الحاقۃ: ۳۶)

(۱۱) کھانا نگلا نہ جائے:۔

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ

اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔

(المزمل: ۱۳)

(۱۲) آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا:

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ

کافروں کے لئے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔

(الحج: ۱۹)

(۱۳) لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے :

وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ○ (الحج : ۲۱)

اور ان کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے ۔

(۱۴) گلے میں طوق اور زنجیریں ہوں گی :

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ ط يُسْحَبُوْنَ ○ (المومن : ۷۱)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ کھینچے جائیں گے ۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا وَّ اَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ○ (الدھر : ۴)

ہم (خدا) نے کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار رکھی ہے ۔

مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ○ (ابراھیم : ۴۹)

دو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ۔

دوزخ میں روحانی سزائیں ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی جو اہل نظر کی نگاہوں میں اُن سے بھی بڑھ کر ہیں، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال گزر چکا، وہ دل کو جا کر جھانکے گی۔ فرمایا :

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ○ (الھمزۃ : ۶ — ۷)

سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی ۔

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا

اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو

الْعَذَابَ ج — اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔

(یونس: ۵۴)

یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ — اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔

(الزمر: ۵۶)

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ — وہ جب جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے۔

(الحج: ۲۲)

ذلّت کا عذاب:

فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ — تو آج ذلّت کے عذاب کا بدلہ دیئے جاؤ گے۔

(الاحقاف: ۲۰)

اس افسوس و حسرت و ندامت سے بڑھ کر یہ کہ اُن کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی:

لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ ط — آج معذرت نہ پیش کرو۔

(التحریم: ۷)

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا۔ جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائے گا:

اِخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ○ — ذلیل ہو اس دوزخ میں اور مجھ

(المومنون : ۱۰۸) سے بات نہ کرو۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ○ (المطففین: ۱۵)

ہرگز نہیں وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے

ان میں سے جنہوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا۔ اُس دن وہ بھی ان کو اپنی رحمت و شفقت کی یاد سے بھلا دے گا۔ فرمایا:

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ○ (طٰہٰ: ۱۲۶)

اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا۔ ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائے گا۔

ایسے دوزخی بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ نہ ان سے کچھ بات کرے گا اور نہ ان کی اصلاحِ حال کی کوئی فکر کرے گا۔ یہ حقیقت میں شفیق و مہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے۔ اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق و محبت کے زخم خوردہ ہیں۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی

لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ
لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○
(اٰل عمرٰن : ۷۷)

دولت خرید اکرتے ہیں آخرت
میں ان کا کوئی حصہ نہیں، نہ قیامت
میں خدا ان سے بات کرے گا، نہ
ان کی طرف دیکھے گا، نہ ان کو سنوارے
گا۔ اور ان کے لئے دردناک
عذاب ہے۔

جنّت

جنت کے نام | اس مقام کا نام جو نیکو کار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا۔ قرآن پاک میں عموماً اَلْجَنَّۃُ (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے مثلاً جَنَّۃُ النَّعِیْم (نعمت کا باغ) جَنَّۃُ الْخُلْدِ (بقائے دوام کا باغ) جَنّٰتُ عَدْنٍ (دائمی سکونت کے باغ) جَنَّۃُ الْمَاوٰی (پناہ کا باغ) اُن کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اُس کی تعبیر کی گئی ہے مثلاً فِرْدَوْسٌ (باغ) رَوْضَۃٌ (چمن) دَارُالْخُلْد (ہمیشگی کا گھر) دَارُالْمُقَامَۃِ (قیام کا گھر) دَارُالسَّلام (امن وسلامتی کا گھر)

جنّت کا دوام | اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذّتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے، یہاں کی ہر لذّت عارضی اور مسرت فانی ہے۔ یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں جس کے بعد غم وماتم کا نالہ نہ ہو۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرّت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے۔ مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غرض اس موجودہ عالمِ فانی کی ہر شے آنی جانی ہے اور

یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنّت اس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذّتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں۔ جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذّت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں۔ جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں۔ شیطان نے حضرت آدم علیہ السّلام کے سامنے جنّت کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ وہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے کہا اے آدمؑ!

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○

کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں۔

(طٰہٰ : ۱۲۰)

مگر جنّت کا یہ وصف سُنا کر اُن کو جدھر کا راستہ بتایا، وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا۔ جس میں آدم علیہ السّلام گرفتار ہوئے۔ چنانچہ جنّتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی۔ جو اُن کے حق میں زہر تھی۔ یعنی گناہ کا پھل۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جنّۃ الخلد اور غیر فانی ملک سے نکل کر اُن کو اس فنا کے ملک میں آنا پڑا اور پھر اس جنّت الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق اُن کے اور اُن کی نسل کے اعمالِ صالحہ کا صلہ قرار پایا۔ چنانچہ فرمایا۔

اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ○

یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا جو اُن کا صلہ ہوگا اور واپسی کی جگہ۔

(الفرقان : ۱۵)

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے، جہاں کا آرام دائم، جہان کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذّت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاودانی ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے فرمایا۔

۱۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے
سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ	ہم ان کو باغوں میں داخل کریں گے
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ	جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں
اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ	گی۔ وہ ہمیشہ کے لئے رہ پڑیں گے
اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ۝	اللہ کا وعدہ سچّا ہے اور اللہ سے زیادہ
(النسآء : ۱۲۲)	کس کی بات سچّی ہوگی۔

اس تاکید پر تاکید اور پُر زور طریقۂ تعبیر پر نظر ڈالیئے کہ صرف خُلُوْد پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اَبَدًا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا۔ اس پر بھی بس نہ کی۔ بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ "یہ اللہ کا سچّا وعدہ ہے"۔ پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا، کہ اور اللہ سے زیادہ سچّی بات کس کی ہو سکتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیّت کتنی ہے

۲۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ	ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	گے۔ جن کے نیچے سے نہریں
خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ	بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ

(النسآء : ۵۷)

رہا کریں گے۔

۳۔ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ

(المائدۃ : ۱۱۹)

ان کے لئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ اُن میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۴۔ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۙ○ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ

(التوبہ : ۲۱-۲۲)

اور (اللہ اُن کو خوشخبری دیتا ہے) کہ ان کے لئے وہ باغ ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے۔ اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۵۔ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ

(التوبۃ : ۱۰۰)

اور اُن کے لئے وہ باغ مہیا کیئے ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں ہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۶۔ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ

(التغابن : ۹)

س کو اُن باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اُن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۷۔ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ○

(الطلاق : ۱۱)

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرے۔ اس کو وہ اُن باغوں میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اُن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اللہ نے اُس کو روزی خوب دی۔

۸۔ جَزَآءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ (البینۃ: ۸)

ان کی مزدوری اُن کے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہلِ جنّت کو جنّت میں خلودِ ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے۔ ان کے علاوہ آیتیں ہیں جن میں جنّت کی راحتوں اور لذّتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے۔ فرمایا:۔

۹۔ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ مَّاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۙ (الکہف: ۲-۳)

اور ان مومنوں کو بشارت دے گا۔ جنہوں نے اچھّے کام کیئے کہ اُن کے لئے اچھی مزدوری ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے

سورۂ ص میں جنّت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے:

۱۰۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِیَوْمِ الْحِسَابِ ○ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ○ (صٓ: ۵۳-۵۴)

یہ وہ ہے جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ بے شُبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔

۱۱۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ

اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنّت میں رہا کریں گے۔ جب تک

وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ط عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ○

(هود : ۱۰۸)

آسمان اور زمین ہیں۔ لیکن جو تیرا رب چاہے۔ وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔

یعنی خدا کی مشیّت کے سوا ان کو اس جنّت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا۔ لیکن اس کی مشیّت یہی ہوگی کہ ان کے لئے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے پھر جس کے متعلق اس کی مشیّت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہو سکے گی :

۱۲۔ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ○

(التوبة : ۷۲)

اور وہ باغ جن میں (ان کے لئے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔

۱۳۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ط

(الرعد : ۳۵)

جنّت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔

۱۴۔ وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ○ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ○

(الواقعة : ۳۲-۳۳)

اور بہت سے میوے جن کا نہ انقطاع ہوگا۔ اور نہ جن کی روک ہوگی۔

۱۵۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ○

(التّين : ۶)

لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیئے اُن کے لئے وہ مزدوری ہے۔ جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

فنائے راحت اور انقطاعِ مسرّت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذّت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ

ہو جائے۔ پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کر دی گئی کہ راحت و مسرّت کے اسباب کا دوام خاتمہ نہ ہوگا۔ اب رہ گئی دوسری صورت تو گو خَالِدِیْنَ اَبَدًا کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گذر نہ ہوگا۔ فرمایا۔

۱۶ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی ۚ	جنت میں جانے والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔
(الدخان : ۵۶)	

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ مسرّت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہلِ جنّت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہلِ جنّت کو اُن کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے۔ فرمایا۔

لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ۝	وہاں اُن کو کوئی غم نہ چھوئے گا اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔
(الحجر : ۴۸)	

یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہلِ جنّت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ اُن کی جبلّت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانۂ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے۔ فرمایا۔

خَالِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝	سدا رہیں گے اس میں۔ اس سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔
(الکہف : ۱۰۸)	

دوام و بقا اور تسلسل و عدمِ انقطاع کی اس تو بر تو تاکید اور اسرار سے اندازہ ہوگا کہ

اسبابِ مسرّت کی بقاء راحت کا دوام اور زندگی کا تسلسل جنّت کی اصلی خصوصیّت ہوگی یہی وہ حقیقت ہے جس کا لالچ شیطان نے

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○ اور غیر فانی سلطنت۔

(طٰہٰ: ۱۲۰)

کہہ کر آدم علیہ السّلام کو دلایا تھا اور اس بہانہ سے اُس عالمِ بقا سے اُن کو اس عالمِ فنا میں بھی بھجوا دیا۔ آخر وہ زمانہ آئے گا۔ جب آدمؑ کی اولاد کو اُن کے نیک اعمال کے بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لئے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی | دنیا میں شخصی راحت و آلام کا بلند سے بلند تخیّل، ایک لفظ "بادشاہی" کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے بر آنے کی خوشخبری دینے کے لئے کوئی لفظ ہو سکتا ہے تو یہی ہے۔ گویا بادشاہی اس کیفیّت کا نام ہے۔ جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامانِ راحت اور اسباب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرّت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زرّیں کمر غلام و خدّام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمرّدیں اور بلّوریں پیالے، حسین و مہ جبیں بیگمات غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔

جنّت کی مختصر ترین لیکن سچّی تعریف آدم علیہ السّلام کے دشمن نے آدم علیہ السلام کے سامنے کی تھی۔

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○ اور غیر فانی بادشاہی۔

(طٰہٰ: ۱۲۰)

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لئے مختلف پیغمبروں نے مختلف لفظ استعمال کیئے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے اس کے لئے "آسمانی بادشاہی" کی اصطلاح قائم فرمائی اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے۔ مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لُغت کے الفاظ سے جو مادیّت کی گود دل میں پلے اور مادّیت کے ماحول میں پھُولے پھلے ہیں، کسی روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو ان ہی لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں۔ آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادّہ سے بلند کریں، مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو "آسمانی بادشاہی" کے مادّی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا۔ اس دِن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اُسے نیا نہ پیوں۔" (متی ۲۶-۲۹)

آپ نے دیکھا کہ "باپ" کی "آسمانی بادشاہی" میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا۔ اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ ان کو اسی سونے چاندی کے محل، آبِ حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی۔[1] اور پھر

"وہاں رات نہ ہوگی اور وے چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں۔ کیونکہ خداوند ان کو روشن کرتا ہے اور وے ابدالا باد بادشاہی کریں گے۔"

(مکاشفات یوحنا، باب ۲۲، ۵)

---

[1] مکاشفاتِ یوحنا، باب ۲، ۲۲۔

لیکن یہ "بادشاہی" عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے۔ نبوّت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے:۔

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ وَ جَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا ۝ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝ وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۝ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا

تو اللہ نے اہل جنّت کو اس دن کی تکلیف سے بچا لیا اور اُن کو تر و تازگی اور شادکامی سے ملایا اور اُن کے صبر کے بدلے میں ان کو (رہنے کے لئے) باغ اور (پہننے کے لئے) ریشمی کپڑے دیئے۔ وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے۔ ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈ۔ اور اُن کے سائے اُن پر جھکے ہوں گے۔ ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہوں گے۔ چاندی کے برتن اور نقرئی شیشوں کے آب خور سے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں، اُن کو لوگ اُن کے پاس لئے پھریں گے۔ اور اُن کو وہاں وہ پیالہ پلایا جائے گا۔ جس میں سونٹھ ملی ہوگی۔ اس میں ایک چشمہ کا نام سلسبیل ہے۔ اور سدا رہنے والے کمسن غلام اُن کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے۔ اور

وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ
سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ز
وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ج وَ
سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝
اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ
سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝

(الدھر: ۱۱-۲۲)

تو انہیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت وعیش اور بڑی بادشاہی دیکھے۔ ان کی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہوگی اور اُن کو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا۔ یہ تمہاری مزدوری ہوگی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی:

یہ پورا نقشہ اُس عیش و مسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں تخیّل میں آتا ہے۔ اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہؓ صحابی سے مروی[1] ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ موسیٰؑ نے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنّت والوں میں سے سب سے کم رُتبہ کون ہوگا؟ فرمایا وہ شخص جو جنّت والوں کے جنّت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ جنّت میں داخل ہو جاؤ۔ وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے اور ربّانی نوازشوں پر قابض ہو چکے اُس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا؟ عرض کرے گا۔ خداوندا میں راضی ہوں۔ فرمائے گا تیرے لئے اتنا اور اس سے دُونا اور اس سے تگنا اور چوگنا ہے۔ کہے گا خداوندا میں راضی ہو گیا۔ خدا فرمائے گا

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ سجدہ (حدیث حسن صحیح)

تیرے لئے وہ اور اس کا دوگنا ہے، عرض کرے گا۔ میں راضی ہوگیا۔ فرمائے گا اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔

باغ کا استعارہ آخرت کے خانہ عیش وراحت کے لئے قرآن پاک نے عموماً جنّت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شورو بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز وشاداب باغوں ہی کی ہوسکتی ہے۔ اس لئے ان کے لئے یہ لفظ اُس مقام آخرت کے لئے قرآن نے استعمال کیا ہے۔ مگر یہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دُنیا کا گوشہ گوشہ ہے۔ اس لئے عرب کی تخصیص بے معنی ہے۔ کیا دُنیا کے سرسبز وشاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیّل میں باغ وراغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان وگلستان کی تخصیص نہیں۔ یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے۔ انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو۔ مگر وہ سرسبز وشاداب قطعات، باغ وبہار اور کنارِ آب ونہر کو عیش ومسرّت کا مقام سمجھتا ہے اور اُن کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجّہ کے قابل ہے۔ انسان کا گھر وہ پیش خانہ ہوتا ہے۔ جس میں حزن وغم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے۔ اہل وعیال اور دولت و مال کے متعلّق ہر قسم کی فکریں اُس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں۔ مگر جب انسان سیر وتفریح کے لئے باغ وچمن کا رُخ کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے وہ ہر غم کو بھول جاتا اور ہر تعلّق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں وفرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اُس کے ہر گوشۂ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں۔ وحی محمّدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اس لفظ کو اسی لئے استعمال کیا ہے۔ تاکہ اس سے اخروی عیش ومسرّت، شادی وخوشی اور فراغِ خاطر کی پوری تصویر کھنچ جائے۔

سامانِ جنّت کے دنیاوی نام | یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالمِ آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے، اُن سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ اُن اخروی اشیاء کو اُن دنیاوی الفاظ سے اس لئے ادا کیا گیا ہے کہ وہ اُن سے خاص مناسبت رکھتی ہیں۔ ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے اُن کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی۔ چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ

(البقرۃ: ۲۵-۲۶)

اور اُن کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے یہ خوشخبری سُنا کہ ان کے لئے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ جب جب ان باغوں سے کوئی پھل دیئے جائیں گے کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا اور ان باغوں میں ان کی صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور ان باغوں میں رہا کریں گے۔ بے شُبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رُتبہ چیز کی مثال بیان کرے۔

ان آیتوں کے سباق وسیاق اور نظم وترتیب پر لحاظ کرکے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کی رُو سے ان الفاظ کے دنیاوی لغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے، جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جنّت کی لذّتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے:۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○	تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لئے ان کے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔
(السجدۃ: ۱۷)	

اس "آنکھوں کی ٹھنڈک" یعنی لذّت وراحت کی کیفیت دنیاوی تخیّل سے چونکہ بہت بلند ہے اس لئے فرمایا گیا کہ جنّت کی راحت ولذّت کی حقیقت علم وفہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے۔ آنحضرتؐ نے اس مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا ہے:۔

قال اللّٰہ اعددت لعبادی الصّٰلحین مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولاخطر علی قلب بشر[1]	خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ مہیّا کیا ہے، جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔

اگر جنّت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں اور طلائی

---

[1] صحیح بخاری، باب کلام الرب وتفسیر سورہ سجدہ، صحیح مسلم کتاب الجنۃ، ترمذی تفسیر سورہ سجدہ۔

زیوروں کی وہی اُخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دُنیا میں سمجھتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک "مخفی حقیقت" نہ فرماتا اور نہ آنحضرتؐ اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کو آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا اور نہ وہ کسی انسان کے خیال میں گذریں۔ مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے،

بل ما اطلعتم علیہ	جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو۔

(صحیح بخاری، تفسیر سورۂ سجدہ)

صحیح مُسلم کی روایت[1] میں یہ الفاظ ہیں بلہ ما اطلعکم اللہ علیہ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ "خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگذر کرو۔"

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو۔ اصحاب تفسیر نے حضرت ابنِ عباسؓ سے بسند نقل کیا ہے:

وقال السفیان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لایشبہ شیء مما فی الجنۃ مما فی الدنیا الا فی الاسماء	سفیان ثوری اعمش سے اور وہ ظبیان سے اور وہ حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنّت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا۔

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:۔

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ	جنت میں جو کچھ ہے، وہ ناموں کے
الا الاسماء[1]	سوا دنیا میں نہیں۔

غرض ان الفاظ سے ان ہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں، بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذائذ اور مسرّتیں مراد ہیں، جن کی تعبیر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسب کے سبب سے اُن کو اِن دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے۔ اس میں اشکال، نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کی عدمِ قدرتِ کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور درول ناخلیدہ مفاہیم کے لئے ان کی زبان و لغت میں کوئی لفظ ہی نہیں۔

جنّت کی مسرّتیں اعمال کی تمثیل ہیں

یہ اصول بارہا بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنّت کی مسرّتیں دونوں اعمالِ انسانی کی تمثیلیں ہیں۔ اسی لئے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے:۔

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○	وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے۔

(الطور: ۱۶)

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائے گا اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل رہے ہیں۔ تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔"

مثلاً وہ نکوکار جو دنیا میں اللہ تعالےٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری آیت مذکورہ و بیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی و تفسیر آیت مذکورہ۔

تھے۔ ان کو جنت میں امن وسلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝	کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر
فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ	والوں میں ڈرتے تھے تو خدا نے ہم
السَّمُوْمِ ۝	پر مہربانی فرمائی اور ہم کو دوزخ کی لُو کے
(الطور: ۲۶-۲۷)	عذاب سے بچا لیا۔

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دُنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے، وہ قیامت میں گرم لُو (سموم) کے عذاب سے بچائے جائیں گے۔ قہر وغضب کی تمثیل شعلہ، آتش، لُو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے، دیکھو کہ قیامت میں ان کو سموم یا گرم ہوا کی لُو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دولت مند وقوی دست منکرین کمزور اور غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے۔ قیامت میں اس کا اُلٹا ہوگا کہ یہ اُن پر ہنسیں گے۔ فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ	بے شک گناہ گار ایمان والوں
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝	پر ہنستے تھے تو آج ایمان
فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ	والے کافروں پر ہنسیں
الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝	گے۔

(المطففین: ۲۹، ۳۴)

نکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے۔ اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کے

ساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے اور یہاں وہ غمگین ہوں گے اور جو وہاں غمگین تھے۔ وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے:۔

فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝	تو وہ موت کو پکارے گا اور وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال میں (مغرورانہ) خوش تھا۔

(الانشقاق: ۱۱-۱۳)

اور جو نکوکار وہاں اہل وعیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے نا آشنا تھا۔ اس کا یہ حال ہوگا کہ

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝	تو اس سے آسان حساب لیا جائیگا۔ اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔

(الانشقاق: ۸-۹)

قرآن پاک میں بار بار یہ آیتیں یا بعینہٖ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں:۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ	اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے اُن کو باغوں کی خوشخبری سُنا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

(البقرۃ: ۲۵)

ان آیتوں میں ایمان اور عملِ صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے اس سے اِدھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں جن کی ترقّی اور نشو و نما پانی سے ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ایمان اصل ہے۔ جس کی جڑوں کی سیرابی اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے۔ اگر ایمان ہو اور اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا، جس کی ترقّی اور نشو و نما کی امید نہیں۔ اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے۔ جس کا وجود و عدم یکساں ہے۔ اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآنِ پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۝ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاۗءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

(ابراھیم: ۲۳-۲۵)

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے وہ اُن باغوں میں داخل کیئے گئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اور وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارک باد ہے۔ تو کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی۔ نیک بات ایک سُتھرے درخت کی طرح ہے۔ جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو۔ اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے۔ اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔

اس آیت میں جنّت اور کلمۂ طیّبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے۔ یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ "اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے"۔ تو دوسرے میں ہے کہ "وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا"۔ کلمہ طیّبہ سے یہاں مراد ایمان ہے۔[1] جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ صحابی کی وفات کے بعد اُن کی ایک ہمسایہ صحابیہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان بن مظعونؓ کی ہے، تو انہوں نے آکر یہ خواب آنحضرتؐ سے بیان کیا۔ آپؐ نے اس کی تعبیر میں فرمایا ذَالِكَ عَمَلُهٗ يَجْرِي لَهٗ۔[2] (یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لئے بہہ رہی ہے۔

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہرِ رواں سے ہے۔ اس بنا پر اہلِ جنّت کے لئے بار بار جس باغ اور نہرِ جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں اُن کے ایمان اور عملِ صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی۔ ان کا ایمان خوش نما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمالِ صالحہ صاف اور شفّاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف و لذّت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنّت کی دوسری لذّتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ علومِ نبویؐ کے ایک بڑے واقف کار اور اسرارِ شریعت کے ایک بڑے دانائے راز

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، [2] صحیح بخاری، کتاب التعبیر۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :-

واکثر الوقائع الحشریۃ من هٰذا القبیل	حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں
وبالجملۃ فتشبیحات وتمثلات لمعانیھا.....	حاصل یہ کہ یہ تمام امورِ معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے۔
وتتشبہ النعمۃ بمطعم ھنیئ ومشرب مریئ ومنکح شھی وملبس رضی ومسکن بھی	اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی خوش مزہ کھانے، خوشگوار پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذتِ نکاح، دلپسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔

ہم نے آیات واحادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا کہ اس تمثیل وتشبیہ کے کیا معنی ہیں اور کیونکر غیر مجسّم معانی اپنے مناسب قالبوں میں مجسّم ہوکر وجود پذیر ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام اعمالِ صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کی اولاً دو قسمیں نکلیں گی۔ پہلی خدا پر ایمان اور خلوصِ دل سے اس کی اطاعت جس کو "حقوق اللہ" کہتے ہیں اور دوسری بندگانِ الٰہی کے ساتھ حُسنِ سلوک۔ بندگانِ الٰہی کے ساتھ جو نیک سلوک کیا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کی عزّت وآبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفّت وعصمت کہتے ہیں۔ اور ان کی ضروریاتِ زندگی کے مہیّا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریاتِ زندگی یہی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں۔ ان ہی کی نسبت ہم ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرسکتے ہیں۔ اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں۔ جنّت کی نعمتیں

ان ہی پانچ قسموں میں منحصر ہیں۔ ایمان و اخلاص و طاعت کی جزا تو خود اللہ و تبارک تعالیٰ ہے۔ وہ اپنے قرب اور اپنے دیدار سے نوازے گا۔ عفت و عصمت کی جزا حسین و مہ جبیں بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی۔ دوسروں کو کھلانے کی جزا جنّت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوانِ طعام ہیں۔ دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ و خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے۔ پہنانے کی جزا ریشم و حریر و دیبا و اطلس اور بہتر سے بہتر خوش نما لباس ہے اور رہنے اور لبسانے میں حُسنِ سلوک کی جزاء خوش منظر مکان و قیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے:۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا	بے شک تیرے لئے اس بہشت میں
تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا	نہ بھوکا ہونا، نہ ننگا ہونا اور نہ پیاسا
وَلَا تَضْحٰى ۝	ہونا نہ دھوپ میں رہنا۔

(طٰہٰ : ۱۱۸ - ۱۱۹)

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہو گئی ہیں۔ جب آدمؑ کی اولاد کو اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت نجات ملے گی تو پھر ان کے لئے وہی بہشت ہے۔ جس میں نہ بھوکا ہونا ہے نہ پیاسا ہونا، نہ ننگا ہونا، نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا۔ اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے۔ یا تو یہ کہ بہشت میں اہلِ جنت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا، نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لُو کی محنت میں گرفتار۔ دوسرے یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کو کھانے کے لئے ایسے الوانِ نعمت ملیں گے، جن کو کھا کر انسان پھر

بھوکا نہ ہوگا۔ اور پینے کے لئے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پھر پیاسا نہ ہوگا۔ اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لئے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے، جہاں دھوپ کا گذر نہ ہوگا۔

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لئے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے۔ انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لئے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے۔ اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے۔ اعمال صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے۔ صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیرباد کہنا اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لئے مسجد جانا پڑتا ہے۔ خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے۔ اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے اُن میں پہلی چیز تو خود اُس کی زندگی ہے۔ پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں جن کا نام کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہے۔ اس لئے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب و مماثل جو چیزیں ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوان طعام، اقسام شراب و شربت، انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۙ وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ	پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور
الدُّنْیَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ہِیَ	دنیاوی زندگی (کے ناجائز لطف و

الْمَاْوٰی ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ	آرام) کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا
مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ	ٹھکانا ہے۔ لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے
عَنِ الْهَوٰی ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ	ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز
هِیَ الْمَاْوٰی ۝	خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانا
(النازعٰت : ۳۷ - ۴۱)	بہشت ہے۔

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی :-

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ	اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن
الْقِیٰمَةِ ؕ	پوری ادا کی جائے گی۔

(اٰل عمرٰن : ۱۸۵)

لطف و مسرّت کا تصوّر | مسرّت ایک نفسی کیفیّت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے۔ اس بنا پر مسرّت کے وجود کے لئے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے۔ اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو تو بالآخر ان کی انتہا ان ہی باتوں پر ہوگی، جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔ اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آسکتی ہیں۔ وہ یہی ہیں، باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور زر و جواہر۔ مسرّت اور راحت کا جب کبھی تخیّل آئے گا اور جب کبھی ہم اُن کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا اور ہماری انسانی فطرت ان ہی مسرّتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈھنے کی عادی ہے۔

اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گناہ گاری کی مرتکب ہوتی ہے۔ اس لئے اُن سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی عادی و مانوس اسبابِ مسرّت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی، اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف و مسرّت کا اعلیٰ ترین تخیّل اس دنیائے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ہم کو تخیّل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے۔ لیکن عملاً اپنی اپنی خواہشوں اور تمنّاؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا ہے، تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخیّل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں۔ جنّت آخرت کی اُس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیّل اور ہماری تمنّاؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی :-

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ	رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا	بہتی ہوں۔ ان کے لئے ان باغوں
مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي	میں وہ ہے جو وہ چاہیں۔ اللہ اسی
اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ	طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔

(النحل : ۳۱)

وَلَكُمْ فِيْهَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ	اور تمہارے لئے جنّت میں وہ ہے
وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝	جو تمہارے دل چاہیں اور تمہارے
(حٰمٓ السجدۃ : ۳۱)	لئے اس میں وہ ہے جو تم مانگو۔
لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا	اِن کے لئے جنّت میں وہ ہے جو

مَزِيْدٌ ○ (قٓ : ۳۵)

وہ چاہیں اور ہمارے پاس اُس سے بھی بڑھ کر ہے۔

وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ (الزخرف : ۷۱)

اور جنّت میں وہ ہے جس کی دِل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذّت دے۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ط كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا ○ (الفرقان : ۱۶)

اُن کے لئے جنّت میں وہ ہے جو وہ چاہا کریں گے یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمّہ۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط (الزمر : ۳۴)

اُن کے پروردگار کے پاس ان کے لئے وہ ہے جو وہ چاہیں گے۔

الغرض جنّت وہ مقام ہے، جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا۔ جہاں تک ہمارا مرغِ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے۔ لطف و مسرّت کا وہ بلند سے بلند معیار جو تصوّر میں آسکتا ہے، وہاں ہمارے لئے مہیّا ہوگا۔ صحابہؓ میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ جنّت کے سامانِ مسرّت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپؐ سے پوچھتے رہتے تھے اور آپؐ جواب دیتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جنّت میں جو سب سے کم رُتبہ ہوگا اُس کی کیفیّت بھی یہ ہوگی۔ کہ خدائے تعالیٰ اُس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر۔ وہ کرے گا تو خدا فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا، جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر اور[1]۔ یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا۔ لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت

---

[1] صحیح مسلم۔

نہ ہوگی کہ وہاں کمی کس چیز کی ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی۔ (الا الصور من الرجال[1])

کسی کو جنّت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلّہ اور پھر تیاری یہ سب کام منٹوں میں انجام[2] پا جائے گا۔ ایک بدوی نے پوچھا "یارسول اللہؐ! وہاں گھوڑے بھی ہوں گے"؟ فرمایا کہ اگر تم کو جنّت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لئے پھرے تو وہ بھی ہوگا۔ دوسرے نے پوچھا کہ یارسول اللہؐ اونٹ بھی ہوگا؟ فرمایا اگر تم جنّت میں گئے تو تمہارے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا۔ اور تمہاری آنکھیں[3] پسند کریں گی۔

جنّت میں اہلِ جنّت کے مختلف رُتبے ہوں گے۔ اس لئے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنی کو اپنی کمی کا خیال ہوگا، تو اس کے تصوّر میں یہ پیدا کر دیا جائے گا (حتّٰی یتخیّل الیہ) کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لئے ہوگا کہ جنّت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں[4]۔

جنّت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں

کسی صاحبِ دل نے جنّت کی یہ تعریف خوب کی ہے[5]

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشند

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرّت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو۔ یا تو موجودہ مسرّت کے آئندہ ختم ہو جانے کا خوف ہے اور یا گذشتہ ناکامی کا افسوس ہے۔ اس بنا پر یہاں کی کوئی خوشی بھی کامل نہیں۔

---

[1] ترمذی۔ دیکھو مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ [2] صحیح بخاری [3] ترمذی [4] ترمذی، یہ کُل حدیثیں مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ سے لی گئی ہیں۔

مگر جنّت وہ مقام ہوگا، جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا۔ چنانچہ اہلِ جنّت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اس میں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اُس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے، جب تک اس کے سر کا پسینہ پاؤں تک نہ آئے۔ دنیا کی تمام فانی مسرّتیں ہماری فانی کوششوں کا فانی نتیجہ ہیں۔ مگر جنّت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گذشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان کسی قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا، جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لئے دوزخ بنی ہے۔ چنانچہ اہلِ جنّت جنّت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک و احتشام اور لباس و زیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد و تعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے:۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ — رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں
فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ — گے۔ اُن میں وہ سونے کے کنگن
وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ○ وَقَالُوا — اور موتی پہنائے جائیں گے اور اُن
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا — کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی۔ اور
الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ — وہ کہیں گے پاک ہے وہ جس نے ہم
شَكُوْرُ ۙ ○ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا — سے غم دور کر دیا بے شک ہمارا پروردگار

دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ○

(الفاطر: ۳۳ - ۳۵)

گناہوں کا معاف کرنے والا ہے۔ اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے۔ وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اُتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ○

(الحجر: ۴۸)

ان میں اُن کو کوئی آزار نہ ہوگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

جنّت جہاں رشک و حسد نہیں موجودہ دنیا خیر و شر کے متضاد عناصر سے بنی ہے۔ یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم کے ساتھ سنگ دلی اور محبّت کے ساتھ کینہ ہے۔ یہ گناہ و کینہ اور بغض و حسد وہ آگ ہے۔ جس نے یہاں کے قلبی امن و امان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے۔ ہر شخص یہاں دوسروں کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصّہ کے جوش و خروش سے اُبلتا ہے۔ جنّت وہ عالَم ہے، جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا۔ ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت، اور بغض و حسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبّت و الفت کے دریا موجزن ہوں گے۔ فرمایا:۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ

(مریم: ۶۲)

اس میں امن و سلامتی کے سوا کوئی بے ہودہ بات نہیں سنیں گے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ

اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا۔ ان کے نیچے نہریں

(الاعراف : ۴۳) بہتی ہیں۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ○

اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا۔ بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

(الحجر : ۴۷)

اسی کی تفسیر میں حدیثِ صحیح میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا۔ نہ باہم بغض اور کینہ۔ سب کے دل ایک دل کی طرح متّحد ہوں گے۔"[1]

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی | بہشت میں زندگی کی جو لذّتیں ہوں گی، ان کی تعبیر الوان نعمت اور انواعِ شربت و شراب اور دوسرے مادّی لذائذ سے ہو سکتی ہے۔ مگر وہ حظّ و مسرّت اور اطمینان و سکینیّت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادّی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی۔ یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز، پسینہ اور سوءِ ہضم کی علّت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اہلِ جنّت کھائیں گے اور پئیں گے، لیکن نہ تھوکیں گے، نہ وہاں بول براز کی حاجت ہوگی، نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھلھار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی۔ کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا۔ وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی۔ جو بہشت میں داخل ہوگا، اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی۔ نہ اُن کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ اُن کی جوانی زائل ہوگی۔ وہاں منادیٔ غیب یہ پکار کر کہہ دے گا کہ یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی

---

[1] صحیح مسلم صفۃ الجنّۃ۔

وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوگے اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤگے۔ لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے۔ کوئی ستارہ کی طرح کوئی چودھویں کے چاند[1] کی طرح۔

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی، ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی۔ اس پر تعجّب نہ کرنا چاہیئے۔ انسان کبھی شکمِ مادر میں ایک بچّہ کی صورت میں زندہ تھا۔ مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کے فضلۂ غذا اس کی سانس اور دوسرے لوازمِ حیات بیرونِ شکم کے دنیاوی اصولِ حیات و قوانینِ زندگی سے بالکل مختلف تھے اور جس طرح شکمِ مادر میں بچّہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجّب کے ساتھ سُن کر آمادۂ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگی، ایسے ہی اِس مادّی زندگی کے خوگر اور اس عالمِ آب و گل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصولِ حیات، طرزِ غذا اور دوسرے لوازمِ حیات کو سُن کر آمادۂ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

جنّت ارتقائے روحانی ہے مادّی و جسمانی خلقت و فطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادّہ نے لاکھوں برس کے تغیّرات کے بعد اس انسانی جسمانیّت تک ترقی کی ہے۔ وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسمِ انسانی کی صورت میں نمودار ہوا اور یہ مادّیت کی معراجِ ترقّی ہے۔ جمادیّت مٹ کر نباتیّت پیدا ہوئی اور نباتیّت فنا ہو کر حیوانیّت نمودار ہوئی۔ پھر حیوانیّت معدوم ہو کر انسانیّت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا۔ لیکن انسانیّت کا دوسرا رُخ جو روحانیّت سے عبارت ہے۔ ہنوز اپنے آغازِ طفولیّت میں ہے۔ کیا اس پر بھی اسی

---

[1] یہ ساری حدیثیں صحیح مسلم صفۃ الجنّۃ میں ہیں

ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے ایک مادّہ پرست صرف بام ارتقاء تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے۔ لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے اور یہاں سے وہ اُڑ کر سقفِ آسمان تک پہنچتا ہے اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقّی شروع کرتا ہے۔ قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریّہ کے اشارات نکلتے ہیں :۔

اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ○ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ○

جو فردوس کے وارث پائیں گے اور وہ اس میں سدا رہیں گے اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا۔ پھر اس کو (رحم نسوانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا۔ پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا۔ پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا۔ پھر اس لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا۔ پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا۔ پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا۔ تو برکت والا ہے سب سے بہتر بنانے والا (خدا)

(المومنون : ۱۱-۱۴)

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رُک نہیں جائے گی۔ بلکہ آگے بھی ہوگی۔ اس لئے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زلیست و حیات کے کچھ قواعد تھے، پھر عالم کی اسی سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھّا۔ جہاں ترقّی و حیات کے دوسرے ہی اصول ہیں اسی طرح اس دنیائے مادّی سے نکل کر اُس وسیع تر دنیا میں قدم رکھّے گا

جہاں ترقّی اور سعادت کے دوسرے اصول ہوں گے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝	پھر بے شک تم اس کے بعد مرنے
ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝	والے ہو اور پھر قیامت کے دن اٹھائے
(المومنون: ۱۵-۱۶)	جاؤ گے۔

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیّت پیدا ہوتے ہوتے انسانیّت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسان کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی صدہا ہزارہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوعِ ملکوتی کا ظہور ہوگا۔

یہاں مسئلہ ارتقاء کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے۔ جس کو "بقائے اصلح" کہتے ہیں کہ ان مدارجِ ترقّی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیّت نہیں ہوتی اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد اُن ہی کو ملتی ہے۔ جن کے اندر اپنی پچھلی مادّی وجسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی۔ دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی ونباتی وحیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کمئی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں اور ملکوتیت کی ترقّی حاصل کر سکیں۔

بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی ہی زندگی میں اس ترقّی کی استعداد پیدا کر چکے تھے۔ لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی رجائی ترقّی کا دروازہ بند نہ ہوگا۔ بلکہ وہ بقدرِ استعداد تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے۔ شاید

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ○ (التین: ۶)

ان (بہشتیوں) کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں اہل ایمان کے آگے، پیچھے، داہنے، بائیں نور ہوگا، پھر بھی دُعا کریں گے:۔

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (التحریم: ۸)

ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑے گا اور وہ کہیں گے، اے ہمارے پروردگار! ہمارے نور کو کامل کر اور ہم کو معاف کر تو ہر بات کر سکتا ہے۔

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دُعا ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقّی ہوتی رہے۔ جس کا اقتضا خدا کی ربوبیّت کا منشا ہے۔

امن وسلامتی کا گھر انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے۔ لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا۔ وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا۔ لیکن یہاں آکر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ، بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی۔ وہ پرند جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا۔ جنّت کے جہاں وحیٔ محمدیؐ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دَارُالسَّلَام بھی بتایا ہے۔ جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر کے ہیں۔

اہلِ جنّت کی نسبت ارشاد ہے:

لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ — اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے

(الانعام : ۱۲۷) — پاس سلامتی کا گھر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر علیہ السّلام کو مبعوث فرمایا ہے، وہ حقیقت میں اسی امن وسلامتی کی نوید وبشارت ہے۔ اسی لئے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ ؕ — اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف

(یونس : ۲۵) — بلاتا ہے۔

آنحضرتؐ جب مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی۔ عبداللہ بن سلامؓ ایک یہودی عالم تھے۔ آنحضرتؐ کی جس صدائے نبوّت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا، وہ یہ تھی "لوگو! سلامتی پھیلاؤ۔ بھوکوں کو کھلاؤ۔ جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اُٹھ کر خدا کی عبادت کرو۔ امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔"

جنّت کے ذکر میں اس امن وسلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے:۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ — اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے

مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ — سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے۔

بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى — کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا تھا۔

الدَّارِ — تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔

(الرعد : ۲۳ — ۲۴)

وہاں امن وسلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا

اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ○	لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔

(الواقعۃ ، ۲۶)

فرشتے اہلِ جنّت کو یوں کہیں گے:

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ○	اس جنّت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو۔ یہ زندگیٔ جاوید کا دن ہے۔

(قٓ : ۳۴)

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ط	اس میں سلامتی کے سوا کوئی اور بیہودہ بات نہ سنیں گے۔

(مریم : ۶۲)

جنّت کا ایک اور نام قرآن میں "مقامِ امن" (امن والا مقام) بتایا گیا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ○	بے شک پرہیزگار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔

(الدخان : ۵۱)

مقامِ رحمت | خدا کی رحمت کب نہیں اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی آجاتے ہیں، جن کو ہم رحمت کے بجائے قہرِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوندِ تعالیٰ کے قہر و غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ایک عالَم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا۔ وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض و کرم کی بارش ہوگی اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کبھی دکھائی نہ دے گا:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا	ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت، خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری

نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ (التوبۃ : ۲۱)

دیتا ہے۔ جن میں ان کے لئے ہمیشہ کا آرام ہے۔

اہلِ جنّت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے یہ آواز سنائی دے گی:

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (اٰل عمرٰن : ۱۰۷)

لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔ اس میں وہ سدا رہیں گے۔

مقامِ نور جنّت نور کا وہ مقام ہے جہاں ظلمت و تاریکی کا نام و نشان نہ ہوگا۔ جنّتیوں کے چہرے روشن ہوں گے کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا اور کوئی چاند کی طرح۔ ہر طرف ان پر انوار کی بارش ہوگی۔ آگے پیچھے، داہنے، بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا۔ فرمایا:

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (التحریم : ۸)

ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔

اس دن اہلِ ایمان کے نورِ ایمان کی تجلیاں ہر طرف کوندیں گی:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا۔ آج تم کو خوشخبری ہو۔ وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان میں ہمیشہ رہا کرو گے۔ یہی بڑی کامیابی

(الحدید : ۱۲) ہے۔

اس دن اہل نفاق اہل ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جایئے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لئے روشنی ہو جائے:

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ	جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں
لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ	اہل ایماں سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو
مِنْ نُّوْرِکُمْ ج	ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں۔

(الحدید : ۱۳)

مقامِ رضوان | جنّت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا۔ بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا۔ متّقیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں، ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرّت رکھی ہے۔ لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنّت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے:

یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ	اُن کا پروردگار اُن کو اپنی رحمت اور
وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا	خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے
نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝	اور ان باغوں کی جن میں نعمتِ الٰہی
(التوبۃ : ۲۱)	رہے گی۔

سورہ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنّت

کا ذکر آتا ہے۔ فرمایا:

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

(الحدید: ۲۰-۲۱)

اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے۔ اور دُنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔ اپنے رب کی بخشش اور اس جنّت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے۔ یہ ان کے لئے بنائی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں یہ اللہ کی مہربانی ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے

سورۂ آلِ عمران میں جنّت کی تمام نعمتوں کو گِنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشّان بشارت پر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ

(اٰل عمران: ۱۵)

جنہوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی۔

سورۂ توبہ میں جنّت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوانِ الٰہی کو قرار دیا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

اللہ نے باایماں مردوں اور عورتوں سے اُن باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان میں سدا رہیں گے اور رہنے کے ستھرے گھر اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے۔ وہی بڑی کامیابی ہے۔

(التوبۃ: ۷۲)

بہشت کی مطمئن روحوں کو یہ نوید مسرّت سنائی جاتی ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اسی طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔

(الفجر ۲۷-۲۸)

اہلِ جنّت کی یہ صفت آئی ہے:۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط

خدا اُن سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔

(المائدۃ: ۱۱۹)

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرتؐ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ خداوند تعالیٰ اہلِ جنّت کو آواز دے گا کہ اے جنّت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند! ہم حاضر ہیں، سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں۔ فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پاکر) اب تم خوش ہوئے۔ عرض کریں گے پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا۔ فرمائے گا کہ میں ان تمام

گذشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائے گا: "یہ کہ اپنی رضامندی و خوشی تم پر اُتار دوں۔ پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔"[1]

مقامِ طیّب وطاہر موجودہ دُنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے۔ اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں۔ فرمایا:

طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ○ — تم پاک ہو چکے تو جنّت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ

(الزمر: ۷۳)

جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی و روحانی آلایش سے بری ہوگی۔ فرمایا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کیئے ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔

(النحل: ۹۷)

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے:۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم صفۃ الجنۃ۔

وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً — اور پاک گھر

(الصف : ۱۲)

جو بیویاں ملیں گی وہ بھی پاک ہوں گی :

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ — اور پاک بیویاں۔

(آل عمران : ۱۵)

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی:

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ — اور اہلِ جنّت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔

(الحج : ۲۴)

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی :

شَرَابًا طَهُوْرًا ○ — پینے کی پاک چیز۔

(الدھر : ۲۱)

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک، صاف، طیّب وطاہر اور تمام روحانی وجسمانی آلودگیوں سے مبرّا ہوگی۔

مقامِ تسبیح وتہلیل اس آرام ولطف کے بعد اہل جنّت کی روحانی لذّت، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل ہوگی۔ یہ ان کی روحانی غذا ہوگی۔ وہ عالم جہاں ہر طرف انوارِ الٰہی برسیں گے، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہوگا، جہاں قُدس ونزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی، وہاں حمد وثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے :

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ — جنّت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے

وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

(یونس : ۱۰)

میرے اللہ تیری پاکی اور اُن کی آپس کی دُعا، سلامتی ہوگی اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔

جنّت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح وتہلیل کی نئی نئی لطف راہیں وہاں ان پر کھُلیں گی۔ فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ○ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ○

(الحج : ۲۳ - ۲۴)

بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے، ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں اُن میں اُن کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم کی ہوگی اور وہ راہ دکھائے جائیں گے اچھی بات کی۔ اور وہ دکھائے جائیں گے اس سراپا حمد (ذات) کی راہ۔

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمد الٰہی کا سرودِ سرمدی گائیں گے۔ اور یہ وہ وقت ہوگا جب عالم وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا۔ فرمایا۔

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ

جنّت کے نگہبان ان سے کہیں گے

عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خٰلِدِيْنَ ○ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ ○ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

(الزمر: ۷۳-۷۵)

تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے تو جنّت میں چلے جاؤ۔ اہلِ جنّت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنّت میں جہاں چاہیں رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور دیکھے گا کہ فرشتے عرشِ الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا۔ کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔

اہلِ جنّت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ○

(مریم: ۶۲)

وہ نہ سنیں گے وہاں بے کار بات مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہو گی۔

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنّت کے کھانے کے الوانِ نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی۔ وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے۔ میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربّانی غذا مراد ہے۔ اور حدیث کے اِن لفظوں کو اُسی کی تفسیر جانتا ہوں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے جنّت کی نعمتوں

کے سلسلہ میں فرمایا۔

یسبحون اللہ بکرۃ وعشیا	وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و
(صحیح مسلم باب صفۃ الجنۃ)	تقدیس کریں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا" اہل جنّت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کرے گا اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں :

وَهُدُوٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ	اور اچھی بات کی طرف ان کی رہنمائی
وَهُدُوٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ○	کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ
(الحج : ۲۴)	ان کو بتایا جائے گا۔

مقامِ قرب | اہل جنّت کو جو کچھ نصیب ہوگا ان کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ قربِ خاص کا مقام ہوگا۔ بندے اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے۔ قرآن پاک میں جا بجا ان کے لئے آتا ہے۔ جَزَاۤءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس ہے) یہ قربِ خاص کے اشارے ہیں اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے :

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۙ	بے شک پرہیزگار باغوں میں اور
فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ	نہروں میں سچائی کی نشست گاہ میں
مُّقْتَدِرٍ ○	اس بادشاہ کے حضور جس کا سب
(القمر : ۵۴-۵۵)	پر قبضہ ہے۔

دیدارِ الٰہی | جنّت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلّی کا نظارہ ہے۔ کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے۔ تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی یا وہ نورِ مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا۔ اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز

بن کر نمودار ہوگا اور اہلِ جنت کی مشتاق آنکھیں اُس کی طرف اُٹھی ہوں گی:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (القیٰمۃ: ۲۲-۲۳)

کتنے چہرے اس دن تر و تازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبداللہؓ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے"۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو۔ ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا۔[1] اس تمثیل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو مقصود ہیں۔ ایک تو شدتِ یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک و شُبہہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک و شُبہہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدارِ الٰہی میں کروڑوں کا جو ہجوم ہوگا اس میں خُدا کے دیدار سے ایک دوسرے کا مانع نہ ہوگا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ جس دن جنّتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے۔ ان کی زبان پر سلامتی کی دُعا ہوگی:

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ (الاحزاب: ۴۴)

ان کی دُعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے، سلامتی ہوگی۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان

---

[1] صحیح بخاری جلد ثانی۔

سے سلامتی کا پیام دے گا:

سَلٰمٌ ۚ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ○ رحمت والے پروردگار کی طرف سے

(یٰسٓ: ۵۸) پیام سلامتی ہوگا۔

بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا۔"[1]

یہ رویت کیونکر ہوگی؟ اہلِ روایت لفظ کے قائل ہیں۔ اہلِ عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں۔ اہلِ حقیقت اُس کو اسماء وصفات کی ناقابلِ بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن فیصلہ یہ ہے۔ ع

بیا کیں داور یہا را بہ پیش داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر ونشر اور جنت ودوزخ کے پورے مناظر گذر چکے۔ یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے۔ معلوم ہو چکا ہے کہ اہلِ عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا۔ بلکہ مر کر جی اُٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اُن کے نزدیک کس قدر مستبعد تھا۔ قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیاتِ بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے۔ آنحضرتؐ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ ق تلاوت فرماتے تھے، جس میں قیامت کے حالات ہیں۔ مگر دیکھو تیئیس برس کی مسلسل تعلیم، قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف اُن کا انکار اقرار سے بدل گیا، بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ

---

[1] صحیح بخاری جلد ثانی باب کلام الرب،

یہ مناظر ان کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے۔

یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا ؎

اموت ثم بعث ثم حشر	حدیث خرافۃ یا ام عمر
کیا مرنا ہے، پھر جینا ہے اور پھر اکٹھا ہونا	اے عمر کی ماں، یہ خرافات باتیں ہیں۔

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنزِ انکار، رمزِ یقین سے بدل گیا اور اس وقت کا شاعر یہ کہنے لگا۔ "ہم آسمان تک پہنچ گئے اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے جائیں گے"[1]

و انا لنرجو فوق ذلک مظہرا	اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔

آنحضرتؐ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ جنّت یا رسول اللہؐ! آپ فرماتے ہیں "انشاء اللہ"۔ دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں، اُن کا تخیّل آسمان سے بھی اُونچا جانے لگا۔ جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے مواخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا، جن کو اپنے اعمال کی جوابدہی کی پروا نہ تھی، جو سزا اور جزا کے مفہوم سے بے گانہ تھے، جو جنّت و دوزخ کے تخیّل سے ناآشنا تھے۔ وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے۔ دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آگیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا۔ آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے۔ اعمال کی جواب دہی سے ترساں و لرزاں رہنے لگے۔ سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پُرس خود کرنے لگے، جنّت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ

---

[1] اصابہ اور استیعاب ذکر نابغہ جعدی۔

کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشک بار رکھتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے اُن کا چونکا کر عمل کے میدان میں تنہائے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لئے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتا پا مصروفِ جدّوجہد بنا دیتا تھا۔ تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا۔ ان کے ضمیر اور دل کے صفحوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھُلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ کسی حقیّت کے متعلّق دو صحابیوںؓ میں جھگڑا تھا۔ آنحضرتؐ نے فریقین کی باتیں سُن کر ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ پھر فرمایا میں بھی ایک آدمی ہوں۔ مدّعی اور مدّعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچّھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں۔ لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو، تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں یہ سُن کر فریقین پر یہ اثر ہُوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصّہ دوسرے کو دینے لگا۔[1]

حضرت عمرؓ خدا کے مطیع و فرماں بردار تھے۔ رسولؐ کے عاشق و شیدا تھے، نیکیوں سے مالامال تھے۔ جنّت کی بشارت سے سرفراز تھے۔ تاہم آخرت کے مواخذہ اور جواب دہی سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ "اگر وصالِ نبویؐ کے بعد میرے اچّھے اور بُرے اعمال برابر برابر رہیں تو بھی میں خوش ہوں۔ اگر جنّت نہ ملے تو پروا نہیں۔ مگر الٰہی دوزخ نہ ملے"[2] وہ نزع کی حالت میں بہت بے چین تھے۔ بعض صحابہؓ ان کے اچّھے اعمال گِنا

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ [2] صحیح بخاری باب الہجرۃ جلد اوّل۔

کران کو تسلی دینے لگے، تو جواب میں کہا "خدا کی قسم اگر کُل زمین میرے لئے سونا ہو جاتی کہ اس کو دے کر عذاب الٰہی سے بچ سکتا تو میں دے دیتا۔[1] اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کہتی تھیں "اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی۔[2] اے کاش میں کچھ نہ ہوتی۔[3]"

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب مؤثر آیت

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ	لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ قیامت
اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ ۚ	کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے۔ جس
عَظِیْمٌ ۝ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ	دن اس کو دیکھو گے ہر دودھ پلانے
كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ	والی عورت اپنے دودھ پیتے بچّہ کو
تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا	بھول جائے گی اور پیٹ والی اپنا پیٹ
وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا	ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو
هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ	گے۔ لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے، بلکہ
اللّٰهِ شَدِیْدٌ ۝	بلکہ خدا کا عذاب سخت ہوگا۔

(الحج: ۱-۲)

جب اُتری اور آنحضرتؐ نے صحابہؓ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو اُن کے چہروں کا رنگ[4] بدل گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری[5] ہو گئے۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے قبر کا ذکر کیا اور

---

[1] صحیح بخاری فضائل حضرت عمرؓ جلد اوّل۔ [2] ابن سعد: جزء النساء۔ [3] صحیح بخاری مناقب حضرت عائشہؓ و تفسیر سورۂ نور و مستدرک حاکم ترجمۂ عائشہؓ و ابن حنبل مسند عائشہؓ۔ [4] صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج، جلد دوم۔
[5] جامع ترمذی تفسیر سورۂ حج۔

موت کے بعد کے عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہؓ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ حضرت ابوہریرہؓ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گر پڑے اور جب امیر معاویہؓ کے سامنے یہ آیت دہرائی گئی تو ان پر بھی سکتہ طاری ہو گیا۔[1]

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدان جنگ ہے۔ مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈا آرہا ہے۔ ادھر تین سو نہتے مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپؐ صحابہؓ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں "تو اس جنّت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے"۔ ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپؐ فرماتے ہیں "ہاں"۔ وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اُٹھتے ہیں۔ آپؐ دریافت فرماتے ہیں کہ "تم نے واہ واہ کیوں کہا"؟ عرض کی اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں۔ فرمایا "تم اس میں ہو"۔ یہ سُن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے۔ بالآخر جنّت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گذرا۔ بولے اتنی دیر بھی کیوں کی جائے۔ یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

غزوۂ اُحد میں بھی اس قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ اُحد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابیؓ نے آگے بڑھ کے پوچھا "یا رسول اللہؐ! اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟" فرمایا "جنّت میں"۔ وہ کھجور کھا رہے تھے۔ ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی۔ قیسؓ ایک صحابی تھے۔ وہ ایک جہاد میں

---

[1] سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من القبر [2] جامع ترمذی ابواب الزہد۔

میں شریک تھے۔ انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سائے کے نیچے ہیں۔ ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپؐ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے؟ انہوں نے کہا "ہاں"۔ یہ سُن کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہُوا۔ میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف میں جا پڑا اور شہادت[1] حاصل کی۔

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے مُنکر اور کافر عربوں کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں ان کے عقائد و اخلاق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

---

[1] یہ تینوں واقعے صحیح مُسلم کتاب الجہاد باب ثبوت الجنۃ للشہید میں ہیں۔ دوسرا واقعہ سنن نسائی میں بھی ہے، کتاب الجہاد باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ۔

قضاؤقدر

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر:۴۹)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ چنانچہ بعض صحیح[1] حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعتِ قدرت اور مشیّتِ مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیئے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا، جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آیندہ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے، اور ہوگا۔ جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوّزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس تعمیر کو مکمل کرتے ہیں۔ اسی طرح اس مہندسِ ازل خالقِ کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت

---

[1] صحیح مسلم بروایت ابن عمرؓ و ابوہریرہؓ باب الایمان۔

فیصلہ کر دیا تھا۔ اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اُس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں۔ موت و حیات، فقر و غنا، کامیابی و ناکامی، تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

یہ نفسِ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیلی تعلیم ہے۔ توراۃ میں حضرت آدم علیہ السلام و شیطان اور ہابیل و قابیل کے قصّوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ مگر ان اشارات سے گذر کر زبور میں اس کی کھُلی کھُلی تعلیم بھی ملتی ہے۔ زبور ۱۳۹-۱۴ میں ہے:

"تیرے کام حیرت افزا ہیں۔ اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے۔ جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا، اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا۔ تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی۔ تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادّہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں۔ اور ان کے دلوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی۔ جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔"

اس کے بعد زبور ۱۴۸ کا ترانۂ حمد اسی لیے میں شروع ہوتا ہے:

"..... خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اُس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے۔ اس نے ان کو پائداری بخشی۔ اس نے ایک تقدیر مقرّر کی جو ٹل نہیں سکتی۔"

انجیل میں اس کی تعلیم "خدا کی مرضی" کے عنوان سے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کی آخری شب کی دُعا فرماتے ہیں "میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو"۔ (متی ۲۶-۳۹) اور اسی مرضی کا ذکر یوحنا (۵-۳۰-۶-۳۸) اور خطوط (فلپیون ۲-۱۳) میں ہے۔ اور

رومیوں کے نویں باب میں اس کی پوری تفصیل ہے مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اوّل یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح اور اس کی حکمت و مصلحت کی تشریح کی اور پھر یہ کیا کہ گذشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے اُس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کر لی۔ بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر کر لیا اور یہ تلقین یقین کی صورت میں اُن کی رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی اور ایسا اُس نے اس لئے کیا کہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے۔ بلکہ عملی حیثیت سے اس کے پیروؤں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حوادث میں تسلّی و تشفی کی قوّت پیدا کرے اور اسی طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریّہ کی حیثیت میں نہ رہے۔ بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کر لے۔

وحی محمدی نے اس اصطلاح کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں۔ ایک قدر ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا قضا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝ (القمر : ۴۹)

ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ۭ (الانعام : ۲)

وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا۔ پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے، کائنات کی ہر چیز کے

متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرما دیا ہے اور متعین کر دیا ہے۔ اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرّہ کا بھی تغیّر نہیں ہو سکتا۔ آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرما دیا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیئے، موت و حیات فنا و بقا اور عروج و زوال، غرض کائنات کی ہر شق اور ہر پہلو کے متعلق جو اصول متعیّن فرمائے انہی پر وہ چل رہی ہے۔ قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ○ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ○ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ○

(یٰسٓ : ۳۸ - ۴۰)

اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہیں منزلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہو کر) لوٹتا ہے نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے۔ ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

یہ تو آسمان کی بات تھی۔ زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا

(حٰمٓ السجدۃ : ۱۰)

اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دُنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا:

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ○ (الطلاق : ۳)

اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ بنایا ہے۔

موت و حیات بھی اس اندازہ کے مطابق ہے۔ فرمایا:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (الواقعة : ۶۰)

ہم نے تمہارے درمیان موت کو اندازہ کر دیا۔

ہر شے میں اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانونِ قدرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصّہ اور ہر پہلو کے متعلّق اپنے احکام معیّن فرما دیئے ہیں، جن کی اطاعت اُس پر واجب ہے۔ علیٰ ہذا انسانوں کی ترقّی و زوال، موت و حیات، بیماری و صحت، دولت و افلاس، آرام و تکلیف، سعادت و شقاوت ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرما دیئے ہیں۔ غرض ان کو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے:۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (التغابن : ۱۱)

نہیں پہنچتی تم کو کوئی مصیبت لیکن اللہ کے حکم سے۔

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی۔ اس لئے مقدرات کو نوشتہ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے، مٹتی اور بھولتی نہیں ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتی اور بدلتی نہیں:۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ

اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی

اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ○ (فاطر : ۱۱)	اور نہ جنتی ہے۔ لیکن خدا کے علم سے۔ اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے۔ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں۔ ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا بچہ جنتی ہے۔ وہ خدائے پاک کے علم سے ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی جو عمر بھی ملتی ہے وہ کتاب الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے۔ ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنیٰ ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے۔ انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر و غرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لئے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا بُرے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے۔ اس لئے وہ کبھی اپنے کیے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت استقلال اور صبر و ثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں۔ اس لئے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر و مسرت اور ناکامی کے افسوس و حسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست گیری کرے اور وہ یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے۔

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہِ راست نتیجہ

نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس پر ہمارا فخر و غرور کرنا بیجا ہے۔ اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اُس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے۔ اس لئے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیئے، بلکہ اُسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جدّ و جہد میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے :-

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝

(الحدید : ۲۲-۲۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ تم اُس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔

جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و نا اُمیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے۔ اور اُن کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا، وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوندِ عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے۔ مالی بے چارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی کے کسی موقع پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لئے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ اُن کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اسی لئے اُن کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بہا لے جا سکتے تھے، نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝

(آل عمران: ۱۴۵-۱۴۶)

کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے۔ یہ لکھا ہوا مقرر ہے۔ جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا، اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے۔ کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں، اُن کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے

نہ وہ دِل ہارے نہ سُست ہوئے اور نہ دب
گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو
پیار کرتا ہے۔

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سُستی اور دون ہمتی نہیں، بلکہ بلندی، استقلال اور صبر و ثبات ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے۔ اُن کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں۔ کیونکہ

لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (التوبة: ۵۱)

ہم پر کوئی آفت آئی ہی نہیں سکتی،
لیکن جو خدا نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے
وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہیئے
کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لئے موت لکھی ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں بھی مریں گے اور بسترِ راحت پر بھی۔ اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ (اٰل عمرٰن: ۱۵۴)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان
لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔
کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی
ہوتے تو جن پر جہاں مرنا لکھا جا چکا تھا
وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر چلے آتے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ	تم جہاں بھی رہو تم کو موت آکر پائے گی
الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ	اگرچہ تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں
مُّشَيَّدَةٍ	ہو۔

(النسآء : ۷۸)

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابلِ تسخیر جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلۂ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبورِ محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے۔ حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربّانی کتابوں کے اُترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی، نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے۔ کتنی کتابیں اُتریں۔ کروڑوں مبلّغ اور مُرشد بنا کر پھیلائے گئے۔ ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا۔ کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جدّ و جہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدّ و جہد سے معمور زندگی ہمارے لئے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدینؓ اور عام صحابہؓ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔

اب کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اور آپؐ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں اور اس طرح یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں کہ اعملوا فکل میسر لما خلق[1] (لوگو! اپنے اپنے کام کیئے جاؤ کہ تم

---

[1] صحیح بخاری۔

میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے، جن کے لیئے وہ پیدا کیا گیا ہے) کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے۔ فرمایا:

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ۝ فَاَمَّا مَنْ	بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رخ
اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝	کی ہیں تو جس نے دیا اور پرہیزگاری کی
فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ۝ وَاَمَّا	اور نیکی کو سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ
مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝ وَکَذَّبَ	آہستہ آسانی کی طرف لے چلیں گے۔
بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ۝	اور جس نے نہ دیا اور بے پروائی برتی
وَمَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ۝	اور نیکی کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ
اِنَّ عَلَیْنَا لَلْہُدٰی ۝ وَاِنَّ لَنَا	سختی کی طرف لے چلیں گے اور اس کی
لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی ۝	دولت مندی اس کو گڑھے میں گرنے سے
(الیل: ۴-۱۳)	نہیں بچا سکتی ہے۔ بے شک راہ سجھانا
	ہمارا فرض ہے اور آخر و اول ہمارے
	لئے ہے۔

یہ ہے قضاؤ قدر اور سعی و عمل کی باہمی تطبیق جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا کا دینا جو اس کام کے لئے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے، خدا کا کام ہے۔ نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ کے دکھانے کا نام توفیق و ہدایت ہے اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق و ہدایت کے نہ ملنے کا نام عدمِ توفیق و ضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے۔ خدا فرماتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت: ۶۹)

اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں، البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سجھاتے ہیں۔

خدا کی طرف سے توفیق وضلالت کا ملنا خود انسان کے اچھے یا بُرے عمل کا لازمی نتیجہ ہے:۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۲۶)

اور ہم اُس سے گمراہ نہیں بناتے لیکن انہی کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔

غرض پہلے فسق، عدمِ اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے:۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ (النجم: ۳۹-۴۰)

اور انسان کے لئے نہیں لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے۔ بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے۔ وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں۔ بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اُس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے۔ وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو بامعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں۔ اسی طرح تقدیرِ الٰہی اور عملِ انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر و قدر عموماً لوگ اسی موقع پر جبر و قدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسان اپنے

اپنے عمل میں مجبور ہے یا مختار؟ حالانکہ یہ سررشتۂ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا، بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہوسکتا۔ جس طرح اہلِ مذہب ارادۂ الٰہی اور ارادۂ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں، اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلّم علمِ الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفۂ اخلاق والے انسان کی آزادیٔ عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اُس کو بمشکل بچا سکتے ہیں۔

دُنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا۔ ہر دھاگے میں یہ گرہ اُسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں۔ یا تو سرے سے اُس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اُس راستہ سے گذر جایا جائے۔ یا بحث چھیڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا۔ چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ، آواگون اور کرم کی صورت میں ہے۔ عیسائیوں میں آدم علیہ السلام کے گناہ، اور خدا کی مرضی[1] کے پیرایہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعہ توراۃ میں حضرت ایوب علیہ السلام کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے۔ دوسری طرف مجوسی تھے، جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اُس کے آگے مجبور تھا۔ خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔[2] غرض آنحضرتؐ کی بعثت کے پہلے مذاہب کی یہی دو نوعیتیں تھیں، یعنی یا تو ان کو اس

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنی گرفتاری کی رات کو دُعا میں فرمایا "اے خُدا اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے۔ لیکن میری نہیں، بلکہ تیری مرضی پُوری ہو۔" عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانت کی کتاب الاسلام (ترجمہ عربی) سے کسی قدر معلوم ہوسکتا ہے۔ [2] شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل حافظ ابن قیم۔

مشکل کی خبر ہی نہیں تھی، یا تھی تو خدا کی قدرتِ مطلقہ اور مشیئت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا یا یہ کہ تناسخ کے چکّر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اُس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے تھے۔ یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیاءؑ میں آنحضرتؐ ہی کی شخصیّت وہ نمایاں شخصیّت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اُس کے ذرّہ ذرّہ پر قدرتِ مطلقہ رکھتا ہے۔ آسمان و زمین اور بر و بحر میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیئت کے بغیر حرکت بھی کر سکے۔ اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اُسی کی قدرت اور مشیئت کے ماتحت ہیں یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوّت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خُدا ماننا لازم آجائے جس کے اختیارات محدود ہیں جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شاہنشاہی ناتمام ہو۔

دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی، مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے۔ جس طرح دوسری مخلوقات ہے۔ تو پھر انسان کے لئے خیر و شر کا امتیاز، جزاء و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاءؑ کی بعثت، یہ تمام چیزیں بے کار محض ہو جائیں۔ ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔ انسان کا اپنے کسی فعل پر قابلِ مدح یا قابلِ ملامت ہونا بے معنی ہو جائے۔ کسی اچھّے کام پر خدا کا اس کو انعام اور بُرے کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے۔ بلکہ اس دُنیا کی عدالت میں بھی وہ

اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیّت و ارادہ ہر جزو کُل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزاء و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا۔ اسی پر وہ فطرت کے سامنے دُنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مواخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لئے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا صحیفہ ربّانی، پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے۔ جس نے اِن دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے "کہ خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتّہ بھی گر نہیں سکتا" اور دوسری طرف وہ کہتا ہے "ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے۔ یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت و وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیئت کے باوجود اُس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیئت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی۔ یہی ارادہ اور اعضاء کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اُس کی ذمہ داری، تکلیف، باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اُس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ اس لئے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیّت سے صادر نہ ہوئی ہو، بلکہ اُس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور

بے اختیار رہا ہو (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ) اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے۔ خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے۔ مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا۔ فرمایا:۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ	تو جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔

(الکہف : ۲۹)

اس لئے ہر انسان اپنی جنّت آپ بناتا اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝	جس نے نیک کام کیا تو اپنے لئے کیا اور بُرا کام کیا تو اپنے لئے کیا۔ تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

(حٰمٓ السجدۃ: ۴۶)

کہ اگر ایسا نہ ہو تو ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی جناب پاک و برتر ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ سے ارشاد ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ	اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے اور اگرچہ وہ سمجھتے نہ ہوں اور ان میں سے کچھ

كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ○ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○

(یونس : ۴۲-۴۴)

ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو سجھاؤ گے اور اگرچہ وہ نہ دیکھیں۔ بے شک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔

وہ انسان جو اندھا اور بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اُس پر عمل کرتا ہے۔ خدا اُس کو اندھا اور بہرا بنا کر پھر اُس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اُس کا ظلم ہوتا اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے۔ لوگوں کو قرآن کی ہدایت و ضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکا ہے۔ حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا بُرے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ ضلالت کی نسبت فرمایا:۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ

(البقرۃ : ۶-۷)

بے شک جنہوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا۔ اُن کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور آنکھوں پر پردہ ہے۔

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا، تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا، اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ اُن کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں۔

کانوں پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہے کہ دیکھتے نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ	بلکہ خدا نے اُن کے کفر کے سبب سے
(النسآء: ۱۵۵)	ان کے دلوں پر مہر کر دی۔

یہاں بھی اُن کا کفر خدا کی مُہر پر مقدم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مُہر ہے[1]

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغامِ حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق و ہدایت سے سرفراز فرمائے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ	بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کیئے اُن کو اُن کا پروردگار اُن کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا۔
(یونس: ۹)	
وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى	اور جنہوں نے ہدایت قبول کی ان کو ہدایت میں اور بڑھایا۔
(محمد: ۱۷)	

ایرانی فلسفۂ خیر و شر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ اُلجھا دیا ہے۔ حالانکہ عربی

---

[1] قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مُہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیئے جانے کا ذکر ہے وہاں اس کے کفر و فسق کی عِلّت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے۔ اس لئے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

الفاظِ خیر و شر کو اعمال کے خیر و شر سے بحث نہیں۔ عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت و نعمت و آرام کے اور شر کے معنی غربت، تکلیف اور مصیبت کے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ ان ہی معنوں میں آئے۔ البتہ جب اُن کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا تو عمل خیر اور عمل شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا۔ جیسے

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○	تو جو کوئی چیونٹی برابر نیکی کرے گا اور وہ اس کو دیکھے گا اور جو برائی کرے گا۔ وہ بھی دیکھے گا۔

(الزلزال : ۷-۸)

اس لئے حدیثوں کے ان الفاظ میں

والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ،	اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔

کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے اچھے اور بُرے کام سب خدا کی طرف سے ہیں۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج، مسرت و تکلیف، دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف پہنچتی ہے۔ اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں اُن آیتوں سے بھی شُبہہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ "اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا"۔ اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے، جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے۔ حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے۔ اِلّا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ

کے جاری قانون کے خلاف ہے۔ چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ط .	تم نہیں چاہو گے۔ اِلّا یہ کہ خود خدا چاہے اور (تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)
(الدھر: ۳۰)	
مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ط	وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں اِلّا یہ کہ خدا چاہے۔
(الانعام: ۱۱۱)	
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى	اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔
(الانعام: ۳۵)	
فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○	تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ خود ہدایت دے دیتا۔
(الانعام: ۱۴۹)	
وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○	اور اگر وہ چاہتا تو البتہ تم سب کو ہدایت دے دیتا۔
(النحل، ۹)	

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے دے۔ اس لئے اس مشیتِ الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی جن میں بندوں کی مشیئت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے۔ فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ	تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر

(الکہف :۲۹)

کرے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ○

تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ قبول کرے۔

(المزمل : ۱۹ ، الدھر : ۲۹)

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا ○

تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت کرے۔

(النبآء : ۳۹)

اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ○

لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

(الفرقان : ۵۷)

اللہ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے مگر کن کے لئے بتصریح فرمایا:۔

(۱) وَمَا یُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ○

اور اللہ اِس سے گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو۔

(البقرۃ : ۲۶)

(۲) فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ط وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ○

جب وہ کج ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

(الصف، ۵)

(۳) بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○

بلکہ اُن کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے۔

(المطففین : ۱۴)

(۴) بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ

بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ

(النساء : ۱۵۵)

نے اُن پر مہر کر دی۔

(۵) اَنْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○

وہ پھر گئے اللہ نے اُن کے دلوں کو اس لئے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔

(التوبۃ : ۱۲۷)

(۶) كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ○

اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔

(الاعراف : ۱۰۱)

(۷) فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ

اُن کے دلوں میں (پہلے سے نفاق کی) بیماری تھی۔ پس خدا نے بیماری بڑھا دی۔

(البقرۃ : ۱۰)

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو۔ ہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اُس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت و گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے۔ اس سے ثابت ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اثر ناعلت اور انسانوں کا کفر و گناہ و نفاق معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یعنی انسان کا فسق، کجی، زنگ، کفر، انصراف (پھر جانا)، نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے، تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو اُلٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہرحال اس مسئلہ میں مہبطِ وحی و رسالت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپؐ نے اُمّت کو اس پر جس شدّت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا۔[1] اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے۔ یہ کلی جہاں پر چٹکی کہ اس کی خوشبو اڑ گئی۔

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ	اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝	شریک نہیں اور اُس نے ہر چیز کو پیدا
(الفرقان ۲)	کیا پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا۔

---

[1] مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر۔

ایمان کے نتائج

گذشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ اُن میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارع نے کیا مصلحتیں رکھی ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جا چکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہب اسلام میں ایمان کو اوّلین اہمیّت کیوں دی گئی ہے؟ وہ بحثیں اصول کی تھیں۔ یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ اُن کو مذہب میں یہی اوّلیں درجہ دیا جائے، کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچّائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں۔ اس لئے جب تک دل نہ بدلے گا۔ ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا۔ یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے۔

اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہاں ایک خاص نقطہ ہے، جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ یہود نے سب سے زیادہ اہمیّت عملی رسم ورواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات وفلاح کا دارومدار رکھا۔ چنانچہ حوّاریوں کے خطوط وملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے۔ اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارے میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان اور نہ تنہا عمل پر بلکہ ایمانِ صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیّت نہیں دیتا بلکہ اس لئے اہمیّت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علّت وسبب ہے۔ یعنی وہ عملِ صالح کے لئے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لئے زمین درست کرتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے۔ کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اُس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا، تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ وبار پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصفِ لازم بتاتا ہے۔ ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے وہ لوگو! جو ایمان لائے۔

کی ندا سے خطاب کیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں

جو ایمان سے متّصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے:

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ — اگر تم ایمان والے ہو۔

اس سے معلوم ہؤا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لئے خاص ہے اور وہی اس کے اہل و سزاوار ہیں۔ فرمایا

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرۃ: ۱۶۵) — ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

اس سے معلوم ہؤا کہ محبتِ الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے۔ ایک اور سورہ میں ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (النور: ۵۱) — ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لئے اللہ و رسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سُنا اور ہم نے مانا اور ان ہی لوگوں کا بھلا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰) — ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے۔ ایک اور آیت میں ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (آل عمران: ۱۶۰)

اور خدا ہی پر چاہیئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہل ایمان کی شان ہے۔ سورہ مومنوں میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں:-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ○ ..... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○

بے شبہہ اہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ..... اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

(المؤمنون: ۱-۵، ۸-۹)

ان آیتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے "نماز میں خشوع و خضوع، بے کار باتوں سے احتراز، زکوٰۃ و خیرات دینا، عفت و پاک دامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی"۔ ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے۔ دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا۔ اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اوّلین و آخریں نشانی ہے اور اسی لئے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس

پر زور دیا گیا ہے۔

ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات و نتائج اور بہت سے ملیں گے۔ احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں۔ صحیح حدیث ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں"۔ حافظ بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے۔

ایک حدیث میں ایمان کی شناخت اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے آپؐ نے فرمایا:

اکمل المومنین ایمانا	مومنوں میں اس کا ایمان سب
احسنہم خلقا	سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق
(سنن ابی داود کتاب السنۃ)	سب سے اچھے ہیں۔

حسن اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے۔ یہ محبت سب سے پہلے تو اسی ہستی سے ہونی چاہیئے جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد اسی محبتِ الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اُس ہستی سے بھی محبت کرنا، جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا۔ اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں۔ فرمایا:

لایؤمن احدکم حتی اکون	تم میں سے کوئی اس وقت تک
احب الیہ من ولدہ ووالدہ	ایمان میں کامل نہیں، جب تک اس کے
والناس اجمعین۔	دل میں میری محبت اس کی اولاد والدین

(بخاری و مسلم کتاب الایمان) اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

ایمان کا تیسرا اثر سے یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبّت، پیار اور اخلاص ہو۔ جس طرح خود اپنے آپ سے۔ فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ او لجارہ ما یحب لنفسہ، (بخاری و مسلم کتاب الایمان)

قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔

آپؐ نے ایک دفعہ صحابہؓ کو خطاب کر کے فرمایا "جب تک تم مومن نہ بنو گے جنّت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ بنو گے جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبّت نہ کرو گے۔ میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبّت کیونکر ہو سکتی ہے۔ آپس میں سلام پھیلاؤ"[1] یہ محبّت کسی نمائش، ریا یا ذاتی نفع و نقصان کے لئے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کے لئے ہو۔ فرمایا "تین باتیں جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پا لیا۔ اوّل یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبّت نہ ہو۔ دوسری یہ کہ بندگان خدا سے صرف خدا کے لئے محبت کرتا ہو۔ تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اس کے لئے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا"۔ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ! کامل اسلام کس مسلمان میں ہے۔ فرمایا "اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے"۔ فرمایا کہ ایمان کی ستر سے کچھ اور شاخیں ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان۔

جن میں سے ایک شرم و حیا ہے۔ یہ بھی تعلیم دی کہ جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیئے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی ورنہ چپ رہے۔ جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیئے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے۔ جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیئے کہ مہمان کی عزت کرے۔ ایک صحابیؓ آپؐ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی اگر برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے، یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔[1]

اس کے بالمقابل آپؐ نے متنبہ فرمایا کہ "نفاق کی چار نشانیاں ہیں۔ جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے۔ اگرچہ وہ نماز گذار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔ ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے۔"[2]

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اور اسی لئے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے۔ وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے۔ اس تقریر سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عملِ صالح دونوں پر ہے۔ اسی لئے اٰمَنُوْا کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے۔ بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے۔ ایمان ملزوم اور اعمالِ حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں

---

[1] یہ تمام روایتیں صحیحین کتاب الایمان میں ہیں [2] صحیح بخاری کتاب الایمان پیش نظر مسلم ہے۔

ہو سکتے۔ اس لئے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا، اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے۔ اس بنا پر جہاں ایمان ہے۔ اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے نو سو سترہ صفحے سیاہ ہو چکے۔ ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لئے بہتر ہے کہ رہروِ قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقاء بھی کچھ دیر آرام کریں، ہر چند کہ

رہرواں را خستگیٔ راہ نیست
عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

سلیمان ندوی
دار المصنفین رمضان ۱۳۵۰ھ